صبا

سلمیٰ کنول

1

بچوں کے بے پناہ شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ نیم خوابیدگی کی سی کیفیت میں اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ ساتھ والی چارپائی پر دادی اماں سوئی ہوئی تھیں۔ اور ان کے خراٹے کمرے کی خاموش فضا کا سینہ بے دردی سے چیر رہے تھے۔

''نمو بھاگنا' فخری تمہیں پکڑنے آرہا ہے۔''

''دائی کو ہاتھ لگالیا' اوئے اوئے! اوئے اوئے!!''

اور پھر ننھی ننھی تالیاں ایک ہی لے میں بجنے لگیں۔

''چلو فخری جی پھر سے چور بنو۔''

اب اس کی نیند پوری ہو چکی تھی۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان آوازوں کو سننے لگی۔

''بے بی پکڑی گئی بے بی پکڑی گئی۔''

''نہیں نہیں فخری نے ٹھیک طرح سے آنکھیں بند نہیں کی تھیں۔''

''اب چور بننے کی باری آئی ہے تو رونے کیوں لگیں۔ بنو چور۔''

''ہاں بھئی ہاں بے بی! اب تو تمہیں چور بننا ہی پڑے گا۔''

''لیکن درخت کی اُونچی اُونچی ٹہنیوں پر کوئی نہ چڑھے میں چھوٹی سی ہو وہاں

تک میرا ہاتھ نہیں پہنچتا۔''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔گلو رانی' فخری! بھئی کان کھول کر سن لو بے بی کی باری درخت پر کوئی نہ چڑھے۔ وہ بیچاری بہت چھوٹی ہے اور تم ہمیشہ اونچی اونچی ٹہنیوں پر جا کر چھپتے ہو۔''

''نہیں بے بی کی باری ایسا نہیں کریں گے۔''

وہ دادی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چار پائی ذرا سا چرمرائی اس نے اپنی سانس روک لی کہ کہیں ان کی آنکھ نہ کھل جائے اور پھر بڑی احتیاط سے اٹھ کر پنجوں کے بل چلتے ہوئے کھڑکی کی طرف بڑھی۔ ایک پٹ ذرا سا کھول کر اس نے باہر جھانکا۔ دھوپ کی تیزی سے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ اور اسے باہر کچھ بھی دکھائی نہ دے سکا۔ اس نے جلدی سے پٹ بند کر دیا۔

''دائی کو ہاتھ لگا لیا۔''

''دائی کو ہاتھ لگا لیا۔''

''میں نے بھی دائی کو ہاتھ لگا لیا۔''

''چلو بے بی پھر سے چور بنو' تم سے کوئی پکڑا ہی نہیں گیا۔''

''میں چھوٹی سی تو ہوں۔'' منی سی بسورتی ہوئی آواز اس کے کان میں پڑی۔

بڑے اشتیاق سے اس نے پھر کھڑکی کھولی مگر آنکھیں بند رکھیں دو تین لمحے یونہی کھڑی رہنے کے بعد چند بار انہیں جھپکا اور جب وہ اس تیز روشنی سے اچھی طرح مانوس ہو گئیں تو کھول کر نیچے جھانکا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے دھنک کے سے رنگ بکھر گئے۔ پیپل کے اس بڑے پیڑ کے نیچے رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس چھوٹے چھوٹے مسرور اور شاد ماں بچوں کا ایک غول تالیاں بجاتا ہوا ہنستا کھلکھلاتا ہوا اپنے کھیل میں اس قدر محو تھا کہ دھوپ کی تیزی بھی ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکی تھی۔

وہ آنکھوں میں تشنہ آرزوؤں اور تمناؤں کا عکس لئے ان کا کھیل دیکھنے لگی۔

''بھئی بے بی کی جگہ میں چور بن جاتا ہوں یہ بڑی چھوٹی ہے۔'' ایک آٹھ نو سالہ لڑکے نے اپنی دانست میں بہت بڑا ایثار کیا۔ اسے اس چھوٹی سی بچی پر رحم آ گیا تھا۔

''اور اب میں ہاتھ آؤں بھی تو مجھے نہ پکڑنا۔'' وہی چھوٹی بچی آواز میں خوشی کی کپکپاہٹ لئے بولی۔

''نہیں پکڑوں گا۔تم یہاں دائی کے پیچھے چھپ جانا جب میں آنکھیں کھولوں گا تو ادھر نہیں دیکھوں گا اور تم جلدی سے دائی کو ہاتھ لگا لینا۔''

''اچھا!'' اور بے بی کے بھولپن نے چور کی آنکھیں بند ہونے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔ جھٹ اس کے سامنے ہی دائی کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کی اس معصوم حرکت سے محظوظ ہوتے ہوئے سب نے ایک قہقہہ لگا دیا۔

زندگی کے مصائب و آلام سے بے نیاز مسرت سے بھرپور اس قہقہے سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اس کے ہونٹ بھی پھیل گئے۔ مگر اس کے قہقہے میں آواز نہ تھی۔ تحت الشعور میں دادی کا خوف جو چھپا ہوا تھا۔ وہ صرف مسکرا رہی تھی۔

معاً اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اس کی مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی اس نے دھیرے سے کھڑکی بند کی مگر انتہائی احتیاط کے باوجود نجانے کیا بے احتیاطی ہو گئی تھی کہ کواڑ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔

دادی اماں نے کسمسا کر کروٹ بدلی۔ وہ دم سادھتے ہوئے دیوار سے چپک کر کھڑی ہو گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے خراٹوں کی بے ہنگم آواز پھر کمرے میں گونجنے لگی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ دادی اماں کے ان خراٹوں سے اسے ہمیشہ سے ہی بڑی نفرت تھی مگر آج وہ اسے بہت بھلے محسوس ہوئے جیسے ان کی گونج میں اس کے لئے خطرہ ٹل جانے کی نوید تھی۔ اس نے جوتی بھی نہ پہنی کہ ایسا نہ ہو دادی اماں جاگ پڑیں اور دبے دبے پاؤں چلتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئی۔ پوری احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس نے آواز پیدا کئے بغیر ایک کواڑ کھولا اور بلی کی سی پھرتی سے دبک کر باہر نکلتے ہی دروازہ پھر بند کر دیا۔ اسی طرح دم سادھے پنجوں کے بل چلتے ہوئے پھپھو کے کمرے تک پہنچ گئی۔ وہاں بھی

ویسی ہی خاموشی تھی۔اس نے سامنے دیکھا غزالہ کے کمرے کا دروازہ بھی بند تھا۔ چند لمحوں کے لئے وہاں رک کر اس نے سانس ہموار کی۔

ان کی حویلی میں گرمیوں کی دوپہریں یونہی خاموشی اور سناٹا لئے آیا کرتی تھیں مگر یہ سکوت صرف حویلی کے کمروں تک محدود ہوتا تھا جونہی دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر سب اپنے اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے جاتے تو موقع غنیمت جانتے ہوئے محلے کے سب بچے پھاٹک پر سے کود کر آنگن میں آ جاتے اور پیپل کے اس بڑے درخت تلے ساری دوپہر کھیلا کرتے۔ بچوں کے لئے اس پیپل میں جانے کیا کشش تھی کہ پھپھو کے منع کرنے کے باوجود ان کی دوپہریں یہیں گزرتی تھیں۔اس محلے کے تقریباً ہر بچے کا بچپن یہیں کھیل کر جوان ہوا تھا۔

''چلو بھئی گلو!اب آنکھیں بند بھی کرو تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے جلدی جلدی کھیل لیں۔''

ایک لڑکا دوسرے سے مخاطب ہوا۔لیکن دوسرے ہی لمحے اسے سہمے کھڑا دیکھ کر چونکا۔وہ بالکل گم سم حویلی کی سیڑھیوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔مخاطب کرنے والا بھی پلٹ کر اس کی نگاہوں کے مرکز کی طرف متوجہ ہو گیا اور پھر ایک ایک کر کے سب ہی کھیل چھوڑ کر جہاں کہیں تھے کھڑے ہو کر ادھر دیکھنے لگے۔

''تم نے کھیلنا کیوں بند کر دیا آؤ میں بھی تمہارے ساتھ کھیلتی ہوں۔'' وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے ان کے قریب آ کر بولی۔اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور نگاہوں میں بے پناہ پیار اور خلوص تھا۔مگر کسی نے بھی اس کی بات کا جواب نہ دیا اور بغیر جنبش کئے اپنی اپنی جگہ کھڑے رہے۔

''لیکن تم اتنی بڑی ہو ہمارے ساتھ کیسے کھیلو گی؟'' اس چھوٹی سی لڑکی نے بڑی جرأت سے آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں تمہاری دائی بن جاؤں گی۔'' اس نے آگے بڑھ کر بڑے پیار سے بچی کا ہاتھ تھام لیا۔

''چھوڑ دو اس کا ہاتھ۔'' ان سب میں سے نسبتاً ایک بڑے لڑکے نے آگے بڑھ

کر جھٹکے سے بچی کا ننھا سا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔''تمہیں معلوم نہیں۔یہی وہ لڑکی ہے جس کی ماں گھر سے بھاگ گئی تھی۔آؤ نکلو! آؤ فخری' رانی' بے بی آؤ سب چلیں۔امی نے ہمیں اس کے ساتھ کھیلتے دیکھ لیا تو پیٹیں گی۔''

سب جلدی جلدی اپنی اپنی جوتیاں پہن کر' مڑ مڑ کر اس کی طرف متوحش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پھاٹک کی طرف چل دیئے۔وہ تنہا پیپل کے قریب کھڑی رہ گئی بے جان اور بے حس! یوں جیسے کسی نے اس کے پاؤں زمین میں گاڑ دیئے ہوں اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک غائب ہو چکی تھی۔

''اری او صبا! کہاں مر گئی تو؟'' جانے وہ کتنی دیر اور یونہی گم سم کھڑی رہتی کہ دادی کی غضب ناک آواز نے چونکا دیا۔سر اٹھا کر بڑے کرب سے اس نے پھاٹک کی طرف دیکھا ایک حسرت بھری آہ اس کے لبوں سے پھسل گئی اس نے پھر سر جھکا لیا اور لٹے لٹے سے انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی زینے کی طرف پلٹ گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے پنجوں کے بل چلنے کے باوجود اس کی چال میں مضبوطی تھی مگر اب زمین پر پورے پاؤں دھرنے کے باوجود اس کی ہستی لڑکھڑائی جا رہی تھی۔اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آنکھوں کے آگے تاریکی سی پھیلی ہوئی تھی۔ڈگمگاتے قدموں سے اس نے زینہ طے کیا اور پھپھو اور غزالہ کے کمروں کی طرف نگاہ اٹھائے بغیر آگے بڑھ گئی دادی اماں دروازے میں کھڑی شعلہ اگلتی نگاہوں سے اسے آتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

''یہ اس تپتی دوپہر میں تو کہاں گئی تھی؟'' دادی کی آواز میں شیر کی سی گرج تھی۔

صبا نے کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ سر جھکائے کھڑی کانپتی رہی۔

''میں کیا پوچھ رہی ہوں کہاں گئی تھی تو۔'' انہوں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔''کیا تیری خالہ اور ماں نے ہماری عزت کی نیلامی میں کوئی کسر چھوڑی ہے جو تو پوری کرنے چلی ہے۔''

دادی اماں اس کے لرزتے وجود کو بڑی مشکوک نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔

''میں...... میں......'' دادی کے خوف نے اس کی زبان پر ہکلاہٹ طاری کر

دی۔ ''میں نیچے بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی تھی۔''

انہوں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''بچوں کے ساتھ کھیلنے کی تیری عمر ہے ایسی باتوں میں مَیں نہیں آنے والی۔''

''سچ کہہ رہی ہوں دادی اماں بچوں کے ساتھ ہی کھیلنے گئی تھی۔'' اس نے بڑی ہمت سے دادی کی جانب نگاہ اٹھائی۔

''ہاں ہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لئے جوتی اُتار کر یوں چوری چوری ہی جانا تھا۔'' وہ اس کے ننگے پاؤں کو گھورتے ہوئے غصہ میں بولیں۔ ''مجھے تو کچھ دال میں کالا معلوم ہوتا ہے سچ بتا کس کے پاس گئی تھی۔''

''دادی اماں!'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''خدا کے لئے مجھے غلط نہ سمجھئے میں ایسی نہیں ہوں۔'' اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

مگر دادی اماں نے اس کا بالکل یقین نہ کیا اسی سنگین لہجہ میں بولیں۔ ''جا جا یہ چکمے کسی اور کو دینا، میں بھلا تیرے خاندان کو جانتی نہیں۔ خالہ جوان ہوئی تو اس سے اپنی جوانی سنبھالی نہ گئی۔ باپ کی عزت کی پروا کئے بغیر کسی یار کے ساتھ فرار ہوگئی اور تیری ماں۔'' وہ بڑی حقارت سے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے کہے گئیں۔ ''وہ تو بہن سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔ نہ اسے خاوند کا خیال آیا نہ اس کی مامتا تڑپی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ بہن کے نقش قدم پر چل پڑی اور اب تو بھلا کب پیچھے رہے گی تیرا خمیر بھی تو اسی مٹی سے اٹھا ہے۔''

یہ کوئی آج کی بات نہ تھی اسے تو روز ہی ایسی باتیں سننا پڑتی تھیں۔ آنکھوں میں چھائی دھند گہری ہونے لگی تو وہ اسے چھپانے کے لئے کمرے کے اندر چلی گئی۔ مگر دادی وہیں کھڑی اسی طرح بلند آواز میں اسے صلواتیں سناتی رہیں۔

''کیا ہوا اماں؟'' پھپھو آنکھیں ملتے ہوئے ماں کے قریب آ کھڑی ہوئیں۔

''کیوں اتنے زور زور سے بول رہی ہو؟''

''اے بلقیس تمہیں کیا بتاؤں آج اس لڑکی نے کیا کیا۔ خالہ اور ماں کی طرح اب اس پر بھی جوانی سوار ہونے لگی ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''اس بھری دوپہر میں بیگم صاحبہ سیر سپاٹا کرتی پھر رہی تھی۔''

''کہاں۔''

''یہ میں نہیں جانتی کہاں ویسے کہیں گئی ہوئی تھی اور وہ بھی جوتی اتار کر چوری چوری۔''

''تو آپ کہاں تھیں کیوں اسے جانے دیا؟''

''اے بیٹی مجھ بڑھیا کا کیا ہے ذرا سی آنکھ جھپک گئی تو یہ حرامزادی کی لڑکی موقع غنیمت جانتے ہوئے دبے دبے پاؤں باہر نکل گئی۔'' لمحہ بھر کے لئے رک کر دادی اماں نے سانس ہموار کی اور پھر بلند آواز میں بولنے لگیں۔ ''جب میری آنکھ کھلی تو یہ غائب تھی میں نے کتنی ہی آوازیں دے ڈالیں مگر کوئی جواب نہ ملا بہت دیر بعد کہیں سے منہ کالا کیے آ گئی۔''

''آپ نے پوچھا ہوتا کہ کہاں گئی تھی۔''

''پوچھا تو تھا۔''

''پھر کیا بتاتی ہے؟''

''بتانا ہوتا تو یوں سب سے چوری چوری جاتی ہی کیوں۔ بس اِدھر اُدھر میں ٹال گئی ہے۔''

''کیا اِدھر اُدھر میں کچھ پتہ بھی چلے' آخر کہتی کیا ہے۔''

''کہتی ہے بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی تھی۔''

''بچوں کے ساتھ۔؟'' پھپھو کی لاڈلی لڑکی غزالہ کا قہقہہ صبا کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح ٹپکا۔ ''انیس سال کی لڑکی پانچ پانچ چھ چھ سال کے بچوں کے ساتھ کھیلے گی۔'' وہ بڑے طنزیہ انداز میں ہنسے جا رہی تھی۔ ''نانی اماں! صبا اب کھیل کھیلنے لگی ہے ابھی سے اس کا سنبھالا کر لیجئے۔ ورنہ تاریخ ایک بار پھر خود کو دہرانے لگے گی۔''

وہ اب اپنے وجود کو قابو میں نہ رکھ سکی۔ بڑی بے چارگی سے لڑکھڑاتی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ آنکھوں میں پھیلی دھند نے بادلوں کا روپ دھار لیا اور وہ رم جھم رم جھم برسنے لگے۔

2

جانے کب سے اس پر طعن وتشنیع کی بارش ہو رہی تھی۔ اس کے شعور کو جب پہلی باران کی بوچھار نے بھگویا اس وقت وہ صرف پانچ سال کی تھی۔

دوپہر بڑی گرم تھی۔ یونہی اسی کمرے میں دادی کی چارپائی کے قریب اس کی چھوٹی سی چارپائی بچھی تھی۔ اسے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی مگر وہ دادی اماں کے خوف سے دم سادھے پڑی تھی اور ان کے خراٹے تھے کہ اسے مزید دہلائے دے رہے تھے۔

ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ وہ اسی طرح دبکی پڑی رہی۔

''شی! شی!!''

اس نے چونک کر سر اٹھایا ادھ کھلے کواڑوں میں اس کی پھپھو کا نو دس سالہ لڑکا سہیل کھڑا اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔ اس کے ننھے سے معصوم چہرے پر بے اختیار فرشتوں کی سی پاکیزہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ عجلت سے اٹھ کر اس کی جانب لپکی۔

''آہستہ آہستہ کہیں نانی اماں جاگ نہ پڑیں۔'' سہیل نے آہستہ سے کہا۔

صبا اس کے حکم کی تعمیل میں ہولے ہولے پاؤں رکھتی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''کتنی بار تمہیں کہا ہے کہ اس وقت نہ سویا کرو۔'' سہیل نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر سرگوشی کی۔

''پیپل کے نیچے سب اکٹھے ہو چکے ہیں۔ کھیل شروع ہونے والا ہے اور تم ہو کہ سو رہی ہو۔ بھلا بچے یوں بڑوں کی طرح دوپہروں میں سویا کرتے ہیں۔''

''دادی اماں کہتی تھیں سو جاؤ ورنہ ماروں گی۔'' وہ اس کی انگلی تھامے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چلتی بسور کر بولی۔

''انہیں پتہ ہی کب چلے گا تھوڑا سا کھیل کر ان کے اٹھنے سے پہلے پہلے ہم آ جائیں گے۔''

''گجالہ بھی کھیلے گی نا۔'' اس نے سہیل کی چھوٹی بہن غزالہ کے متعلق پوچھا۔

''ہاں۔'' سہیل نے بڑوں کے سے انداز میں مختصر جواب دیا۔

''تو پھر اسے بھی بلا لیں۔''

''اسے میں پہلے ہی وہاں چھوڑ آیا ہوں۔ بس تم رہ گئی تھی میں نے سوچا تمہارا بھی کھیلنے کو دل چاہتا ہوگا۔ چاہتا ہے نا؟''

''ہاں بہت۔'' اس نے انتہائی معصومیت سے سر ہلا دیا۔

اور پھر ان دونوں کو آتے دیکھ کر سب بچے تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار کرنے لگے چند لمحوں بعد دنیا و مافیہا کو بھول کر وہ سب اپنے معصوم معصوم کھیلوں میں گم ہو چکے تھے۔

اس گرم دوپہر میں پیپل کے نیچے بہار آ گئی۔ دھرتی کے ان معصوم فرشتوں کو دھوپ کی تیزی سے بچانے کے لئے پیپل کی شاخیں جھک جھک کر ان پر سایہ کرنے لگیں۔ یہی ننھے منے قہقہے تو اس کی بہار تھی۔

''سہیل! غزالہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پھپھو کی کڑک دار آواز نے سب بچوں کو لرزا دیا جو جہاں تھا وہیں سہم کر رہ گیا۔

''امی! ہم کھیل رہے ہیں۔'' سہیل سب سے زیادہ دلیر ثابت ہوا۔

وہ دھپ دھپ زمین پر پاؤں مارتی ہوئی ان سب کے قریب آ گئیں۔ پہلے چند لمحے کھڑیں انہیں گھورتی رہیں اور پھر ہاتھ بڑھا کر سہیل کے پاس سہمی کھڑی صبا کا بازو بڑی بے دردی سے پکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔

''تم یہاں ان سب میں کیا کر رہی ہو؟'' وہ شعلے برساتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ بید مجنوں کی طرح کانپ رہی تھی۔

''یہ بھی ہمارے ساتھ کھیل رہی ہے۔'' سہیل بہت سیانا تھا ماں کی غضب ناک نگاہوں کو دیکھ کر جلدی سے آگے بڑھا اور صبا کے تھر تھر لرزتے وجود کو سہارا دینے کے لئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''یہ تو سو رہی تھی اسے میں ہی جگا کر لایا تھا۔'' اسے اس کی زرد اور سہمی ہوئی صورت پر بے طرح ترس آ رہا تھا۔ اس لئے جھٹ سے ساری بات اپنے

سر لینے کی کوشش کی۔

وہ چھوٹی سی تو تھی۔ مگر نجانے امی ہمیشہ اسے ڈانٹتی ڈپٹتی ہی رہتی تھیں حالانکہ وہ بے چاری تو اتنی بے ضرر تھی کہ بلی کے اس چھوٹے سے بچے سے بھی زیادہ وہ جو خرخر کر کے چوزوں کو ڈرا لیتا تھا مگر یہ صبا یہ تو بس سب سے ڈر ہی جایا کرتی تھی۔ ڈرا کسی کو نہیں سکتی تھی۔

''لیکن تم کیوں اسے جگا کر لائے۔'' اب پھپھو نے بیٹے کی طرف غضب ناک نگاہیں اٹھائیں۔

''سب کھیل رہے تھے میں نے سوچا اس کا دل بھی چاہتا ہوگا۔''

''اس کا دل بھی چاہتا ہوگا۔'' بڑبڑاتے ہوئے پھپھو نے گھور کر سہیل کو دیکھا۔

''کتنی بار کہا ہے اس مردار کے ساتھ نہ کھیلا کرو۔ مگر تم باز ہی نہیں آتے۔''

''کیوں امی اس کے ساتھ کیوں نہ کھیلیں؟'' غزالہ نے بڑھ کر ماں کا پلو تھامتے ہوئے پوچھا۔

''یہ اس قابل نہیں کہ شریفوں کے ساتھ کھیلے۔'' وہ بیٹی کے بالوں کو انتہائی شفقت سے سلجھاتے ہوئے بولیں۔

''کیوں امی کیوں؟''

سہیل کو ماں کا یوں بات بے بات صبا پر خفا ہونا ہمیشہ ناگوار گزرتا تھا۔

''اس کی ماں بھاگ گئی تھی۔ اس لیے اب یہ اس قابل نہیں کہ تم بچے اس کے ساتھ کھیلو۔''

''امی! آپ بھی تو ہمیں مارنے کے لئے ہمارے پیچھے بھاگا کرتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے پھر ہمارے ساتھ بھی کوئی نہ کھیلے۔''

''چپ بدتمیز!'' پھپھو نے بڑے قہر سے سہیل کو دیکھا۔ ''جس بات کا علم نہ ہو اس میں خواہ مخواہ ٹانگ نہ اڑایا کرو۔'' انہیں ہمیشہ اس کی ایسی کج بحثی پر غصہ آ جایا کرتا اور وہ اپنی اولاد کا غصہ بھی صبا پر اتارنا ہی فرض سمجھتی تھیں۔ کیونکہ ان کی دانست میں وہ اس دنیا میں، اس گھر میں ان کا حق غصب کرنے چلی آئی تھی۔

وہ نہ ہوتی تو والدین کی ساری جائیداد صرف انہیں کو ملتی اور اب یہ بھائی کی اکلوتی اولاد ایک کانٹا بن کر ہر وقت ان کے دل میں چبھتی رہتی اور ہر چبھن کا بدلہ وہ صبا پر مظالم ڈھا کر لیتیں شاید اسی طرح انہیں کچھ تسکین حاصل ہو جائے۔ مگر پھر بھی انہیں چین نہ آتا اور وہ اکثر و بیشتر صبا کو بھاوج کی ناجائز اولاد قرار دینے کی کوشش کیا کرتیں۔

ان کا بھائی فوجی تھا اور وہ اکثر باہر چھاؤنیوں میں ہی رہتا تھا۔ شادی کے پانچ چھ سال بعد پیدا ہوئی اور ابھی وہ بمشکل دو تین ماہ کی ہوگی کہ اس کی ماں کہیں چلی گئی۔ کچھ عرصہ بعد کسی محاذ پر جنگ کرتا ہوا اس کا باپ بھی شہید ہو گیا۔

اور اب وہ دادی اور پھپھو کے رحم و کرم پر تھی۔ کبھی کبھار اگر دادی کے دل میں اس کی محبت کی کوئی کرن چمک اٹھتی تو وہ بیٹی کی خودغرضی کی تاریکی میں دم توڑ دیتی۔

''دونوں بہنیں ہی آوارہ تھیں نجانے کس کی اولاد ہمیں پالنا پڑ رہی ہے۔''

''تبھی تو جاتے ہوئے اسے یوں پھینک گئی۔ حرام کی اولاد سے تو ماں بھی چھٹکارا پانے کی کوشش کرتی ہے۔''

اور پھر بیٹی کے ساتھ ماں بھی ہم آواز ہو جاتی۔

''اماں! ایک بات کہہ دوں اب اگر میں نے اسے اپنے بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ لیا تو ایمان سے اس کا گلا دبا دوں گی لاکھ بار منع کرنے کے باوجود وہ کچھ سنتی ہی نہیں۔ جب دیکھو ان میں گھسی ہوئی کھیل رہی ہوتی ہے۔''

''بلقیس! سچی بات کہوں۔ اس میں اس کا اتنا قصور نہیں جتنا سہیل کا ہے۔ وہ خود اسے ساتھ ساتھ لئے پھرتا ہے۔''

''اس کا بندوبست تو میں کرلوں گی۔''

یوں تو سہیل کافی نڈر تھا لیکن ماں کی سختی نے اسے ڈرنے پر مجبور کر دیا پھر وہ اکیلا ہی کھیلنے کے لئے چلا جاتا۔ البتہ کبھی کبھار جب ماں اور نانی گھر پر نہ ہوتیں تو موقع غنیمت جانتے ہوئے اسے کھینچ کھانچ ساتھ لے جاتا۔ کبھی تو اس کی یہ چوری چھپی رہ جاتی اور اگر غزالہ بتا دیتی یا بلقیس خود سر پر آ پہنچتیں تو پھر دونوں کی خوب مرمت ہوتی۔

بار بار ایک بات کہی جائے تو اس کا اثر ہونا لازمی ہے۔ اب بچوں کے معصوم ذہنوں میں بھی یہ بات بیٹھتی جا رہی تھی کہ صبا کے ساتھ کھیلنا بُری بات ہے۔ دوسرے جب بھی وہ ان کے ساتھ کھیلتی تو ان کا کھیل ضرور گڑبڑ ہو جاتا۔ عین موقع پر کبھی بلقیس آ جاتی اور کبھی دادی اماں اور پھر صبا کے ساتھ انہیں بھی اپنا کھیل چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں میں بھاگ جانا پڑتا۔

وہ سب یوں روز روز کی مداخلت برداشت نہ کر سکے۔ اب سہیل صبا کو ساتھ لے کر آتا تو سبھی بچے اسے ساتھ کھلانے سے انکار کر دیتے۔ وہ ننھی سی جان آنکھوں میں بے بسی کے آنسو لئے ایک سمت کھڑی ہو کر بڑی حسرت سے ٹکر ٹکر انہیں دیکھا کرتی اور حیران ہو ہو کر اپنے ساتھ ہونے والے اس سلوک کی وجہ سوچنے کی کوشش کرتی۔ مگر ننھے سے دماغ میں جب کچھ نہ آ سکتا تو چہرہ ہاتھوں میں لے کر سسکیاں بھرنے لگتی۔

وہ نو سال کی ہو گئی تھی دھیرے دھیرے اس کا ذہن پختگی پکڑتا جا رہا تھا اچھے اور بُرے سلوک میں اب وہ تمیز کر سکتی تھی۔ نیا کپڑا اسے کبھی میسر نہ آیا تھا۔ اکثر غزالہ کی اترن ہی اس کے حصے میں آتی کتنا کتنا اس کا جی چاہتا کہ غزالہ کی طرح وہ بھی سرخ سرخ' نیلے نیلے اور پیلے پیلے خوبصورت پھولوں والے فراک پہن کر اپنے ہمجولیوں کو اترا اترا کر دکھائے اور پھر ان کی توصیفی نگاہوں کو اپنے جسم پر محسوس کر کے خوشی سے پھولے نہ سمائے بالکل غزالہ کی طرح! مگر اسے ایسی خوشی تو کیا نصیب ہوتی الٹا سب کا مذاق ہی بننا پڑتا۔ بعض اوقات تو غزالہ کے پھٹے پرانے کپڑے بھی جب اس سے مزید پھٹ جاتے اور وہ بالکل ہی استعمال کے قابل نہ رہتے تو سہیل کا کوئی پرانا پاجامہ اور قمیض اسے پہننے کو دے دیا جاتا۔ پھپھو اور دادی کی جھڑکیوں کے خوف سے وہ انہیں پہن تو لیتی مگر پھر سارا دن بالکل الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتی۔ ایک دو بار پیپل تلے کھیلنے والے سب بچوں کا مذاق جو بن چکی تھی۔

اور یوں آہستہ آہستہ اس کا تعلق سب سے ٹوٹتا جا رہا تھا۔ ساتھ کھیلنے کا رشتہ چھوٹا تو وہ ایک طرف کھڑی ہو کر ان کا کھیل دیکھ دیکھ کر ہی اپنی حسرتیں پوری کرنے کی کوشش کیا کرتی اور یوں تھوڑا سا تعلق اس سے بندھا رہ گیا مگر اب تو یہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ سہیل کے

پھٹے پاجامے اور قمیض میں جب اسے سب نے لونڈا کہہ کر مذاق کیا تو پھر وہ بالکل ہی حویلی کے کمروں کے اندر مقید ہو کر رہ گئی مگر ذہن پر تو کوئی پابندی نہ لگا سکتا تھا وہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو جاتی کہ آخر اس میں اور غزالہ میں کیا فرق تھا جو ایک رانیوں کی طرح زندگی گزار رہی تھی تو دوسری کا مقدر لعنت اور پھٹکار ہی بن کر رہ گیا تھا آخر کیوں؟ بہت سوچنے پر بھی جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو بے اختیار اسے رونا آ جاتا پھر وہ سب سے چھپ چھپ کر کتنی ہی دیر روتی رہتی۔

گھر بھر میں اگر کوئی اس سے ذرا اچھی بات کرتا تو وہ سہیل تھا یا پھر پھوپھا ابا۔ سہیل تو ماں اور نانی کی جھڑکیاں' کوسنے اور مار کھا کر بھی اس کی طرفداری کرنے سے باز نہ آتا البتہ پھوپھا ابا کو جب اس کے ذریعے پھپھو کی ٹوکری میں سے چوری چوری بٹوہ لینے کی ضرورت پڑتی تو انہیں صبا یاد آ جاتی۔

''صبا بیٹی! ذرا ادھر تو آنا!'' وہ کسی کام کے لئے بیٹھک کی طرف سے ہو کر گزرتی تو پھوپھا ابا آواز دبا کر اسے بڑے پیار سے پکارتے۔

''جی آئی پھوپھا ابا!'' اور وہ ان میٹھے بولوں کی اتنی پیاسی تھی کہ نہال سی ہو کر جھٹ ان کے پاس جا پہنچتی۔

''میری بیٹی کیا کرتی پھر رہی ہے۔'' وہ انتہائی محبت پاش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہوتے۔

''کچھ نہیں پھوپھا ابا! وہ ذرا دادی اماں کو سر درد ہو رہا تھا۔ ان کے سر میں تیل ڈالنے کے لئے بوتل لینے ادھر گودام میں جا رہی تھی۔''

''اچھا تو میری بیٹی یہ تو بتا تیری پھپھو کیا کر رہی ہے؟'' ان کی آواز میں اور بھی مٹھاس بھر جاتی اور وہ اپنی توند کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ جاتے

''وہ وہ۔''

پھوپھا کی آواز کی شیرینی نشہ بن کر اس کے حواس پر چھا جاتی۔ وہ سرشاری ہو کر سوچنے لگتی۔ ''ہاں یاد آیا وہ گڈو کی امی کے پاس گئی ہوئی ہیں۔'' اس وقت یہ بھی بھول جاتی

کہ پھپھو نے پھوپھا ابا کو بتانے سے منع کیا تھا۔

''کب تک واپس آ جائیں گی؟''

''یہ ساتھ ہی تو ان کا گھر ہے چاہے ابھی آ جائیں۔''

''اچھا تو میری بیٹی جلدی سے میرا کام کر بھاگ کر ان کی ٹوکری تو لے آ' وہی جس میں وہ اپنا بٹوہ رکھتی ہیں۔''

''دادی اماں کے سر میں تیل ڈال دوں تو پھر لاتی ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ ایک دم گھبرا اٹھتے کہ کہیں اس وقت تک بیگم صاحبہ واپس تشریف نہ لے آئیں۔

''تو جا پہلے وہ لے آ ایک منٹ کا تو کام ہے۔'' وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر اس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے۔ بالوں کی ایک دو لٹیں جو اس کی خوبصورت پیشانی پر جھول رہی ہوتیں انہیں پرے ہٹاتے اور پھر اس کی پیشانی چوم لیتے۔

''جا میرے چاند تو ہی تو میری اصلی بیٹی ہے۔''

وہ' جسے ہمیشہ پھٹکار ہی ملتی تھی اتنا سارا پیار پا کر بے اختیار ہو جاتی تھوڑی دیر بعد دادی اماں کے کام کو دیر ہو جانے پر جو جھڑکیاں پڑنا ہوتیں نہ ان کا خوف اس کے ذہن میں رہتا اور نہ بٹوے میں سے پیسے غائب ہونے پر پھپھو کی مار پیٹ کا خیال اسے آتا۔ بس سب کچھ بھول' بھاگی بھاگی جاتی اور سرخ سرخ چہرہ اور پھولی پھولی سانس سے پھوپھا ابا کے حضور میں وہ ٹوکری لا دھرتی' جیسے اس پیار کے بدلے میں نذرانہ پیش کر رہی ہو۔

''شاباش! جیتی رہو میری بیٹی! تم تو اس گھر میں سب سے اچھی ہو۔'' وہ جلدی جلدی اپنا کام کرتے جاتے اور اس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے اور وہ سانس ہموار کر کے مزید سرخ ہوئی جاتی۔

''لیکن باقی سب تو مجھے بہت برا کہتے ہیں پھپھو اور دادی اماں ہر وقت پیٹتی رہتی ہیں۔ غزالہ لڑتی رہتی ہے ہر اچھی چیز خود لیتی ہے مجھے کچھ بھی نہیں دیتی۔'' ذرا سی ہمدردی پا کر اس کی زبان پر فریاد آ جاتی چھوٹی سی تو تھی بڑوں کا سا حوصلہ اور صبر کہاں سے لاتی۔

''نہیں نہیں ان سب کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے جو تجھ سے ایسا سلوک کرتے ہیں ورنہ تو تو بڑی اچھی ہے۔'' وہ سر جھکائے ٹوکری میں سے بٹوہ تلاش کرتے رہتے اور ان کی زبان سے بغیر کسی خلوص یا ہمدردی کے الفاظ پھسلتے رہتے۔

''پھوپھا ابا!''

ان کے بظاہر تسلی بڑھے کلمات سن کر وہ اطمینان کا سانس لیتی ہوئی ان کے قریب بیٹھ جاتی اور جھک جھک کر ٹوکری کے اندر جھانکتے ہوئے پھوپھا ابا کا چہرہ دیکھتی ہوئی ننھی ننھی معصومیت بھری باتیں کرتی جاتی۔ ''یہ بھاگنا بہت برا ہوتا ہے کیا؟''

''نہیں۔'' وہ بے دھیانی میں اس کی باتوں کا جواب دیئے جاتے اور اپنے کام میں مگن رہتے۔

''تو پھر سب یہ کیوں کہتے ہیں کہ میری امی بھاگ گئی تھی اس لئے میں بہت بری ہوں۔''

''ہوں۔'' وہ اس کی سنی ان سنی کر کے جلدی جلدی بٹوے میں سے کھڑکھڑاتے نوٹ نکال کر گننے لگتے اس وقت ان کے چہرے پر بڑی مسرور سی فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی ان کی یہ مسکراہٹ صبا کو اور بھی دلیر کر دیتی۔

''میں تو پھوپھا ابا! اب کبھی نہیں بھاگتی اگر جلدی کا کام ہو تو تیز تیز چل لیتی ہو لیکن بھاگتی بالکل نہیں اور غزالہ اور باقی سب بچے روز بھاگتے دوڑتے ہیں غزالہ کو آپ منع کیجئے نا نہیں تو پھر اسے بھی پھپھو اور دادی اماں پیٹیں گی۔''

''صبا! اری او صبا!! کہاں دفن ہو گئی تو۔'' دور سے دادی اماں کی خفگی بھری آواز آتی دونوں ہی چونک اٹھتے ایک لمحے میں صبا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ جاتا اور پھوپھا ابا کانپتے ہاتھوں سے جلدی جلدی کچھ رقم نکال کر بٹوہ بند کر کے واپس ٹوکری میں ٹھونس دیتے۔ ''لے جاؤ یہیں رکھ دے۔''

وہ دادی کے خوف سے لرزتی ہوئی ٹوکری اٹھا کر چل دیتی۔

''اری جلدی بھی جانا۔'' اب ان کی آواز سے وہ شیرینی اور چاشنی غائب ہوتی

وہ ٹھٹک کر لمحہ بھر کے لئے حیرت سے ان کی جانب دیکھتی مگر اس یک لخت تبدیلی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تو دادی کے ڈر سے جلد جلد قدم اٹھانے لگتی۔

پھر بھی پھوپھا کی یہ غرض بھری محبت اور دو میٹھے بول اسے غنیمت معلوم ہوتے شک بعد میں اس کا خمیازہ اسے بری طرح بھگتنا پڑتا مگر وہ ہر بار چوٹ کھا جاتی اور یہ سب کچھ محبت کی وہ تشنگی اس سے کرا رہی تھی جو ہوش سنبھالتے ہی اس نے اپنے نصیب میں پائی تھی۔

تیرہ چودہ سال کی ہوئی تو اس کے ذہن نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اس شعور نے خود بخود ہی اس پر زندگی کا ہر راز کھولنا شروع کر دیا تھا۔ اب کوئی اسے ماں کے فرار ہونے کا طعنہ دیتا تو وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے حیرت سے اسے دیکھنے نہ لگ جاتی بلکہ شرم و ندامت سے اس کی گردن جھک جاتی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے کسی نے بھری محفل میں اسے ننگا کر دیا ہو۔ اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کسی جوان عورت کا گھر سے چلے جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ ایسی عورت کو نہ سماج معاف کرتا ہے' نہ معاشرہ اور نہ مذہب۔!

اور وہ ایسی ہی ایک عورت کی بیٹی تھی جو پاکباز اور شریف نہیں تھی۔ چونکہ اس کی رگوں میں شریف خون نہیں دوڑ رہا تھا اس لئے ہر عمر میں اس پر نئی نئی پابندیاں لگتی رہتی تھیں دوسروں کی طرح وہ اپنی مرضی اور آزادی سے سانس تک نہ لے سکتی تھی۔ تعلیم اس کے لئے مضر ثابت ہو سکتی تھی کہ سکول جاتے آتے وہ کسی سے دل نہ لگا بیٹھے اور پھر انجام کار ماں کی طرح ایک روز اپنا منہ کالا کر جائے۔ کیونکہ وہ شریف ماں کی اولاد نہیں تھی۔ اچھا لباس اسے اس لئے پہننے کو نہ دیا جاتا تھا کہ وہ اسے اور بھی حسین بنا دے گا اور اس کا حسن کہیں اسے لے نہ اڑے کہ آخر اسے اپنی ماں جیسا ہی ہونا تھا۔ وہ بھی تو بڑی حسین تھی اور جب اچھا لباس پہن لیتی تو بالکل کسی ملکہ کی طرح باوقار دکھائی دینے لگتی تھی تبھی وہ ٹک نہ سکی۔ اس کے حسن نے ہی اسے تباہی کے گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ اسے اچھی خوراک نہ دی جاتی کہ جوانی سر پر چڑھی آ رہی تھی اور یہ اچھی خوراک سونے پر سہاگہ نہ بن جائے۔ مبادا حسن و جوانی کی اس روشن شمع کے گرد پروانے منڈلانے لگیں۔ اور وہ اس ماں کی بیٹی کے

ناطے گھر کی عزت کا سودا کر بیٹھے جس نے اپنے خاوند کی عزت کا خیال کیا تھا اور نہ اولاد کے لئے اس کی مامتا تڑپی تھی۔

غرضیکہ شک و شبہات کی ان بلند دیواروں نے اسے بری طرح اپنے اندر قید کر رکھا تھا اور وہ تھی کہ حیران حیران سب کچھ دیکھتی رہتی' سب کچھ سنتی رہتی مگر اس کی زبان پر خاموشی کے قفل پڑے رہتے۔ وہ کسی کو بھی کچھ نہ کہتی۔ ہر ظلم خاموشی سے سہے جاتی۔

البتہ اپنے اندر کسی برائی کو جنم نہ لینے دیتی کہ شاید اپنی اس پاکبازی اور نیک چلنی کے ذریعے ہی ماں کی لگائی ہوئی اس کالک کو دھو سکے جو اس کی پیشانی کا بدنما داغ بن چکی تھی۔

3

وہ چپ چاپ دادی اماں کے ساتھ والی چارپائی پر لیٹی تھی موسم گرما کی دوپہروں کی طرح آج کی دوپہر اتنی گرم تو نہ تھی مگر پھر بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور ہمیشہ کی طرح ان کے بے سرے اور بے ہنگم خراٹے کمرے کے در و دیوار ہلائے دے رہے تھے۔

وہ بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ مگر احتیاط اور آہستگی سے' کیونکہ کبھی کبھی اس کی چارپائی کی چرچراہٹ سے دادی کی نیند بھی کھل جایا کرتی تھی۔ اور بے وقت ان کی نیند کھلنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ صبا کی شامت آ گئی۔

اس نے سینکڑوں ہی کروٹیں بدل ڈالیں مگر نیند نے نہ آنا تھا نہ آئی۔ وہ اسی پریشانی اور بے چینی میں پڑی تھی کہ چھت پر پیدا ہونے والی دھم کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی اور متوحش نگاہوں سے نیند میں مدہوش دادی اماں کی جانب دیکھنے لگی مگر وہ اسی طرح اپنے خراٹوں کے ساز پر نیند کی لے میں مست تھیں۔ وہ اس آواز کے متعلق پریشانی سے سوچنے لگی۔ جو یقیناً چھت پر کسی کے کودنے کی تھی۔ اوپر چھت پر

بنے دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں گھر کا بہت سارا فالتو سامان پڑا تھا۔ جو فالتو اور پرانا ہونے کے باوجود کافی قیمتی تھا۔

چند دن بیشتر اسی طرح جبکہ دوپہر کو سب گرمی کی شدت سے پناہ مانگتے ہوئے اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے تو کوئی چور پچھواڑے کے پائپ کے ذریعے اوپر چڑھ گیا تھا۔ اور خوب اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد چند ایک قیمتی چیزیں مثلاً دادا ابا کے وقت کا پرانا کلاک' جو مرمت طلب تھا مگر سستی کے مارے اسے مرمت نہ کرایا گیا تھا۔ ایک قیمتی پرانا قالین جو میلا ہو چکا تھا لیکن اگر اسے دھلا لیا جاتا تو انتہائی خوبصورت اور نفیس تھا اور ایسی ہی چند ایک اور چیزیں' جو بظاہر فالتو پڑی تھیں مگر حقیقت میں کافی قیمتی تھیں۔ چرا لے گیا تھا۔ اس چوری کا سارا الزام صبا کے سر لگا تھا کہ کیوں اس نے اوپر والے کمروں میں تالا نہ لگایا تھا۔ حالانکہ وہ بہت کہتی رہی کہ اس میں اس کا کیا قصور؟ اس نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا ان کمروں کو کبھی مقفل نہ دیکھا تھا۔ مگر اس کی کون سنتا تھا۔ یہ تو اس گھر کا دستور تھا بن چکا تھا کہ بغیر کسی تفتیش یا تصدیق کے ہر بات کا الزام اس پر دھر دیا جاتا اور وہ غریب کچھ بھی نہ کہہ سکتی۔ چپ چاپ سنتی' دو چار آنسو بہاتی اور پھر خاموش ہو رہتی کہ یہ سب تو اس کا مقدر بن چکا تھا۔

دنیا میں آتے ہی وہ ایک گناہ جو کر بیٹھی تھی۔ وہ گناہ جس میں وہ سراسر بے گناہ تھی۔ لیکن حقیقت کو حقیقی نگاہ سے دیکھنے کی کبھی کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ اس کی ماں نے گناہ کیا تھا اس لئے وہ گناہگار تھی۔ راندہ درگاہ تھی اور اب ہر کسی کو پورا پورا حق تھا کہ اس کے ساتھ جیسا چاہے برے سے برا سلوک کرے۔ اسے انسان تو سمجھا جاتا ہی نہ تھا۔

اس آواز کے بعد کچھ منٹ بالکل خاموشی رہی وہ چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے دم سادھے بیٹھی تھی کہ تھوڑی دیر بعد اوپر کسی کے چلنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔

اب اس کا خاموش رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پہلے اس نے دادی اماں کو جگانا چاہا مگر پھر وہ اس گستاخی کی جرات نہ کر سکی۔ انہیں ان کی خراٹوں بھری میٹھی نیند سے جگانا گویا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دینے کے مترادف تھا۔ چنانچہ اس نے دادی اماں کو

جگانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

''ہوسکتا ہے سب میرا وہم ہی ہو۔'' اس سوچ نے اس کا ڈر اور خوف کم کر دیا۔

''ایسی بھی کیا بزدلی کہ ایک واہمے سے گھبرائی جا رہی ہوں۔'' اس نے اپنی ہمت بندھائی اور پھر بڑی احتیاط سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اپنا گھر ہے ڈرنے کی کیا بات ہے چپکے سے اوپر جا کر دیکھتی ہوں اگر واقعی کوئی ہوا تو پھپھو اور غزالہ کو جگا دوں گی۔''

وہ بڑی دلیری اور ہمت سے دبے دبے قدم اٹھاتی زینہ طے کر گئی۔ سب سے اوپر والی سیڑھی پر پہنچ کر اس نے سر آگے کر کے ذرا سا جھانکا۔ بے شک اس نے خود کو سمجھا بجھا کر بہادر بنا لیا تھا مگر اندر ہی اندر خوف کی ایک ہلکی سی لہر اب بھی اٹھ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے سر پیچھے کھینچ لیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ مسکرا دی اسے وہاں کچھ بھی دکھائی نہ دیا تھا۔ خوف کی وہ لہر بالکل معدوم ہو گئی۔ وہ بڑی دلیری سے آخری سیڑھی بھی چڑھ گئی۔

اور پھر جیسے ایک دم کسی نے اس کا دل مٹھی میں لے کر دبا دیا ہو۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک سرد سی لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ جلدی سے پلٹی اور جیسے برقی قوت کے تحت نئی سیڑھیاں واپس اتر گئی۔ اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ وہ وہیں زینے کے وسط میں بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

کیا سچ مچ وہ غزالہ ہی تھی؟ اسے کسی طرح یقین نہ آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کون تھا؟ اور وہ دونوں کیوں اس دوپہر میں وہاں تنہا تھے؟

صبا کا دماغ بری طرح سنسنا رہا تھا۔ چند منٹ وہ دھک دھک کرتے دل کو تھامے بیٹھی رہی۔ اور پھر جب اس کے حواس کچھ بجا ہوئے تو جانے کن کن سوچوں نے اس کے چہرے پر سرخی پھیلا دی۔ وہ بھی تو جوان تھی اور سینے میں گوشت پوست کا ایک دل بھی رکھتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں پھر وہ منظر گھوم گیا۔

کمرے کی دیوار کے سائے تلے وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ غزالہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور دونوں ہاتھ اس اجنبی کے ہاتھوں میں تھے جو اس کے گلنار اور شرمائے ہوئے چہرے کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا اور دھیرے دھیرے کچھ کہہ رہا تھا۔ حالانکہ زینہ

بالکل سامنے تھا مگر وہ ایک دوسرے میں کچھ ایسے کھوئے ہوئے تھے کہ انہیں صبا کے آنے اور پھر واپس جانے کی بالکل خبر نہ ہوئی۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے میں گم بیٹھے رہے۔

اس نظارے کا خیال آتے ہی ایک بار پھر صبا کا دل دھڑک اٹھا اور آپ ہی آپ اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی جیسے دو مضبوط ہاتھوں نے خود اس کے ہاتھ تھام رکھے ہوں اور اس کے ساتھ پیمان وفا باندھا جا رہا ہو۔ اس کے جسم میں بجلیاں سی دوڑ گئیں۔ اس نے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا اور ان مدھر مدھر خیالات میں کھو سی گئی۔

کچھ دیر وہ یونہی کھوئی کھوئی سی بیٹھی رہی پھر کسی خیال کے آتے ہی بڑی آہستگی سے اٹھ کر ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی اوپر چڑھنے لگی۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ ایک بار پھر وہی حسین نظارہ دیکھے۔ اور اب پوری احتیاط سے اس نے ذرا سا سر نکال کر جھانکا مگر اب اسے وہ نظارہ نہ دکھائی دیا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ کندھے سے کندھا ملائے بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

اس کے خیال میں ان کی گفتگو بھی ان کی حرکات کی مانند بڑی دلچسپ ہو سکتی تھی اس کا دل سننے کو بے اختیار ہو گیا۔

''تم اپنے وعدے پر قائم رہو گی نا؟'' اجنبی نے غزالہ کا ہاتھ پھر اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔

''ہاں میں تیار رہوں گی۔'' غزالہ کی آواز میں عجیب قسم کا لوچ تھا جو پہلے صبا نے کبھی نہ سنا تھا۔

''اور وہ زیورات؟''

''ہاں ہاں میں سارا انتظام کر لوں گی تم بالکل فکر نہ کرو۔'' غزالہ نے نگاہوں میں پیار لئے اس کی جانب دیکھا۔ ''ایک دو ہلکی ہلکی چیزیں جو میری ہیں وہ تو میرے اپنے ہی پاس ہیں۔ وہ لے لوں گی اور اس کے علاوہ امی کا بہت ڈھیر سارا زیور ہے وہ نانی اماں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔''

''تو کیا وہ نہیں لے سکو گی؟'' اجنبی نے ذرا سٹ پٹاتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں کل ہی نانی اماں، امی اور میں ایک رشتہ دار کے ہاں مدعو ہیں میں سر درد کا بہانہ کر کے رک جاؤں گی اور پھر ان کی غیر موجودگی میں نانی اماں کے بکس سے سارا زیور نکال لوں گی۔'' وہ نظروں ہی نظروں میں اس پر سے تصدق ہوئی جا رہی تھی۔ ''ویسے نانی اماں کے پاس اپنا زیور بھی بہت سارا ہے جو امی کہتی ہیں ان کی موت کے بعد ہمیں ملے گا کیا وہ بھی لے لوں؟''

''تمہاری مرضی۔'' اجنبی نے بظاہر لاپروائی کا اظہار کیا لیکن دوسرے ہی لمحے جلدی سے بولا۔ ''میں نے تو اس لئے کہا تھا کہ جانے ہمیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔ اجنبی شہر ہوگا اجنبی لوگ ہوں گے اور پھر جاتے ہی تو ملازمت وغیرہ کا بندوبست نہیں ہو جائے گا اور نہ ہی گھر مکان کا۔ کچھ دن ہمیں ہوٹل میں رہنا پڑے گا اور یہ تمہیں علم ہی ہوگا کہ ہوٹلوں کی رہائش کتنی مہنگی ہوتی ہے۔''

''ہم کسی سستے سے ہوٹل میں رہ لیں گے نا۔'' غزالہ نے بالکل گھر گرہستی سنبھالنے والی ایک عورت کی طرح گویا کفایت شعاری سے کام لیا۔

''واہ! بھلا میں یہ گوارا کر سکتا ہوں کہ تمہیں کسی خراب جگہ پر رکھوں۔ تم جو میری زندگی ہو میری روح ہو۔''

اس نے ایک دم جذباتی ہوتے ہوئے غزالہ کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

''تو پھر ہم کب چلیں گے؟'' غزالہ نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

''بس جب تم سارا انتظام مکمل کر لو اسی رات کو لیکن ایک بات کا خیال رکھنا۔ کسی کے کان میں بھنک بھی نہ پڑے۔''

''لو بھلا کبھی یہ ہو سکتا ہے اور پھر ایسی بات کا چرچا کروں گی جسے سب بہت برا فعل کہتے ہیں۔''

''جب تمہیں علم ہے کہ یوں چوری چھپے گھر سے [illegible] جانے کو برا کہتے ہیں۔ تو تم پھر یہ حرکت کیوں کر رہی ہو؟'' اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے گویا غزالہ کو چھیڑا۔

''وہ وہ۔'' وہ کچھ گھبرا سی گئی۔ ''کیا یہ تم کہہ رہے ہو تم۔ جس کی محبت سے مجبور ہو

کر میں اپنا گھر' اپنی پیاری امی اور اپنے بھائی جان کو چھوڑ دینے کو تیار ہو گئی ہوں۔'' غزالہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ارے!'' وہ مسکرایا۔ ''میں تو محض مذاق کر رہا تھا۔ صرف تمہیں ستانے کے لئے ایسا کہہ رہا تھا...... ورنہ تم کیا جانو میری زندگی کا حاصل وہی دن ہو گا جب تم میری ہو گی صرف میری۔'' وہ اپنے رومال سے غزالہ کے آنسو پونچھنے لگا۔ ''تو پھر پروگرام پکا ہے نا میری جان۔'' اس نے غزالہ کی ٹھوڑی چھوتے ہوئے اس کا چہرہ اونچا کیا۔

''ہاں۔'' ایک شرگیں مسکراہٹ غزالہ کے لبوں پر پھیل گئی۔

صبا دم بخود کھڑی تھی وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ معاملہ اتنا بڑھ چکا ہو گا ابھی ابھی جو جذبات اس کے دل میں گدگدی پیدا کر رہے تھے وہ یک لخت جانے کہاں جا سوئے اب اس کے دماغ میں صرف ایک خیال گردش کر رہا تھا۔ غزالہ گھر سے بھاگ گئی تو اس گھر کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی پہلے ہی اس کی ماں کے اس قسم کے فعل نے کتنی زندگیاں خراب کر دی تھیں اور اب ماں کے خیال سے اس کا سر مجرمانہ انداز میں جھک گیا۔ نہیں نہیں وہ ایسا نہیں ہونے دے گی وہ غزالہ کو اس نوجوان کے ساتھ چوری چوری کبھی نہیں جانے دے گی کیونکہ کسی عورت کا ایسا فعل آنے والی نسلوں کے ماتھے کا کلنک بھی بن جاتا ہے۔

بہت جلد اس نے یہ سب کچھ سوچا اور پھر ایک جنونی کیفیت میں باقی تین سیڑھیاں ایک ہی جست میں پھلانگ گئی۔

آہٹ سن کر وہ دونوں چونکے اور صبا کو یوں سر پر کھڑا دیکھتے ہی ان کے حواس گم ہو گئے۔ کاٹو تو دونوں کے بدن میں لہو نہ تھا۔

''تم۔ تم۔'' غزالہ رحم طلب نگاہوں سے صبا کی جانب دیکھنے لگی۔

''ہاں میں ہی ہوں۔'' صبا ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''اور تمہیں اتنا کہنے آئی ہوں کہ جو کچھ تم دونوں سوچ رہے ہو وہ کبھی نہیں ہو گا۔'' پھر وہ نوجوان سے مخاطب ہوئی۔ ''اگر تمہیں سچ مچ ہی اس سے اتنی محبت ہے تو پھر سیدھا راستہ کیوں نہیں اختیار

کرتے۔'' نہ جانے اس وقت اس میں اتنی جرات کہاں سے آ گئی تھی کہ وہ اس اجنبی کے سامنے یوں دلیری سے بول رہی تھی وہ' جو اس گھر میں ایک قیدی کی سی زندگی گزار رہی تھی اور جس نے پھوپھا ابا اور سہیل کے علاوہ کسی مرد سے بات کرنا تو کجا کبھی سامنا بھی نہ کیا تھا۔ ''میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔'' وہ تقریباً گرجی۔ ''کیوں تم شریفوں کی طرح اپنی ماں کو بھیج کر عزت کے ساتھ اسے اپنا نہیں بناتے تمہارے دل میں یقیناً کھوٹ ہے جبھی تم ایک معصوم لڑکی کو ورغلانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

''یہ سراسر میری توہین ہے۔'' صبا کی کھری کھری باتیں سن کر نوجوان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ غزالہ کا ایک ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا وہ اسے جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جھٹکے سے غزالہ کو ایک دم ہوش آ گیا اس کا محبوب اس سے روٹھ کر جا رہا تھا۔

''نہیں نہیں۔'' اس نے لپک کر اس کا بازو پکڑ لیا اور کھا جانے والی نگاہوں سے صبا کو گھورنے لگی۔ اس صبا کو جس کی حیثیت اس گھر میں خاک کے ایک ذرے سے بھی کم تھی وہ اس سے ڈر گئی تھی۔ غزالہ کو خود پر ہنسی آ گئی اور پھر وہ تن کر صبا کے مقابل کھڑی ہو گئی۔ ''تمہاری یہ اوقات! کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھا ہے۔ چلی ہے مجھے نصیحتیں کرنے۔''

''کچھ بھی کہو مگر میں تمہیں یہ حرکت نہیں کرنے دوں گی اگر تم اپنے ارادے سے باز نہیں آؤ گی تو میں پھپھو اور دادی اماں سے کہہ دوں گی مگر تمہیں یہ مذموم فعل نہیں کرنے دوں گی کبھی نہیں کرنے دوں گی۔'' وہ کسی مجذوب کی مانند چلائی۔

''صبا! غزالہ!! کہاں ہو تم دونوں۔'' نیچے سے دادی اماں کی آواز سنائی دی۔

نوجوان نے اپنا بازو جھٹک کر غزالہ کے ہاتھ سے چھڑا لیا اور بھاگ کر پچھلی طرف کی چھ فٹ اونچی دیوار پر بندروں کی سی پھرتی سے چڑھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور پھر ساتھ والے مکان کی چھت پر کود گیا۔

وہ کیا گیا کہ غزالہ کی جیسے جان چلی گئی۔ وہ اسے روکنے کے لئے چند قدم بڑھی بھی تھی۔ بے قرار ہو کر اس نے اسے پکارا بھی تھا مگر وہ پھر بھی چلا گیا تھا۔ غزالہ دل پکڑ کر رہ گئی۔ وہ اس سے پیار کرتی تھی۔ دوپہروں کی گرمی میں جل جل کر اس نے اپنی محبت کو حدت بخشی تھی اور اسے پروان چڑھایا تھا اب وہ اتنی آگے جا چکی تھی کہ اس محبت کی خاطر اپنے ماں باپ اور ان کی عزت کو بھی تج دینے کو تیار تھی۔

مگر وہ چلا گیا تھا شاید ہمیشہ کے لئے۔ غزالہ تڑپ اٹھی۔ بے چین ہو اٹھی۔ یہ سب کچھ صبا کی وجہ سے ہوا تھا اسے وہ ایک ایسی ڈائن دکھائی دینے لگی جس نے اس کا کلیجہ چبا ڈالا ہو۔ پل کے پل میں اس کی محبت کا پر بہار چمن اس نے اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ غزالہ پر جنون سوار ہونے لگا۔

''کمینی!'' اس نے غصہ میں کھولتے ہوئے صبا کی طرف قدم بڑھائے۔ ''آخر تم ہوتی کون ہو میرے معاملات میں دخل دینے والی۔ آئی ہے مجھے شرافت کا سبق دینے کبھی اپنا شجرۂ نسب بھی دیکھا ہے۔'' اس نے دانت کچکچاتے ہوئے صبا کے بازو پکڑ لئے

''خدا تجھے غارت کرے صبا بتا تو نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا ہے۔'' غزالہ بالکل دیوانی ہو چکی تھی۔ اس نے صبا کو بڑے زور سے جھنجھوڑ ڈالا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے۔'' آگے آگے بلقیس اور ان کے پیچھے دادی اماں ہانپتی کانپتی اور زور زور سے بڑبڑاتی چلی آ رہی تھیں۔ ''آوازیں دیتے دیتے میرا حلق بھی خشک ہو گیا۔ نہ جانے ہمارے گھر میں یہ آج کیا ہونے لگا ہے جوان جہان لڑکیاں سنسان دوپہروں میں کیا یوں کوٹھوں پر پھرا کرتی ہیں۔''

غزالہ نے ماں اور نانی کو دیکھا تو جلدی سے صبا کے بال چھوڑ دیئے مگر اس کی آنکھیں ابھی تک آگ برسا رہی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' بلقیس نے غزالہ کی آنکھوں میں شعلے اور اس کے ہاتھوں میں اس کے بال دیکھ لئے تھے۔ ''یہ تم دونوں اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''پھپھو! دادی اماں۔۔!!''

پھپھو اور دادی کو دیکھتے ہی صبا کی ساری دلیری رخصت ہو گئی وہ کانپتے ہوئے بولی۔ ''غزالہ غزالہ۔''

اور وہ ہکلا ہکلا کر آگے کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ غزالہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کر آگے بڑھی۔ ''ہاں ہاں بتا دے خود ہی میری زبان نہ کھلوا تو اچھا ہے۔'' وہ بڑی عیاری سے بولی۔

''ہوا کیا آخر کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔'' دادی اماں سانس ہموار کرتے ہوئے بولیں۔

''ہونا کیا ہے ہو بہو ماں اور خالہ کے نقش قدم پر چلا جا رہا ہے۔''

غزالہ نے اس سے انتقام بھی تو لینا تھا۔ چنانچہ سب کچھ اس کے سر تھوپ دیا۔

''دوپہروں کو سب سے چھپ چھپ کر محبت کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔''

''نہیں نہیں۔'' صبا ایک دم چلائی ''ابھی ابھی غزالہ یہاں کسی اجنبی کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کا منصوبہ بنا رہی تھی اور میں تو اسے منع کرنے آئی تھی۔'' وہ جلدی جلدی ایک ہی سانس میں کہہ گئی کہ کہیں سچ مچ وہی مجرم نہ سمجھ لی جائے۔

''بکواس نہ کرو۔'' بیٹی پر بات آئی تو بلقیس نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے صبا کے رخسار پر ایک تھپڑ جڑ دیا۔ ''یہ سراسر بہتان ہے میری بیٹی کبھی ایسی نہیں ہو سکتی وہ ایک شریف ماں کی اولاد ہے۔''

تھپڑ کی چوٹ اتنی سخت تھی کہ صبا کا ہاتھ بے اختیار رخسار پر جا پہنچا اور وہ ڈبڈباتی آنکھوں سے پھپھو کی طرف دیکھتے ہوئے سہمی سہمی آواز میں بولی۔ ''پھپھو! میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ ابھی ابھی وہ ساتھ والے مکان پر کود گیا ہے غزالہ سے پوچھ لیجئے۔''

''ہاں! یہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے کہ وہ ساتھ والے مکان پر کود گیا ہے۔ مگر وہ یہاں جو آیا تھا۔ میرے لئے نہیں بلکہ اس کے لئے آیا تھا۔'' غزالہ نے بڑی مکاری سے اپنا سارا گناہ اس پر رکھ دیا۔ ''آپ کو یاد ہوگا اس دن بھی دوپہر کو یہ جوتی اتار کر چوری چوری کہیں گئی ہوئی تھی۔''

''مگر اس دن تو میں بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی تھی۔'' انتہائی بے بسی سے اس کی

طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”سنا آپ نے نانی اماں! انیس بیس سال کی لڑکی بچوں کے ساتھ کھیلے گی۔“

”واہ کیا خوب بہانہ بنایا ہے۔“ غزالہ نے بڑے زور سے ایک طنزیہ قہقہہ لگایا۔ اور پھر وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی کہ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی بھر آیا۔ ل جونجانے ہنسنے کی وجہ سے آ گیا تھا یا وہ آنسو تھے جو چند منٹ پہلے اس کے ساتھ پیش آنے والے المیہ کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں آ گئے تھے۔

اس کا محبوب روٹھ کر چلا گیا تھا عین اس وقت جبکہ وہ خوشیوں کے جھولے جھولنے والی تھی۔ یہ کیا ہو گیا؟ غزالہ کے تو تن بدن میں ایک آگ سی لگی ہوئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کس طرح صبا کو ذلیل و رسوا کرے اتنا کہ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

اور وہ بے چاری جو پہلے ہی بے گناہ ہوتے ہوئے بھی خود کو گناہگار جانتے ہوئے کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ سمجھتی تھی۔ صبا منہ کھولے ہکا بکا ڈبڈبائی آنکھوں سے غزالہ کو دیکھ رہی تھی اور چوٹ کھا کر جلتے ہوئے رخسار پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ یہ اس پر سراسر الزام تھا۔ ظلم تھا اور زیادتی تھی۔

”نانی اماں! آپ کو کتنی دفعہ امی نے کہا ہے کہ اس کا خیال رکھا کریں۔“ غزالہ اپنے دل کی تڑپ اور بے قراری کے گن گن کر بدلے لے رہی تھی۔ ”آپ کو تو علم ہی ہے کہ یہ کس ماں کی بیٹی ہے اور اب اس کی عمر کیا ہے۔ اگر بر موقع میں نہ پہنچ جاتی نہ جانے یہاں کیا کیا ہو جاتا۔“

دادی اماں کی قہر آلود نگاہیں صبا پر گڑی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائیں گی۔ صبا ان نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی اس نے بڑی ہمت کر کے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی شاید بات ان کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اس ناکردہ گناہ کے الزام سے بری ہو کر ان کے عتاب سے بچ جائے۔ ”دادی اماں! خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہی، غزالہ اپنا گناہ میرے سر“

”پھر وہی بات۔“ پھپھو نے اس کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی۔ ”میں نے کتنی بار کہا ہے اپنی ناپاک زبان پر میری بیٹی کا نام نہ لایا کر وہ تجھ جیسی نہیں ہے اور نہ ہی تمہاری جیسی ماں کی بیٹی ہے۔“ پھر وہ جلدی سے بیٹی کی طرف مڑیں۔ ”غزالہ! چلو نیچے کیسی گرم ہوا چل رہی ہے لو لگ جائے گی۔“

وہ جلدی سے بیٹی کا ہاتھ تھام کر سیڑھیوں کی طرف بڑھیں۔ صبا نے بڑی بے بسی سے دونوں ماں بیٹی کی جانب دیکھا۔ جاتے جاتے ایک لمحہ کے لئے رک کر غزالہ نے صبا کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور پھر نظر ملتے ہی مسکرا دی۔ بڑی عجیب سی طنزیہ مسکراہٹ! جیسے کہہ رہی ہو۔ ”اب کبھی میرے معاملات میں دخل دو گی؟“ صبا نے بڑی بے چارگی سے سر جھکا لیا۔

”اماں!“ سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر بلقیس رکی اور مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”اس لڑکی کا سنبھالا کر لو ایسا نہ ہو کوئی اور گل کھلے اور پھر ہم رہی سہی عزت کو بھی بیٹھ کر روئیں۔“ وہ یہ کہہ کر بیٹی کو ساتھ لئے نیچے اتر گئیں۔

کچھ دیر دادی اماں خاموش کھڑی قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کی یہ خاموشی صبا کی جان نکالے دے رہی تھی۔ ان کے سامنے سر جھکائے گم سم سی کھڑی وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھ لیتی۔ کتنی ہی بار اس کا دل چاہا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہے مگر دادی کا خوف کچھ اتنا خوفناک تھا کہ زبان ہلانا الگ رہا وہ تو ساری جان سے لرز رہی تھی۔ بے گناہ ہوتے ہوئے بھی کانپ رہی تھی اور خود کو گناہگار سمجھ رہی تھی۔ ”اب تو مجھے تیری ہڈی پسلی ہی توڑ کر ڈالنا پڑے گا۔“

اتنا کہہ کر دادی اماں بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لپکیں اور اس کا بازو بڑی بے دردی سے پکڑ کر اسے گھسیٹتے ہوئے زینے کی طرف بڑھیں۔

کچھ تو وہ ڈر اور خوف کے مارے ایسی سہمی ہوئی تھی کہ ایک قدم چلنے کی بھی اس کے پاؤں میں سکت نہ رہی تھی۔ اوپر سے دادی کے غصے نے ان کے وجود میں کچھ اتنی طاقت بھر دی تھی کہ وہ نیچے تک ان کے ساتھ ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

4

''ہیلو امی پیاری! کہیے کیا حال چال ہے؟''

''ارے! تم کب آئے؟''

بے سان وگمان بیٹے کو سامنے دیکھ کر وفور مسرت سے بلقیس کھل اٹھیں اور ان کے بازو بے اختیار پھیل گئے۔ سہیل والہانہ آگے بڑھا اور ایک ننھے بچے کی طرح ماں کی باہوں میں سمٹ گیا۔

''میرا چاند! میرا لال!! کتنے عرصہ بعد آیا ہے۔''

''صرف تین مہینوں بعد ہی تو آ گیا ہوں۔'' وہ ماں سے اس طرح لپٹا لپٹا بولا۔

''اور پھر میں نے کب خواہش کی تھی کہ میں جلاوطن ہونا چاہتا ہوں۔ آپ ہی کی ممتا جوش میں آئی تھی جو اتنی دور پھینک دیا۔''

''بس آتے ہی لڑائی جھگڑا شروع کر دی۔'' بیٹے کے چہرے کی طرف محبت بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے ایک پیار بھری چپت لگائی۔

''چل اندر نانی اماں اور بہن کو مل۔ وہ بھی تو تمہاری راہیں دیکھا کرتی ہیں۔'' وہ خود بھی اس کے ساتھ چلنے کے لئے' چیزیں سمیٹ کر ٹوکری میں ڈالنے لگیں۔

''صبا کہاں ہے؟''

بلقیس کے چہرے پر پھیلی مسرت بھری مسکراہٹ اک دم مفقود ہوگئی۔ ''بس! آتے ہی تمہیں اس کی فکر لگ جایا کرے۔'' وہ ناگواری سے بڑبڑائیں۔

''تو اس میں برائی کیا ہے کیا وہ میری ماموں زاد نہیں؟ کیا ہم نے بچپن اکٹھا نہیں گزارا؟'' وہ بڑے غور سے ماں کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ''اگر رشتے داری اور اتنی طویل رفاقت کے تحت میں نے اس کا پوچھ لیا تو آپ کو ناگوار کیوں گزرا؟''

''ہونھ! رشتہ داری اور بچپن کی رفاقت خدا نہ کرے ایسی رشتہ داری کسی کی ہو۔''

وہ ٹوکری اٹھا کر بڑبڑاتے ہوئے چل پڑیں۔

سہیل چند لمحے وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر مسکراتا ہوا ماں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ ''لائیے یہ میں اٹھالوں۔'' اس نے ماں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ان کے ہاتھ سے ٹوکری پکڑ لی۔

''یہ صبا آپ کو اتنی بُری کیوں لگتی ہے امی؟'' اس نے چلتے چلتے اچانک رُک کر ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''پھر وہی بات!'' وہ تلخی سے بولیں۔ ''کتنی بار کہا ہے میرے سامنے تو اس لڑکی کا ذکر نہ کیا کر۔ تیری انہیں طرف داریوں سے تنگ آ کر ہی مجھے اپنی ممتا کے سینے پر پتھر رکھتے ہوئے تجھے اتنی دور بھیجنا پڑا ورنہ کوئی ماں نہیں جو اپنی اولاد کی اتنی طویل جدائی برداشت کرے۔''

''یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ آخر ایسی کیا دشمنی ہوئی جو آپ کی ممتا کو بھی پس پشت ڈال گئی۔'' سہیل بڑے طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ''وہ آپ کی بھتیجی ہے اور میں نے سنا ہے بہن کو بھائی کی اولاد بڑی عزیز ہوتی ہے۔''

''کون سے بھائی کی اولاد! نہ جانے یہ کس کی اولاد ہے۔''

''توبہ! توبہ!!'' وہ کانوں کی لوؤں کو چھوتا ہوا بولا۔

''کیا؟ کیا مطلب؟'' بلقیس نے کھا جانے والی نگاہوں سے بیٹے کو دیکھا۔

''کچھ نہیں میں کہہ رہا تھا کہ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر بھی اس بے چاری کا کیا قصور؟ وہ خود تو بالکل معصوم اور بے گناہ ہے۔''

''اب یہ بات یہیں ڈھکی رہنے دو۔ پھر کہو گے کہ ہم سب ہر وقت اس کی برائیاں ہی کرتے رہتے ہیں۔''

''کیا ڈھکی رہنے دوں؟ وہ تو آپ نے پہلے ہی زمانے بھر میں ڈھنڈورا پیٹا ہوا ہے کہ وہ ایسی ہے اور ویسی ہے۔ باقی اب رہ کیا گیا ہے جو آپ ڈھک رہی ہیں۔'' سہیل کے لبوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

''اب آ تو گئے ہو ذرا صبر کرو چند دنوں میں ہی اس کے لچھن اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے۔ ہو بہو ماں کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔'' وہ رازدارانہ انداز میں بولیں۔

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ ماں کے رازدارانہ انداز سے چونکا۔

''ہونا کیا ہے شروع ہوگئیں وہی باتیں۔''

''کیا؟'' وہ وہیں رک گیا اس کے چہرے پر تجسس کی ہلکی سی لہر کے ساتھ پریشانی کا سایہ بھی تھا۔ ''آخر ہوا کیا؟'' اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ سی آ گئی۔

''وہی ماں جیسی حرکتیں۔''

''کیا مطلب؟''

اور پھر بلقیس نے وہیں کھڑے کھڑے خوب نمک مرچ لگا کر پچھلے دنوں کے واقعات اسے سنانا شروع کر دیئے۔

''جب وہ کہتی ہے بچوں کے ساتھ کھیلنے گئی تھی تو پھر آپ کیوں خواہ مخواہ اس پر شک کرتی ہیں۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے وہ سچ کہہ رہی تھی؟''

''جہاں تک میں اسے جانتا ہوں اس نے جھوٹ کبھی نہیں بولا۔''

''اسے پاگل کتے نے نہیں کاٹا تھا کہ ایسی جلتی دوپہر میں بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتی اور وہ بھی سب سے چوری چوری۔'' وہ بیٹے کی نادانی پر مسکرا دیں۔ ''پگلے! یہ بڑی خطرناک عمر ہوتی ہے بچوں کے ساتھ کھیلنا تو محض ایک عذر تھا۔'' اور وہ پھر اسے مزید واقعات سنانے لگیں۔

''بتاؤ اب کیا کہتے ہو؟'' بلقیس بڑے عجیب انداز سے بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ غزالہ غلط کہہ رہی ہو۔''

''ہاں ہاں اس گھر میں سب جھوٹ بولنے والے بستے ہیں۔ ایک سچی ہے تو صرف وہ۔'' غصہ سے بلقیس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''چلئے امی! غصہ تھوک دیجئے میں تو صرف مذاق کر رہا تھا آپ سب کچھ ٹھیک کہتی ہوں گی۔'' سہیل نے بات رفع دفع کرنے کے لئے کہا ابھی ابھی تو وہ آیا تھا۔ اور آتے ہی اس نے ایسی ایسی باتیں کر کے ماں کا موڈ خراب کر لیا تھا اسے اپنے آپ پر افسوس ہونے لگا یہ سب کچھ تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ اس کے ایسا کرنے سے بھلا صبا پر ہونے والے ستم کبھی کم بھی ہوئے تھے!

وہ چپ چاپ ماں کے ساتھ چلتا ہوا وسیع آنگن پار کر گیا پچھلے برآمدے میں دادی اماں اپنے چھوٹے سے تخت پر بیٹھی تسبیح پھیر رہی تھیں اور غزالہ آرام کرسی پر لیٹی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی۔ قدموں کی چاپ سن کر دونوں نے نگاہیں اٹھائیں اور سہیل کو سامنے کھڑا دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیں۔

دیکھتے ہی دیکھتے گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی مگر ایک صبا تھی کہ جسے گویا ان خوشیوں سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ وہ رکھنا تو چاہتی تھی لیکن یہ دنیا جو اتنی ظالم تھی کہ سب سے اس کا تعلق توڑنے پر تلی ہوئی تھی۔ سہیل؛ جس کی آمد اس کے لئے خوشیوں کے در وا کر دیا کرتی تھی۔ آج اسی کے آنے کا سن کر وہ سہمی تھی اور چپ چاپ کمرے میں بیٹھی باہر سے آنے والی آوازوں کو سن رہی تھی۔

غزالہ خوشی کے مارے بھائی سے سوال پر سوال کئے جا رہی تھی اور وہ ایسے اوٹ پٹانگ جواب دے رہا تھا کہ ان دونوں کے ساتھ ماں اور نانی کے قہقہے بھی فضا میں پھیل رہے تھے۔

صبا کے ہونٹ بار بار ہنسنے کے لئے پھیل جاتے مگر اس کی کم نصیبی ہر بار اس کے ماتھے پر اپنی موجودگی کا احساس دلا کر اس کی آنکھوں کو پرنم کئے دے رہی تھی۔ ابھی اسے پچھلے دنوں والے واقعات سنا دیئے جائیں گے پھر وہ نجانے کس طرح اس کے ساتھ پیش آئے۔ شاید سب گھر والوں کی طرح وہ بھی اس سے متنفر ہو جائے۔

''نہیں نہیں۔'' اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں وہ تصور بھی نہ کر سکی کہ سہیل بھی سب جیسا ہو جائے۔ پھر وہ کس سہارے جی سکے گی وہی تو اس کی آخری امید ہوا

کرتی تھی ہر طرف سے گالیاں' کوسنے اور لعن طعن کھا کر صرف ایک وہی تھا جس کے دامن میں اسے پناہ ملا کرتی تھی۔ کتنا اچھا تھا وہ اور کتنا مخلص!!

سہیل کی چھٹیاں تو گویا اس کے لئے رحمتیں لے کر آیا کرتی تھیں۔ ان دنوں پھپھو اور دادی کی سختیاں بھی کچھ کم ہو جایا کرتی تھیں کیونکہ وہ بہت منہ پھٹ واقع ہوا تھا۔ نہ بہن کا لحاظ کرتا نہ نانی کا، سچی اور کھری بات منہ پر کہہ دیتا۔ اسے ماں سے بڑی محبت تھی مگر صبا سے وہ کوئی بدسلوکی کرتیں تو وہ برداشت نہ کر سکتا۔

''بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ سارے کے سارے گھر والے اس کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اس سے تو بہتر تھا پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتے یوں روز روز کی موت میں اسے کبھی نہیں مرنے دوں گا۔''

وہ گھر بھر میں قیامت برپا کر دیتا۔ اور اس وقت صبا کی حالت عجیب سی ہوتی اس کا سینہ خوشی سے پھول پھول جاتا اور ایک اطمینان اور سکون بھری لہر انگ انگ میں دوڑ جاتی کہ دنیا میں کوئی تو اس کا تھا۔

مگر اس کا یہ اطمینان اور سکون دیرپا ثابت نہ ہوتا مہینے ڈیڑھ مہینے کی چھٹیاں پلک جھپکتے گزر جاتیں سہیل کے جاتے ہی گویا گھر بھر کو چھوٹ مل جاتی۔ اس کے گھر سے باہر قدم نکالتے ہی وہ لاوے جو اندر ہی اندر کھول رہے ہوتے ایک دم ابل پڑتے اور ظلم پہلے سے بھی سوا ہو جاتے!

''صبا کی بچی!! تو اس سہانی شام میں یہاں کیوں گھسی بیٹھی ہے۔''

وہ اپنے خیالات سے چونک اٹھی۔ سہیل سامنے کھڑا اس کی سوجی سوجی آنکھوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا چند لمحے صرف چند لمحے وہ وہیں چارپائی پر گم سم سی بیٹھی اس کی جانب دیکھتی رہی اور پھر کسی خیال کے آتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھی' اور بے اختیار سہیل سے لپٹ گئی۔

''بھائی جان! بھائی جان!! خدا کی قسم میں نے کوئی بری حرکت نہیں کی میں بالکل بے قصور ہو مجھ پر سراسر الزام لگایا گیا ہے میں نے کچھ نہیں کیا' میں نے کچھ نہیں کیا۔''

وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی اور دیوانوں کی مانند بڑبڑانے لگی۔

''پاگل ہوئی ہو کیا؟'' سہیل نے اس کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھے یقین ہے آپ کو پھپھو اور غزالہ نے میرے متعلق بہت کچھ بتایا ہوگا مگر خدا کی قسم سہیل بھائی! یہ سب غلط ہے۔''

''تو میں نے کب ان کی کسی بات کا یقین کیا ہے تم یونہی پریشان ہو رہی ہو۔''

''سچ!'' اس نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر صداقت معلوم کرنے کے لئے سہیل کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آپ نے بالکل یقین نہیں کیا؟''

''نہیں بالکل نہیں تم نے خواہ مخواہ ہی اپنی آنکھیں رو رو کر متورم کر لیں۔ پاگل لڑکی!'' اس نے بڑی یگانگت اور پیار سے اس کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

وہ بے اختیار مسکرا اٹھی اس کا معصوم چہرہ شبنم میں بھیگے پھول کی طرح حسین تھا۔ سہیل کی نگاہیں اس کے چہرے کی معصومیت اور تقدس پر جم کر رہ گئیں۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے جلدی سے نگاہیں پھیر لیں۔

''کیا یہ تقدس بھی گناہگار ہو سکتا ہے؟'' اس کے اندر سے جیسے کوئی پکارا۔ ''کیوں سب کی آنکھوں پر پٹی بندھ چکی ہے؟ کیوں کسی کے دل میں ذرا خدا کا خوف نہیں؟''

اس نے یہ سب سوچتے ہوئے پھر صبا کی جانب نگاہ اٹھائی۔ وہ دو تین بالشت کے فاصلے پر بالکل اس کے سامنے کھڑی' بڑی عقیدت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ بیٹھیں گے نہیں؟'' اس نے آنکھیں جھپکتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''میں تمہاری طرح بدذوق تو ہوں نہیں کہ اتنی پیاری شام میں یہاں گھس کر بیٹھ رہوں۔'' وہ اپنی فطری زندہ دلی سے مسکرایا۔

''تو پھر اتنی حسین شام میں یہاں آئے ہی کیوں تھے۔ باہر ہی رہتے۔''

ایک سہیل ہی تو تھا جس سے وہ بے تکلفی سے باتیں کر سکتی تھی ورنہ اور کوئی اسے منہ کب لگاتا تھا۔

"تم باہر نظر نہ آئیں تو صبر نہ ہو سکا اندر بھاگ آیا۔ تمہاری طرح بے مروت تو ہوں نہیں کہ آواز سن کر بھی چپکی بیٹھی رہیں۔"

"نہیں نہیں۔" وہ خفیف سی ہو گئی۔

"کیا نہیں نہیں؟"

"بے مروت نہیں ہوں وہ تو' وہ تو میں ڈر رہی تھی۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"ارے! میں کوئی جن بھوت ہوں جو مجھ سے ڈر رہی تھیں۔"

"نہیں آپ سے نہیں ان باتوں کے اثر سے جو آپ کو بتائی گئی ہیں۔"

"پگلی! میں جب تک اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لوں کبھی کسی کی بات کا یقین نہیں کرتا اور پھر تمہارے متعلق کی گئی باتوں کا جو اکثر جھوٹ ہوتی ہیں۔"

"اوہ سہیل بھائی! آپ کتنے اچھے ہیں۔" وہ تشکرانہ انداز میں بدبدائی۔

"چل نکل باہر اور مجھے چائے بنا کے دے تمہیں معلوم بھی ہے کہ مجھے چائے کا نشہ ہے اور یہ نشہ صرف تمہارے ہاتھ سے ہی پورا ہوتا ہے مگر تمہیں خیال ہی نہیں آیا اور مجھے آئے کتنا وقت ہو گیا۔"

"اوہ!" وہ ایک دم باہر کی طرف لپکی۔

"او صبا نامراد! یوں سر پیر سے بے خبر کہاں بھاگی جا رہی ہو؟"

پھپھو نے اسے یوں بدحواسی کے عالم میں کمرے سے نکل کر بھاگتے ہوئے مشکوک نگاہ سے دیکھا۔ پہلے ہی سہیل کی اس حرکت نے ان کا پارہ چڑھا رکھا تھا کہ وہ آتے ہی صبا کے کمرے میں کیوں چلا گیا تھا۔

"کہیں نہیں پھپھو!"

وہ ان کی طرف توجہ دیئے بغیر تیزی سے باورچی خانہ میں چلی گئی۔

"اماں! دیکھ رہی ہو نا اس لڑکی کے چالے۔ مجھے تو اپنا لڑکا بھی ہاتھ سے جاتا معلوم ہوتا ہے...... کیسے آتے ہی اس کے پاس جا گھسا۔"

"نہیں بلقیس! ان میں تو بچپن سے ہی بہن بھائیوں جیسا پیار ہے۔" دادی اماں کبھی کبھی غیر ارادی طور پر اس کی حمایت کر جاتیں مگر پھپھو ان کی طرفداری سے بھڑک اٹھتیں۔

"ہونہہ! بہن بھائیوں جیسا پیار۔ غزالہ بھی تو ہے اسے تو میں نے کبھی یوں ہڑدنگے لگاتے نہیں دیکھا اس کا تو سگا بھائی ہے۔" پھر وہ کتنی ہی دیر بڑبڑاتی رہیں۔ "لیکن آپ کو کیا۔ لڑکا ہاتھ سے جائے گا تو میرا، آپ کو شاید اس کی ماں کے لچھن بھول گئے ہوں، مگر میں تو قیامت تک نہ بھولوں گی۔"

"اے بیٹی! یہ کیا واہی تباہی بکے جا رہی ہو سہیل کیا میرا کچھ نہیں۔ تم سے زیادہ تو اسے میں نے پالا ہے بھلا اس کے بھلے برے پر میرا دل نہ تڑپے گا۔"

"یہ ماں بیٹی میں کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔؟" اتنے میں سہیل وہاں آ پہنچا اور ان دونوں کے درمیان پھنس کر بیٹھتا ہوا بولا "اور وہ غزالہ کی بچی کہاں گئی؟"

"شاید اپنے کمرے میں گئی ہے۔" بلقیس چپکی بیٹھی رہیں تو نانی نے آہستہ سے جواب دیا۔

"اوہ! میں سمجھا تھا میرے لئے چائے بنانے گئی ہے۔" سہیل کے لہجے میں طنز چھپا ہوا تھا۔

"غزالہ! غزالہ!!" بلقیس کو ایک دم جیسے ہوش آ گیا۔ اتنی دور سے اتنے عرصے بعد بیٹا آیا تھا اور ابھی تک انہوں نے اسے پانی تک نہ پوچھا تھا۔

"جی امی!" کہیں دور سے اس کی آواز آئی۔

"اتنی دیر ہو گئی بھائی کو آئے ہوئے کیا اس کے لئے چائے وغیرہ کا کوئی بندوبست نہیں کرنا تھا۔"

"امی! میں اپنی قمیض ٹھیک کر رہی ہوں۔ ابھی نہا کر پہننا ہے۔ کریمن کو کہیں چائے بنا دے۔"

"کریمن! اری او کریمن!! پتہ نہیں کہاں مر گئی ہے۔ جا گھسی ہو گی اپنے اس نکھٹو کے پاس اگر وہ کماؤ ہوتا تو پھر نجانے یہ کیا کرتی۔ شاید چمڑی کی جوتیاں سلوا کر اسے پہنا دیتی۔"

یہ سب کچھ سن کر سہیل چپکے چپکے مسکرائے جا رہا تھا۔ اگر اس کا خاوند اپاہج تھا اور کمانے سے معذور تھا تو کیا بیوی کی توجہ کا حقدار نہیں تھا؟ کتنی عجیب ہے یہ دنیا! ان سب کو تو اس عورت کی قدر کرنا چاہیے۔ اسے عقیدت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ وہ کس طرح اپنے اپاہج خاوند سے وفا کئے جا رہی تھی۔ اپاہج بھی وہ جس کا کوئی سکھ اس نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ اس کے دیئے ہوئے سکھوں کے بدلے میں ہی اس پر اپنا سب کچھ نچھاور کرتی وہ تو جب بیاہ کر اس کے گھر آئی تھی تو وہ اپاہج تھا!

کریمن بہت خوبصورت تھی لیکن دنیا خوبصورت نہ تھی۔ وہ تو دھوکے اور فریب کا ایک جال تھی جس میں وہ پھنس گئی تھی اس کے سیدھے سادے والدین کو دھوکے سے رشتہ داروں نے پھانس لیا تھا کہ وہ ایک دولتمند شخص تھا۔ اگر اپاہج تھا تو کیا ہوا ان کی خوبصورت بیٹی راج کرے گی۔

مگر نہ اسے دولت ملی نہ راج ملا کیا؟ بس ایک اپاہج خاوند اور مفلسی! لیکن وہ حرف شکایت زبان پر نہ لائی اور اپنے والدین اور خاندان کی عزت اور وقار کو اس نے اپنے سر کا تاج بنا لیا۔ اور اب وہ اس تاج کی حفاظت کر رہی تھی کہ اس تاج سے ہی اب اس کا راج تھا! لیکن یہ دنیا یہ سماج یہ لوگ اب بھی خوش نہ تھے اور اس پر کیچڑ اچھالنے سے باز نہ آتے تھے۔

اور پھر اس کے خیالات کی رو اپنی ماں اور باپ کی طرف چلی گئی۔ اس کی ماں نے کبھی اس کے باپ کا کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بڑا شریف اور اچھا انسان تھا۔ ساری کی ساری تنخواہ لا کر بیوی کے ہاتھ پر رکھ دیتا اور پھر سارا مہینہ ایک ایک پیسے کے لئے ترستا۔ مگر اس پر رحم نہ کیا جاتا کتنی سخت تھی اس کی امی!

وہ دل ہی دل میں ان دونوں عورتوں کا موازنہ کرنے لگا۔ کریمن کو سب نیچ کہتے تھے اور اس کی ماں بڑے گھر کی عورت تھی یہ بلندی! اور وہ پستی!

کسے بلندی کہیے اور کسے پستی!

اسے ماں کی عادات بالکل پسند نہ تھیں خصوصاً صبا سے خدا واسطے کی دشمنی رکھنے

کی وجہ سے، کریمن کو ہر وقت کوسنے کی وجہ سے اور ابا کی طرف سے بے پرواہ رہنے کی وجہ سے۔ مگر پھر بھی وہ اسے بہت پیاری تھی بہت ہی زیادہ! اور ابا ان سے ہمدردی رکھنے کے باوجود ان سے وہ امی جتنی محبت کیوں نہیں کر سکتا تھا نجانے کیا بات تھی؟

وہ کچھ الجھ سا گیا اسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا اسے گھر آئے، تین چار گھنٹے ہو گئے تھے مگر وہ باپ کو نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے ان کے متعلق پوچھا تھا۔

وہ اپنی اس کوتاہی اور فرض ناشناسی پر خود کو کوستا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"امی ابا جان کہاں ہیں؟"

"باہر بیٹھک میں ہوں گے یا پھر دوستوں کے ساتھ کہیں جھک مارنے چلے گئے ہوں گے۔" بلقیس بڑی بے زاری سے بولیں اور پھر بلند آواز سے کریمن کو پکارنے لگیں۔

"کریمن! او کمبخت کہاں مر گئی تو۔ کب سے بلا رہی ہوں کیا اس کا کفن دفن کر کے ہی آئے گی میرا بچہ صبح سے بھوکا ہے کسی کو بھی اس کا خیال نہیں آ رہا۔"

"وہ اس کا کوئی کام کر رہی ہو گی ابھی آ جائے گی۔"

"تو میرے چاند تمہیں بھی تو بھوک لگی ہو گی۔"

"صبا چائے بنا رہی ہے۔"

"بنا نہیں رہی بلکہ بنا لی ہے۔" صبا مسکراتے ہوئے سینی اٹھائے آ گئی۔ "یہ لیجئے میں نے آپ کے لئے انڈے بھی بنائے ہیں۔" وہ اس کے سامنے تپائی پر سینی رکھتے ہوئے ہنس کر بولی۔ وہ کتنی خوش تھی۔ بات بے بات اس کے چہرے پر ہنسی پھیلی جا رہی تھی۔

"ہوں!" بلقیس نے بڑی معنی خیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا کیسے دونوں ہی ہنس رہے تھے!

وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئیں۔

5

''کتنی ہی آوازیں دے ڈالیں مگر مس صاحبہ ہیں کہ کان پر جوں ہی نہیں رینگ رہی۔''

''میں میں بڑا ضروری کام کر رہی تھی۔''

''کیا کام؟''

''تھا ایک۔''

''وہ، وہ دادی اماں کی قمیض سی رہی تھی۔''

''دکھاؤ تو بھلا۔''

''جی جی۔''

''جھوٹ بولتی ہو نا؟''

''نہیں نہیں تو۔''

''کیا نہیں تو۔ مجھے سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟''

''کچھ نہیں کچھ بھی تو نہیں۔''

''پھر وہی جھوٹ! آخر یہ جھوٹ بولنا تم نے کب سے سیکھ لیا۔'' وہ خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھی رہی۔ ''میری بات کا جواب نہیں دے رہیں۔''

وہ پھر بھی نہیں بولی تو سہیل کو غصہ آ گیا۔ صبا پر نہیں اس پر تو اسے کبھی غصہ آیا ہی نہ تھا۔ وہ بے چاری مظلوم سی لڑکی اتنی بے ضرر تھی کہ اس پر صرف رحم ہی آ سکتا تھا اور یا پھر پیار۔ اس کی پیاری پیاری صورت کچھ اتنی معصوم اور مقدس تھی کہ آپ ہی آپ توجہ سمیٹ لیتی تھی۔ غصہ تو اسے ان حالات پر آیا تھا جنہوں نے اسے مجبور اور بے بس بنا رکھا تھا اتنا مجبور کہ وہ زبان بھی نہ کھول سکتی تھی دادی اور پھپھو کا خوف ایسا اس پر طاری رہتا کہ ان کی غیر موجودگی میں بھی وہ سہمی سہمی دکھائی دیتی۔ اب بھلا ان دونوں کے علاوہ کمرے میں اور کون تھا جس سے خائف ہوتے ہوئے وہ کچھ کہہ نہ پا رہی تھی حالانکہ اس کے انداز سے

صاف عیاں تھا کہ ضرور کوئی بات تھی مگر پھر بھی وہ خاموش تھی۔

''بتاؤ نا آخر ہوا کیا؟ آج تم پڑھنے کے لئے میرے کمرے میں بھی نہیں آئیں میں نے اتنی بار پکارا تو سننے کے باوجود تم نے ان سنی کر دی۔''

''ہوا تو کچھ بھی نہیں۔'' وہ مدھم سی آواز میں بولی۔ ''پڑھنے میں صرف اس لئے نہیں آئی تھی کہ مجھے سر درد ہو رہا تھا۔''

''اوہ! تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔'' وہ درد جس سے ایک دم سہیل کے دل میں اتر گیا ہو۔ ''ٹھہرو میں ابھی تمہیں سر درد کی دوا لا کر دیتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' وہ جانے لگا تو صبا نے جلدی سے اس کا بازو تھام لیا۔ ''اب میں ٹھیک ہوں۔''

سہیل نے رک کر غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ ''ٹھیک ہو تو آؤ پھر پڑھو۔''

''آج دل نہیں چاہ رہا۔'' اس کے ہونٹ مسکرا دیئے۔

اور سیدھا سادا سہیل اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپی زہر بھری تلخی محسوس نہ کر سکا اور کرتا بھی کیسے؟ وہ تو بچپن سے لے کر اب تک اسی طرح صبا سے ہمدردیاں کرتا آیا تھا۔ اسے کیا پتہ کہ شباب کے آتے ہی زمانے کی نگاہیں بدل گئی تھیں۔ اور اب اس کی صبا سے ہمدردی کسی اور ہی نگاہ سے دیکھی جانے لگی تھی۔ اور تو اور خود اس کی اپنی ماں ہی ان دونوں کے میل ملاپ کو عجیب سے معنی پہنانے لگی تھی۔

یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر صبا سب کچھ جانتی تھی ہر ایک کی نگاہ کو پہچانتی اس لئے اس نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی تھی کہ جتنا ہو سکے سہیل سے کم واسطہ رکھے۔

''ہوں! دل نہیں چاہ رہا۔ دیکھتا ہوں کیسے دل نہیں چاہ رہا۔'' سہیل نے اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹا۔ ''چلو اٹھو ابھی چلو۔''

''اچھا۔ اچھا چلتی ہوں۔'' اس نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر سہیل نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے گھسیٹتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا۔

دادی اور پھپھو کہیں گئی ہوئی تھیں۔ غزالہ اپنے کمرے میں بیٹھی ریڈیو کے ساتھ

ساتھ گا رہی تھی کہ سہیل اور صبا کی آوازیں سن کر جلدی سے باہر نکل آئی۔

"تم اب پڑھائی سے جی چرانے لگی ہو مگر کچھ بھی ہو میں تمہیں جاہل نہیں رہنے دوں گا۔" سہیل زور زور سے بول رہا تھا اور اسے کھینچے لئے جا رہا تھا کہ ایک دم زور لگا کر صبا نے اپنا بازو اس سے چھڑا لیا۔ اور پھر وہ وہیں ٹھٹک کر رہ گئی اس کا چہرہ یک لخت زرد پڑ گیا غزالہ اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔

"آؤ نا یہاں کیوں رک گئیں؟" سہیل نے غزالہ کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے صبا کو گھور کر دیکھا۔

"جاؤ جاؤ بھائی جان ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں جب تک وہ یہاں ہیں کچھ پڑھ لکھ لو۔" اور پھر وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے واپس اندر چلی گئی۔

اس کے اس طنز نے صبا کو مزید خوفزدہ کر دیا۔ پہلے ہی پھپھو ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اسے کوستی ہی رہتی تھیں کہ وہ کیوں سہیل سے اتنی بے تکلف تھی اور کیوں سہیل کی زبان پر ہر وقت اس کا نام رہتا تھا۔ اپنے منہ پھٹ اور صاف گو بیٹے کو تو وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھیں ان کا سارا غصہ سہیل کی غیر موجودگی میں صبا پر ہی اترتا تھا اور خصوصاً ایک دن پہلے تو اس کی خوب گت بنی تھی۔

وہ سہیل کے کمرے میں بیٹھی اس سے پڑھ رہی تھی ایک لفظ کئی بار یاد کرنے کے باوجود اسے نہیں آ رہا تھا تو سہیل نے اس کا کان پکڑ لیا۔ کتنی ہی دیر وہ اپنا کان چھڑانے کی کوشش کرتی رہی مگر سہیل نے اس وقت تک نہ چھوڑنے کی قسم کھالی تھی کہ جب تک وہ صحیح لفظ نہ بتاتی اور اسے وہ لفظ بہت سوچنے کے باوجود یاد نہیں آ رہا تھا۔

سہیل کے ہاتھ میں اس کا کان تھا اور وہ درد سے بلبلائی جا رہی تھی اور پوری توجہ سے وہ لفظ حافظہ کی سطح پر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر وہ تو اس کے دماغ سے ایسا غائب ہوا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ! آخر تنگ آ کر اس نے سہیل سے کان چھوڑ دینے کی التجا کی مگر سہیل بھی ضد کا پکا تھا اس کی التجا بھی اس نے نہ سنی۔

صبا کو غصہ آ گیا اس نے جھک کر پوری قوت سے اپنے دانت سہیل کے بازو

میں گاڑ دیئے۔

"اوہ! چھوڑ صبا کی بچی!!؟"

اس نے تڑپ کر اس کا کان چھوڑ دیا اور اپنا بازو چھڑانے لگا۔

"ہوں! تو یہ پڑھائی ہو رہی ہے۔"

پھپھو کی آواز اس کے کان میں کیا پڑی تو اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ اس نے جلدی سے سہیل کے بازو پر سے دانت ہٹا لئے۔ حالانکہ وہ ارادہ یہ کئے ہوئے تھی کہ جتنی دیر سہیل نے اسے ستایا تھا کم از کم اتنی دیر تو وہ بھی اسے ضرور ستائے گی۔

اس نے سر اٹھاتے ہوئے سہمی سہمی نگاہیں اٹھائیں مگر پھپھو وہاں سے جا چکی تھیں اس کی آنکھیں دھندلا سی گئی جانے اب وہ اس کا کیا حشر کریں۔ وہ من ہی من میں لرز کر رہ گئی۔

"چلو پڑھو۔" جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو سہیل نے کتاب پھر کھولی۔

"نہیں۔" اس نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"ارے! کیا ہوا؟" وہ حیرت سے اس کی پرنم آنکھیں دیکھنے لگا۔ "کیا کان بالکل ہی اکھڑ گیا؟"

اور پھر مسکراتے ہوئے سہیل نے اپنے بازو پر سے آستین اونچی کی۔

"یہ دیکھو مگر میری آنکھوں میں تو ایک بھی آنسو نہیں۔ حد ہو گئی تمہاری نزاکت کی!"

سہیل کے بازو پر اپنے دانتوں کے گہرے نشان دیکھتے ہوئے وہ بغیر کچھ کہے خوف زدہ سی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی اور سہیل حیرت سے پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اور جب شام کو سہیل سیر کے لئے کہیں گیا ہوا تھا تو پھپھو نے اس کی خوب گت بنائی اور صاف صاف کہہ دیا کہ انہیں اپنے بیٹے سے صبا کی بول چال اور ایسی بے تکلفی بالکل پسند نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نہ تو آج سہیل کے کمرے میں پڑھنے گئی تھی اور نہ ہی

اسے اتنی بار پکارنے پر صبا نے کوئی جواب دیا تھا۔ اور جب پھر وہ خود ہی اس کے پاس آ گیا تو بولے بنا کوئی چارہ نہ رہا۔

اور اب غزالہ اسے دیکھ کر کتنے عجیب انداز میں مسکرائی تھی۔ جانے وہ ماں سے کیا کیا کہہ دے وہ اس کی دشمن جو ہو گئی تھی۔ دوست تو وہ صبا کی کبھی بھی نہ تھی ہمیشہ اس کے خلاف ہی بولتی تھی مگر اس دن کے بعد تو ان میں کھلم کھلا دشمنی ہو گئی تھی۔ بات بے بات پر خود بھی صبا کو کوستی رہتی اور ماں اور نانی کو بھی اس کے خلاف بھڑکاتی رہتی۔

یوں تو اس نے سہیل کو بھی صبا کے خلاف کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ تھا ہی کچھ نرالا! کبھی کسی کے کہنے سننے میں نہیں آیا کرتا تھا۔ جب تک حقیقت خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتا۔ اور صبا کا کوئی بھی عیب ابھی تک اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ اس لئے لاکھ سب کے چاہنے کے باوجود صبا اس کی نظر سے نہ اتر سکی تھی۔

سہیل اپنے کمرے میں سے بلند آواز میں چلایا۔ ”تو کیا سمجھتی ہے میرے پاس بہت سارا فالتو وقت پڑا ہے جو تو جب چاہے ضائع کرتی پھرے مجھے اپنے بھی بہت سے کام ہیں۔“

”تو کیجئے نا اپنے کام میں کب کہتی ہوں کہ مجھے ضرور پڑھایئے۔“ صبا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کے کمرے کے دروازے میں چوکھٹ سے کندھا ٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

”تو پھر نہیں پڑھو گی؟“ سہیل پلنگ سے اٹھ کر اس کے پاس آ گیا۔

”کیا پڑھے بغیر انسان کی زندگی نہیں گزر سکتی۔“

”پگلی! وہ تو ہر طرح گزر جاتی ہے۔“ سہیل بڑی ملائمت سے بولا۔ ”مگر زندگی زندگی میں بھی فرق ہوتا ہے نا۔ میں چاہتا ہوں کہ تو بس اتنا لکھ پڑھ لے کہ تجھے اچھی زندگی گزارنے کا شعور آ جائے۔“

”وہ تو سہیل بھائی مجھے زمانے کی ٹھوکروں نے ہی سکھا دیا ہوا ہے۔ اب آپ کو کیا سکھائیں گے۔“ اس کی بھیگی بھیگی پلکیں جھک گئیں۔

”دیوانی!“ سہیل بڑبڑایا اور پھر بڑے مشفقانہ انداز میں اسے سمجھانے لگا۔ ”اگر

زمانے کی ٹھوکریں ہی سب کچھ سکھا دیتیں تو یہ سکول کالج نہ قائم ہوتے کیونکہ کسی نہ کسی وقت ہر ایک کو یہ مل ہی جاتی ہیں خدا بڑا منصف ہے!“ پھر وہ ناصحانہ لہجے میں بولا۔ ”امی اور نانی اماں سے لڑائی مول لے کر بھی صرف اس لئے میں تمہیں پڑھانے کی کوشش کر رہا ہو کہ کچھ بھی ہو علم بہرحال اچھی چیز ہے۔ اور وقت پڑنے پر یہ بہت کام آتا ہے کیا پتہ تمہیں کب اس کی ضرورت پڑ جائے۔ زندگی میں بہت سارے مرحلے آتے ہیں۔ چلو آؤ شاباش! آج تھوڑا سا ہی سبق لے لو۔“

اور اسے نہ پھپھو کی جھڑکیاں یاد رہیں نہ غزالہ کی وہ طنزیہ نگاہوں کے دل کو چھید جانے والے تیر! اس کے کانوں میں تو صرف سہیل کے پیار بھرے ناصحانہ فقرے گونج رہے تھے۔ ”کیا پتہ تمہیں کب اس کی ضرورت پڑ جائے زندگی میں بہت سارے مرحلے آتے ہیں۔“ اور آنکھوں کے سامنے اس کا پرخلوص اور مشفق وجود تھا۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہو گئی اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کتاب کھول کر سامنے رکھ لی۔ سہیل کے چہرے پر تبسم رقص کناں تھا۔

”کریمن! او میری اچھی اچھی کریمن جی کیا کر رہی ہو؟“

سہیل بڑی عاجزی اور انکساری سے پکارتا ہوا باورچی خانے کی جانب جا رہا تھا۔ اسے جب بھی کوئی بے وقت کام کرانا ہوتا تو وہ یونہی بڑے پیار اور بڑی ملائمت سے کریمن سے مخاطب ہوا کرتا تھا۔

اس کے اس لہجے سے وہ اچھی طرح واقف تھی کہ کب یہ استعمال ہوتا تھا۔ سہیل منہ پھٹ ہونے کے باوجود گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ کریمن بھی اسے سگے بھائی کی طرح چاہتی تھی اور اسی طرح اس کے لاڈ دیکھا کرتی تھی۔ وہ جو بات منہ سے نکالتا' سب کام چھوڑ چھاڑ کر پہلے اس کی فرمائش پورا کرنے کی کوشش کیا کرتی۔

”او کریمن جی! یہ آج چپ کیوں سادھے ہو ذرا ایک...... ارے!“ اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ ”تو آج ہماری صبا کریمن کا رول ادا کر رہی ہے کیوں وہ کہاں گئی۔“

”اس کے خاوند کو آج بڑا تیز بخار ہے۔“

''ارے یہ اتنی ساری چیزیں؟'' وہ وہیں بیٹھتے ہوئے ایک ایک دیگچی کا ڈھکنا کھول کھول کر دیکھنے لگا۔ ''بات کیا ہے آخر؟'' وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''پھپھو کی کوئی ملنے والی آ رہی ہیں۔'' صبا اس کے ندیدہ پن پر زیرلب مسکرائی۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' سہیل اس کی مسکراہٹ بھانپ گیا۔

''اچھی اچھی کھانے کی چیزیں دیکھ کر کون انسان ہے جس کے منہ میں پانی نہیں بھر آتا۔ قسم کھاؤ تمہارے منہ میں پانی نہیں آ رہا۔''

''نہیں تو۔''

صبا بے ساختہ ہنس دی۔

''اب خواہ مخواہ ہی ہنسنے کی کوشش تو نہ کرو۔''

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔'' اسے بے اختیار ہنسی آئے جا رہی تھی اور وہ دزدیدہ نگاہوں سے سہیل کو دوسری بار پھر ساری دیگچیوں کے ڈھکنے اٹھا اٹھا کر ان میں جھانکتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ''ویسے ہی بعض انسان سیر چشم ہوتے ہیں۔'' اس نے دبی زبان سے یہ کہتے ہوئے پھر آنکھوں کے گوشوں سے سہیل کے چہرے کی جانب دیکھا۔

''ہوں! تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں کمینہ ہوں۔''

وہ اب زور زور سے سانس لے کر ان پکوانوں کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔

''توبہ توبہ استغفراللہ! میں بھلا کبھی ایسا کہہ سکتی ہوں۔ آپ تو اتنے اچھے ہیں۔ اتنے اچھے کہ......''

''تو پھر مجھے سب کچھ تھوڑا تھوڑا چکھاؤ۔''

''وہ تو چکھا دیتی ہوں لیکن یہ بتایئے آپ اتنی میٹھی اور پیار بھری آواز میں کریمن کو کیوں یاد کر رہے تھے۔''

''ارے!'' سہیل چونکا اور پھر ایک دم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں تو چائے بنانے کے لئے کہنے آیا تھا۔''

''چائے۔ اس وقت۔ ابھی تو تھوڑی دیر پہلے آپ پی چکے ہیں۔''

''ہاں میں تو پی چکا ہوں۔''

''پھر؟''

''عدنان آیا ہے نا۔ اس کے لئے بنانا تھی۔''

''عدنان کون؟''

''میرا ایک بڑا پیارا دوست ہے۔ بہت ہی پیارا۔ اور وہ کچھ دن میرے پاس رہے گا بھی۔'' سہیل کے چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹیں پھیل گئیں۔ ''تم ذرا جلدی سے اچھی سی چائے بنا کر میرے کمرے میں بھیج دو اور اگر ہو سکے تو ساتھ کچھ اور بھی بنا دینا۔ سنا ہے تم سموسے اور نمک پارے بہت لذیذ بناتی ہو۔''

''سموسے اور نمک پارے بنانے کا یہ کوئی وقت ہے۔''

''میری اچھی سی صبا! بنا دو نا۔ پہلی بار تو میرا دوست میرے گھر آیا ہے۔ تمہیں کیا پتہ میرا کیا کچھ کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''کیا جی چاہ رہا ہے؟''

''یہی کہ تری یہ ساری دیگچیاں لے جا کر اس کے سامنے رکھ دوں۔'' وہ بڑے مسرور انداز میں ہنسنے لگا۔

''جی ہاں رکھ دیجئے۔ کر لیجئے اپنی خوشی پوری۔ بعد میں میرا جو حال ہو گا وہ میری قسمت!''

''تیری قسمت بڑی اچھی ہو گی صبا! بڑی اچھی۔ انشاء اللہ بہت ہی اچھی۔'' اور وہ بڑی دھیمی آواز میں بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔

یوں تو وہ گھر کے ہر فرد کا کام وقت بے وقت بلا چون و چراں کر دیا کرتی تھی مگر سہیل کا کہا نزع کے عالم میں بھی ہو تو رد کرنا وہ گویا گناہ سمجھتی تھی۔ وہ جب اس کا ہر ہر بات میں اتنا خیال رکھتا تھا تو صبا اس کی طرف سے لاپروائی برت سکتی تھی۔ چولھے پر چائے کا پانی کھولنے کے لئے رکھ کر وہ جلد جلد میدہ گوندھنے لگی تا کہ سہیل کی فرمائش کے مطابق سموسے اور نمک پارے بھی بنا لے۔

''صبا!'' وہ سر جھکائے بڑی عجلت سے اپنے کام میں مصروف تھی کہ پھپھو کی آواز سن کر اس نے چونکتے ہوئے سر اُٹھایا۔ ''کیا سب کچھ تیار ہو گیا؟''

''جی ہاں تقریباً سب کچھ ہی ہو گیا ہے باقی یہ پڈنگ رہ گئی ہے۔''

''تو یہ بھی بنا لو نا۔'' وہ جلد جلد دیگچیوں کے ڈھکنے کھول کھول کر معائنہ کرنے لگیں۔ ''اور یہ کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے سینی میں رکھے ہوئے میدے کے چھوٹے چھوٹے پیڑوں کو حیرت سے دیکھا۔

''یہ یہ۔'' وہ کچھ گھبراتے ہوئے بوکھلا کر بولی۔ ''بھائی جان کا کوئی دوست آیا ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا ہے چائے کے ساتھ سموسے وغیرہ بنا دوں۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً پھپھو کچھ بگڑتیں، بہت کچھ کہتیں مگر اس وقت وہ بہت جلدی میں تھیں دوسرے مہمانوں کی آمد کی خوشی نے ان کے مزاج کی سختی کو وقتی طور پر نرمی میں بدل دیا تھا۔ انہوں نے صبا کی سنی ان سنی کرتے ہوئے جلد جلد ایک دو چیزیں چکھیں اور منہ چلاتی ہوئیں مزید ہدایات دے کر باہر نکل گئیں صبا پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئی اور اس کا ذہن خیالات کی بھول بھلیوں میں چکر کاٹنے لگا۔

جب سے غزالہ والا واقعہ پیش آیا تھا۔ صبا کو گھر کی پالیسی کچھ بدلی بدلی نظر آ رہی تھی اس وقت تو سب نے مل جل کر سارا الزام اس پر دھر دیا تھا مگر اس کے بعد صبا نے محسوس کیا پھپھو چپکے ہی چپکے غزالہ پر بہت کڑی نظر رکھنے لگی تھیں۔ اب وہ بہت کم اسے نگاہوں سے اوجھل ہونے دیتیں۔ پہلے وہ دوپہر کو تنہا اپنے کمرے میں آرام کیا کرتی تھیں مگر اب پھپھو اسے اپنے پاس ہی سلانے لگی تھیں۔ وہ اگر کسی ضرورت کے لئے کوٹھے پر جاتی تو پھپھو دبے پاؤں اس کے پیچھے چل دیتیں۔

پھپھو کی ان احتیاطوں کی وجہ سے غزالہ کے مزاج پر ہر وقت چڑچڑا پن سوار رہتا۔ کبھی کبھی تو اس پر جنونی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ پھر وہ ماں کا لحاظ کرتی نہ نانی کا۔ بغیر کسی بات کے ہی زبان کو بے لگام کر دیتی۔ اس وقت پھپھو اسے تنہا چھوڑ دیتیں اور اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر کے ماں بیٹی کتنی کتنی دیر کانوں میں کھسر پھسر کرتی رہتیں

اور پھر ہر دوسرے تیسرے دن ان کے ہاں مہمان خواتین آنے لگیں۔ وہ ہمیشہ اس بڑی بی کے ساتھ ہی آتیں جسے اس نے ہوش سنبھالتے ہی اکثر اپنے ہاں آتے دیکھا تھا۔ جونہی مہمان خواتین گھر میں قدم رکھتیں۔ صبا کے لئے ڈرائینگ روم اور کھانے والے کمرے کی حدود میں کرفیو نافذ ہو جاتا۔ اسے بڑی سختی سے حکم دے دیا جاتا کہ یا وہ باورچی خانے میں رہے اور یا پھر اپنے کوٹھری نما چھوٹے سے کمرے میں جہاں سہیل اور غزالہ کے کمروں کی طرح نہ خوبصورت پلنگ بچھا تھا اور نہ گدے دار نرم نرم کرسیاں اور نہ مچھروں کے بچاؤ کے لئے مچھر دانیاں اور نہ شیشے والی میزیں، ریڈیو اور کپڑوں سے بھری ہوئی لمبی لمبی الماریاں۔

پھر غزالہ کو اس دن بہت خوبصورت سے کپڑے پہنائے جاتے۔ آنے والے مہمانوں کے مزاج کے مطابق کبھی بھاری بھاری زیورات سے اسے سجایا جاتا اور کبھی بالکل سادے اور چست لباس میں گویا کالج گرل بنا کر بٹھا دیا جاتا۔

اور پھر جب مہمان آ کر چلے جاتے تو دوسرے دن صبح ہی صبح بڑی بی جوتیاں گھسیٹتی، پان چباتی، جیسے کوئی بکری جگالی کر رہی ہو، اور چہرے پر عجیب سی طنزیہ اور معنی خیز مسکراہٹ اور کبھی ماتھے پر غصے کی تیوریاں لئے آتی اور کتنی ہی دیر دادی اور پھپھو سے سفید بالوں والا سر ہلا ہلا کر سرگوشیاں کرتی رہتی۔

جس دن سے یہ مہمان داریاں شروع ہوئی تھیں غزالہ کا وہ جنونی پن رخصت ہو گیا تھا۔ اب وہ نانی اور ماں سے اکثر خوش گپیوں میں مصروف نظر آتی مگر صبا سے اس کی دشمنی بدستور تھی۔ وہ غزالہ کو ایک آنکھ نہ بھاتی۔ جونہی وہ دکھائی دے جاتی اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔

''ارے! ابھی تک چائے نہیں بنی۔''

وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ سہیل باورچی خانے کے دروازے میں کھڑا اس کی مصروفیت اور محویت کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''بن گئی بس صرف ذرا دودھ گرم کرنا تھا۔''

''تو پھر جلدی کرو نا اس بے چارے کی آنتیں بھوک سے قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں۔''

"اچھی بات' آپ چلیں۔ بس آپ کے پیچھے پیچھے ہی چائے بھی آتی ہے۔" وہ جلد جلد سینی میں گرم گرم سموسوں کی پلیٹ رکھنے کے بعد دوسرے برتن بڑی صفائی سے ٹکانے لگی۔

اور پھر سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد اس نے سر اٹھایا تو سہیل جا چکا تھا۔

"ارے! وہ تو چلے گئے اور چائے کون لے کر جائے۔ کریمن بھی نہیں ہے۔" وہ اپنے آپ ہی سے بڑبڑائی۔ "اب کیا کروں؟" سینی آگے رکھے وہ سوچنے لگی۔

چند لمحے اسی سوچ میں گزر گئے چائے ٹھنڈی ہو رہی تھی اور دوسری طرف مہمان کا بھی خیال تھا جسے بہت بھوک لگی ہوئی تھی۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" کچھ سوچ کر اس نے جلدی سے چائے کے برتنوں والی سینی خود ہی اٹھائی اور سہیل کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ جلد از جلد اس کام سے فارغ ہونا چاہتی تھی کیونکہ اسے ابھی پڈنگ بھی بنانا تھی۔ دیر ہو جانے پر پھپھو کی جھڑکیوں کا خوف بھی تھا۔

وہ جلد جلد قدم اٹھاتی سہیل کے کمرے تک پہنچ گئی۔ دروازے میں سبز بھاری پردہ پڑا ہوا تھا اس لئے اندر کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی البتہ باتوں کی پرجوش آواز سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔ صبا نے دروازے کو انگلیوں سے بجایا۔

"کون ہے آ جاؤ۔" اندر سے سہیل کی آواز آئی اور دوسرے لمحے وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گیا۔

چونکہ جلدی میں تھی چند لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے پھر اسی طرح دروازے پر دستک دی۔

"ارے بھئی کون ہے کہہ جو رہا ہوں دروازہ کھلا ہے آ جاؤ۔"

"عجیب شخص ہیں!" پریشانی سے بڑبڑائی پھر ذرا بلند آواز میں بولی۔ "بھائی جان! چائے لے لیجئے۔"

"اندر آ کر دے جاؤ۔"

وہ بڑے بے پروائی سے یہ کہہ کر باتوں میں مشغول ہو گیا۔

تذبذب کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ پریشان ہو گئی آج تک پھوپھا ابا اور سہیل کے علاوہ' وہ کبھی کسی مرد کے سامنے نہیں ہوئی تھی پھر کیوں سہیل نے اتنی لاپروائی سے اسے اندر آنے کے لئے کہہ دیا تھا۔ چند لمحے توقف کے بعد اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔

"بھئی صبا! کیوں تنگ کر رہی ہو۔" اب سہیل کی آواز میں ذرا تلخی تھی۔ "کہا جو کہ چلی آؤ مجھ میں اور عدنان میں کوئی فرق نہیں اس سے کوئی پردہ نہیں کرے گا۔ آ جاؤ۔"

اب تو اس نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ صبا کے لئے اس کی تعمیل کئے بنا کوئی چارہ نہ رہا۔ سینی وہیں رکھ کر اس نے دوپٹہ خوب اچھی طرح اوڑھا اور کانپتے ہاتھوں سے اسے اٹھا کر جھجکتے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ سر اتنا جھکا ہوا تھا جیسے ابھی چائے کے برتنوں سے ٹکرا جائے گا اور قدم بری طرح لڑکھڑائے جا رہے تھے۔

"یہیں رکھ دو۔" سہیل نے میز کھسکائی۔

وہ اسی طرح سر جھکائے ہوئے آگے بڑھی اور جلدی سے وہاں سینی رکھتے ہوئے تیزی سے واپس مڑی۔ اسے بالکل ہوش نہ تھا کہ وہ کیا کر رہی تھی۔

وہ لڑکھڑائی چال سے واپس چلی ہی تھی کہ سہیل نے پکارا۔ "صبا!"

وہ وہیں ٹھٹک گئی۔

"ادھر آؤ۔"

وہ چپ چاپ اسی جگہ کھڑی رہی۔

"میں کیا کہہ رہا ہوں سن نہیں رہیں؟"

سہیل کی آواز میں ذرا سختی تھی۔ وہ اسی طرح جھکے جھکے سر اور جھکی جھکی لرزتی پلکوں سے اس کے قریب چلی گئی۔

"اتنی بڑی ہو گئی ہو مگر ابھی تک تمہیں سلام کرنا نہیں آیا۔" سہیل نے مسکراتے ہوئے' عدنان کی طرف دیکھ کر بظاہر درشت لہجے میں کہا۔ "سلام کرو جلدی سے ورنہ یہ کیا

کہے گا کہ کیسی بدتمیز لڑکی ہے۔''

''نہیں نہیں۔'' عدنان نے کچھ کہنا چاہا مگر سہیل نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

''تم چپ رہو جی۔ میں ہی نہ اسے تمیز سکھاؤں گا تو پھر کون سکھائے گا۔'' جانے کیوں اس وقت اتنا شریر ہو رہا تھا۔

''تت تت۔تسلیم!'' صبا نے پھنسی پھنسی آواز میں ہکلاتے ہوئے کہا اور پھر تیزی سے پلٹ گئی۔ سہیل کا قہقہہ کمرے کی خاموش فضا میں بکھر گیا اور عدنان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''سنو!'' وہ ابھی دروازے کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ سہیل کی آواز پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے سوچا اب وہ نہیں ٹھہرے گی مگر نجانے کیا ہوا آپ ہی آپ اس کے قدم رک گئے۔

''ہم کھانا تھوڑی دیر بعد کھائیں گے اور ہاں دیکھنا جو کچھ تم نے مہمانوں کے لئے پکا رکھا ہے اس میں سے اگر ایک بھی چیز ہمیں کم ملی تو یاد رکھنا مجھ سے پٹ جاؤ گی۔''
جونہی سہیل کا فقرہ ختم ہوا وہ اسی طرح مشینی انداز میں چلتی پھر دروازے کی سمت بڑھی۔

''سن لیا ہے نا؟'' سہیل کی آواز اس کا پیچھا کر گئی۔

''جی۔'' حلق میں اٹکتی ہوئی سی آواز ابھری اور اب بڑے بڑے تیز تیز قدم اٹھا کر کمرے سے باہر ہو گئی۔ مبادا سہیل کوئی اور بات کر بیٹھے اور وہ تو اس قابل تھی ہی نہیں کہ مزید ایک لمحہ بھی وہاں رک سکتی۔ سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ ہاتھ پاؤں بری طرح لرز رہے تھے اور رنگ فق تھا۔

اس کی اس ہیئت کذائی پر سہیل بے اختیار ہنس دیا۔

''بیوقوف لڑکی!'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا مگر اس کے لہجے میں پیار کا عنصر غالب تھا۔

6

''لیجئے پانی۔''

گلاس میز پر رکھ کر وہ جھکی جھکی نگاہیں لئے واپس ہوئی۔

''سنئے۔'' وہ وہیں رک گئی۔ ''سہیل کہاں ہے؟''

''پھوپھا ابا کے بھائی وفات پا گئے ہیں۔ اس لئے وہ پھپھو اور غزالہ سب پنڈی چلے گئے ہیں پرسوں تک لوٹ آئیں گے۔''

''مجھے بتایا ہی نہیں۔''

''آپ سو رہے تھے۔ سہیل بھائی نے آپ کو بے آرام کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ البتہ جاتے جاتے مجھے کہہ گئے تھے کہ آپ کو بتا دوں۔''

عدنان کو آئے دس بارہ دن ہو گئے تھے اور اتنے دنوں میں وہ کئی بار اس کے سامنے آئی تھی۔ اکثر چائے اور کھانا وغیرہ وہی انہیں دیا کرتی تھی۔ کریمن کے خاوند کی حالت دن بدن بگڑتی جا رہی تھی اور وہ زیادہ تر اس کے پاس ہی رہتی تھی۔ اس لئے گھر کا تقریباً سارا ہی کام آج کل صبا کو کرنا پڑ رہا تھا۔

''اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو چائے کی ایک پیالی اس وقت مل سکتی ہے؟'' عدنان نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی۔

''جی ہاں۔'' اور وہ مزید کچھ کہے کمرے سے باہر نکل گئی۔

عدنان نے اٹھ کر کلی کی اور پانی پی کر گلاس ابھی رکھا ہی تھا کہ صبا چائے لئے آ گئی۔ ''ارے! اتنی جلدی بن بھی گئی؟'' وہ مسرت اور حیرت کی ملی جلی کیفیت میں اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''مجھے معلوم ہے آپ روز اسی وقت پیا کرتے ہیں اس لئے میں نے پہلے ہی بنا لی تھی۔''

"اوہ! شکریہ!!" اس نے ہاتھ بڑھا کر پیالی تھام لی۔

"کوئی اور بھی ضرورت ہو تو مجھے بلا تکلف کہہ دیجئے گا۔" صبا دھیمی آواز میں بولی۔ "ورنہ آپ کو اگر کوئی تکلیف ہوئی تو سہیل بھائی میری گردن مروڑ دیں گے۔"

"کیا؟"

"جی ہاں وہ یہی کہہ کر گئے ہیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

"بہت شریر ہے۔" عدنان مسکرایا "اور آپ کو بہت تنگ کرتا ہے۔"

"جی ہاں۔"

اور وہ کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو درست کرنے لگی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے سہیل کے ستم کا نشانہ بنی تھیں۔ اسے دو دن گھر سے باہر جو گزارنا تھے اس لئے تیاری نہ کرتا؟ اور اس کی تیاری ہمیشہ ایسے ہی ہوا کرتی تھی کمرے کی ہر چیز الٹ پلٹ ہو کر رہ جاتی مگر وہ ساتھ کبھی کچھ نہ لے جاتا دیکھا گیا۔ ہمیشہ خالی ہاتھ ہی جاتا!

"وہ آپ کو اتنا تنگ کرتا ہے آپ کو اس پر غصہ تو اکثر آ ہی جاتا ہوگا۔" عدنان نے چائے کا چھوٹا سا گھونٹ لیتے ہوئے محض بات کرنے کی راہ نکالی۔

"جی نہیں۔" وہ اس کی طرف پشت کئے سہیل کا بستر درست کرتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔ "مجھے ان پر کبھی غصہ نہیں آیا خواہ وہ مجھے قتل بھی کر دیں۔"

"کیوں؟"

"گھر میں سب سے زیادہ تو مجھے پیار کرتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اس کے معصوم اور حسین چہرے پر سہیل کے پیار کے ذکر سے سرخی پھیل رہی تھی عدنان کے چہرے پر تاریکی کا ایک سایہ سا لہرا گیا مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"کیوں وہ سب سے زیادہ آپ کو پیار کرتا ہے؟" وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"پتہ نہیں۔" قدرے توقف بعد وہ پھر بولی۔ "یا شاید اس لئے کہ میں ان کا ہر کام بلا حیل و حجت کر دیتی ہوں۔"

"بس صرف یہی وجہ ہے؟"

"اور کیا ہو سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں سادگی تھی۔

عدنان نے اطمینان کا سانس لیا جیسے اس کے دل پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ مسکراتے ہوئے اس نے چائے کی پیالی لبوں سے لگالی۔

سب چیزوں کو ان کی جگہ پر ٹھیک طرح رکھنے کے بعد صبا کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ وہ پیالی خالی ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ بار بار کہاں ادھر کے پھیرے لگاتی۔ اسے اور بھی تو بہت سے کام کرنا تھے۔

مگر اتنی دیر ہوگئی ابھی تک عدنان پی ہی نہیں چکا تھا۔

"کیا چائے زیادہ گرم ہے؟" اس کا انتظار بے صبر ہونے لگا۔

"نہیں تو۔" عدنان زیر لب مسکرایا۔ وہ جانتا تھا کہ صبا پیالی خالی ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی لئے وہ دانستہ چائے آہستہ آہستہ پی رہا تھا کہ اسے زیادہ دیر تک وہاں ٹھہرا سکے۔

وہ پھر خواہ مخواہ ہی چیزیں ادھر سے ادھر اٹھا اٹھا کر رکھنے لگی۔ عدنان کو اس پر ترس آ گیا اس نے باقی آدھی پیالی جلدی سے ایک ہی گھونٹ کر کے حلق میں انڈیل لی۔

"یہ لیجئے۔" عدنان نے پیالی صبا کی طرف بڑھائی اس نے پیالی پکڑ کر بغیر کچھ کہے دروازے کی جانب قدم اٹھائے۔

"کیا اس گھر میں میری آمد آپ کو ناخوشگوار محسوس ہوئی ہے؟"

"جی۔ جی نہیں تو۔" وہ پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ "لیکن یہ خیال آپ کو کیوں آیا کیا مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے؟"

عدنان کے پژمردہ سے لب و لہجہ نے اسے کافی پریشان کر دیا تھا۔

"گستاخی تو آپ سے بالکل کوئی نہیں ہوئی البتہ میزبانی کے فرائض آپ پوری طرح ادا نہیں کر رہیں۔"

وہ گھبرا سی گئی نہ جانے سہیل کے دوست کے ساتھ' جو ان کا مہمان بھی تھا' وہ

نادانستگی میں کیا سلوک کر بیٹھی تھی کہ اسے شکایت پیدا ہوئی۔''

''کیوں میں نے کیا کیا؟'' وہ اس کے قریب چلی آئی۔

''میزبانی کے فرائض میں یہ بھی ہے کہ مہمان کو اکیلا مکھیاں مارنے کے لئے نہیں چھوڑ دینا چاہیے۔'' عدنان اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرایا۔

''لیکن لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ سہیل بھائی تو چلے گئے اب کون آپ کے پاس بیٹھے۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے اس مسئلہ پر پریشان ہو رہی تھی۔

''آپ بھی تو یہ فرض ادا کر سکتی ہیں۔''

''اوہ! لیکن میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے آج کل کتنا کام ہوتا ہے۔'' وہ بڑی سادگی سے اپنی بپتا بیان کرنے لگی۔ ''کریمن کا خاوند بڑا سخت بیمار ہے وہ اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی ہے اور کل سے میری دادی اماں کو بہت تیز بخار ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ ان کی دیکھ بھال بھی کرنا ہوتی ہے۔''

''کیا آپ کو ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔'' عدنان نے پوچھا۔

''کبھی کبھی تھوڑی سی مل تو جاتی ہے۔'' عدنان کے لہجے میں کچھ ایسی التجا تھی کہ وہ بالکل انکار نہ کر سکی۔

''تو پھر وہ وقت اپنے اس فرض کو پورا کرنے میں گزار دیں آپ کا مہمان خوش ہو جائے گا۔''

''اچھا! کوشش کروں گی۔'' بری صاف دلی سے اس نے وعدہ کر لیا اور پھر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

عدنان کے چہرے پر مسکراہٹیں پھیل گئیں اور وہ گنگناتا ہوا کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ صبا جا چکی تھی مگر ہر طرف اسے وہی نظر آ رہی تھی۔ جانے کیوں آنکھوں میں اسی کے جلوے سما کر رہ گئے تھے وہ مدھری سوچوں میں گم ہو گیا!

7

''ارے! آج آپ شام کی سیر کے لئے نہیں گئے؟''

صبا نے کمرے کی بجلی جلائی تو اندھیرے میں عدنان کو چپ چاپ لیٹے دیکھ کر حیران سی ہو گئی۔

''کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ متفکر سی ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔'' صبا کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا وہ مسکراتا ہوا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''پھر سیر کرنے کیوں نہیں گئے؟ روز تو آپ سہیل بھائی کے ساتھ اس وقت جایا کرتے تھے۔''

''ایک تو اکیلا تھا اس لئے جانے کا موڈ نہیں بنا اور دوسرے.....'' پھر وہ خاموش ہو گیا۔

''دوسرے کیا؟''

''میں آپ کا انتظار ہی کرتا رہا اور مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔'' وہ نگاہیں جھکاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

''میرا انتظار! کیا مطلب؟''

''آپ نے وعدہ جو کیا تھا کہ جب بھی ایک دومنٹ کی فرصت ملی تو ادھر آئیں گی۔''

''اوہ!'' وہ ٹھٹک کر رہ گئی اور پھر دھیرے سے بڑبڑائی۔ اتنی معمولی سی بات کے لئے آپ نے اتنی حسین شام برباد کر دی۔''

''آپ معمولی سی کہہ رہی ہیں۔ لیکن میرے لئے تو بہت بڑی ہے۔''

صبا پریشان سی ہو گئی یہ عدنان کیسی باتیں کر رہا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔

''کیا آپ نے میری کسی بات کا برا منا لیا؟'' اسے چپ دیکھ کر عدنان اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''نہیں تو لیکن آپ بڑی عجیب سی باتیں کرتے ہیں جو مجھ جیسی جاہل لڑکی کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔''

''آپ بہت بھولی ہیں بہت ہی زیادہ!''

عدنان نے اس کی بڑی بڑی حیران آنکھوں میں گہری نگاہوں سے جھانکا۔

ان نگاہوں کی تپش سے گھبراتے ہوئے صبا نے پلکیں جھکا لیں اور جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''میں یہ پوچھنے آئی تھی کہ کیا آپ رات کا کھانا معمول کے مطابق دس بجے ہی کھائیں گے؟'' وہ گھبرائی گھبرائی سی آواز میں جلد جلد بولی۔

''جب بھی آپ کھلا دیں۔'' عدنان پرے ہٹ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہ کیوں اس کا مدعا سمجھ نہیں رہی تھی وہ' جسے وہ اتنے دنوں کی ملاقات سے ہی دل کی دھڑکنوں میں بسا ہوا پا رہا تھا۔ کتنی حسین تھی وہ مگر کتنی معصوم!! آخر وہ کس طرح اسے اپنے جذبات سے آگاہ کرے کہ اس کا دل اسے اپنا بنا لینے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس نے سوچوں میں کھوئے کھوئے پلٹ کر صبا سے کچھ کہنا چاہا۔ مگر کمرے میں کہیں بھی اس کا حسین وجود موجود نہ تھا نجانے وہ کب کی جا چکی تھی۔

عدنان کی نگاہیں مایوسی سے جھک گئیں اور وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا پھر آ کر پلنگ پر لیٹ گیا بظاہر اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ صبا کو اپنی تمام تر معصومیتوں کے ساتھ اپنے سامنے جلوہ فگن دیکھ رہا تھا۔

''کھانا کھا لیجئے۔'' اس نے سینی میز پر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کئے لیٹے عدنان کو پکارا۔ قدموں کی آہٹ وہ پہلے ہی سن چکا تھا مگر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی اور اب خلاف توقع صبا کی آواز کان میں پڑی تو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

''آپ!''

''کیوں اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟'' عدنان کی نگاہوں کی زد سے دور رہنے کے لئے وہ رخ پھیر کر بلا ضرورت ہی کھڑکی کا پردہ درست کرنے لگی۔

''کیا آپ کو فرصت مل گئی؟ اب بھی کریمن ہی کو بھیج دیا ہوتا۔'' اس کے لہجے میں ہزاروں شکوے تھے۔

''میں نے آپ کو کل ہی بتایا تھا کہ دادی اماں کو بخار ہے۔ یہاں سے گئی تو انہوں نے پھر پاس سے اٹھنے ہی نہیں دیا۔'' صبا صریحاً جھوٹ بول گئی۔ اب وہ اسے کیسے بتاتی کہ اس کے پاس آتے اسے خوف محسوس ہوتا تھا۔ وہ بڑی عجیب عجیب نگاہوں سے جو اسے دیکھتا تھا۔ ورنہ دادی اماں تو اب کافی بہتر تھیں۔ اور کریمن کے خاوند کی حالت درست نہ ہونے کے باوجود صبا نے اس کے ہاتھ ہی عدنان کے لئے رات کا کھانا اور صبح کا ناشتہ بھیجا تھا۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔'' عدنان پورے وثوق سے بولا اور پھر اٹھ کر اس کے قریب کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ آپ صرف میری باتوں کی وجہ سے نہیں آئیں۔'' پھر اس نے بڑی آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''کیا میں آپ کو بہت برا لگتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔'' غیر ارادی طور پر صبا کے منہ سے نکل گیا۔

''پھر تم غائب کیوں رہیں۔'' صبا کے اس جواب نے عدنان کو بے تکلف کر دیا۔

''کہا جو کہ فرصت......''

''بس!'' عدنان نے بڑی یگانگت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ''بار بار جھوٹ مت بولو۔''

صبا اس کا ہاتھ پرے ہٹاتے ہوئے خود بھی ذرا پیچھے ہٹ گئی۔

''تمہیں معلوم ہے نا کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔'' اب عدنان نے اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اس کے نازک کندھوں پر رکھ دیئے۔

''اگر نہیں معلوم تو اب تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ تم مجھے پہلے دن سے ہی اتنی

اچھی لگی ہو۔ اتنی اچھی کہ میرا جی چاہنے لگا ہے تمہارا دل بھی میرے لئے ایسے ہی جذبات سے معمور ہو جائے۔''

اس کے کھلم کھلا اظہار محبت نے صبا کو بری طرح سراسیمہ کر دیا۔ گھبرا کر اس نے اپنے کندھے چھڑانا چاہے مگر عدنان نے ہاتھوں کی گرفت اور سخت کر دی۔

''پہلے میری بات کا جواب دو پھر چھوڑوں گا۔''

''کیا؟''

''کہ میرے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟'' عدنان نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں غور سے دیکھا۔

''آپ۔ آپ۔'' وہ عدنان کے سانولے اور گوارا سے نقوش والے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔ اس چہرے پر اسے اپنے لئے پیار کی دنیا آباد نظر آئی اور اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر موجزن دکھائی دیا۔

یہ پیار کی دنیا' یہ محبت کا جہان' سب کچھ اسی کے لئے تھا۔ اس کے لئے جو زندگی بھر پیار کی ایک نگاہ کو ترستی رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ بے سوچے سمجھے' آنکھیں بند کئے اس دنیا میں بڑھ چلے۔ اس کا سر جھک گیا اور ابھی وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ایک دم اس کی نگاہوں میں غزالہ والا واقعہ گھوم گیا کہیں اس سے بھی ایسی ہی توقع نہ کی جائے۔ اس سے جس کی پیشانی پر پہلے ہی ماں کا گناہ جگمگا رہا تھا اور جس کے داغ کو دھونے کے لئے اس نے اپنی پاکیزگی قائم رکھنے کا عہد کیا تھا۔

کچھ بھی ہو وہ اپنے عہد پر قائم رہے گی اور یہ بات یہیں ختم کر دے گی۔ بے شک عدنان اسے بہت اچھا لگ رہا تھا مگر مگر!

''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں چھوڑیئے مجھے۔ دادی اماں میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' اس کے لہجے میں سختی آ گئی۔

''جب تک میری بات کا جواب نہ دو گی جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔'' اس کی سختی کا عدنان پر کوئی اثر نہ ہوا وہ اسی ملائمت سے بولا۔

''اس بات کا جواب آپ دادی اماں سے طلب کیجئے۔''

''کیا مطلب؟'' عدنان نے حیرت سے صبا کو گھورا۔

''آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے عدنان صاحب!'' نہ چاہنے کے باوجود اس نے اسی سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کے دل میں اتنی خواہش ہے تو دادی اماں سے بات کیجئے۔''

''پاگل لڑکی!'' عدنان مسکرا دیا۔ ''اصلی بات تو انہیں سے کی جائے گی۔ میں تو صرف اپنے متعلق تمہارا عندیہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔''

''میری رائے بھی وہی ہو گی جو دادی اماں کی۔''

''تمہاری اپنی پسند ناپسند کچھ نہیں ہے۔''

''ہے تو مگر ایسے معاملات میں' جن پر پوری زندگی کا دارومدار ہو' میں اپنے جیسی ناسمجھ لڑکیوں کی دخل اندازی کو مناسب نہیں سمجھتی والدین اولاد کے لئے ہمیشہ بہتر سوچتے ہیں۔''

''چشم بددور! خیالات تو تمہارے بہت اچھے ہیں۔'' عدنان نے ستائشی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''بہت ہی قابل تعریف! مگر مجھے اتنا تو اندازہ ہونا چاہیے کہ میری زندگی بھر کی رفاقت کو تم خوشی سے قبول کر لو گی۔''

سوائے 'ہاں' کے صبا کے پاس اس کا اور کوئی جواب نہ تھا مگر فطری طور پر شرم و حیا کی وجہ سے اس کی نگاہیں جھک گئیں۔ اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

''بتاؤ پھر کیا میں اپنی امی کو یہاں لے آؤں؟'' اس نے صبا کے جھکے ہوئے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اونچا کیا۔ صبا کے چہرے پر پھیلی سرخی نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا تھا عدنان بڑے والہانہ انداز میں اس کے حسین چہرے کو دیکھنے لگا۔

ان پیار برساتی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے' صبا کی لمبی لمبی پلکیں حیا سے سرخ رخساروں پر جھک گئیں۔ مگر زبان پر خاموشی کے قفل لگے رہے۔ عدنان کو یہ خاموش زبانی ہزاروں داستانیں سنا گئی۔

''شکریہ!'' وہ یگانگت سے بولا۔

اور دوسرے ہی لمحے صبا ایک زقند میں کمرے سے باہر تھی۔ اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا اور دل کچھ عجیب سے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ وہ بھاگی بھاگی سیدھی اپنے کمرے میں پہنچی اور دھڑام سے چار پائی پر گر گئی۔

یہ ایک دم کیا ہو گیا؟ وہ خوشی بھری حیرت سے سوچ رہی تھی آج تک کبھی اس انداز میں اس کا دل نہ دھڑکا تھا۔ کبھی اس کے رخسار یوں تپ نہیں اٹھے تھے۔ اور کبھی بھی اس کے جذبات نے یوں نیا پن محسوس نہیں کیا تھا۔

یہ کیسا انقلاب تھا کہ سانولا سا عدنان ایک دم سے اتنا اچھا لگنے لگا تھا۔ ساری دنیا سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگا تھا۔ سب سے زیادہ قابل اعتماد جو دکھائی دے رہا تھا اور ہر ایک سے زیادہ قریب محسوس ہونے لگا تھا یہ کیسا طوفان تھا؟

اس کی خزاں زدہ زندگی میں اچانک ہی کیسی بہار آ گئی تھی کہ ماضی میں اس پر گزرا ہوا ہر غم' ہر دکھ گویا ایک دم ہی بھول کر رہ گیا تھا۔ دل میں نئی نئی امنگیں جنم لینے لگی تھیں اور نئی نئی خواہشیں ابھر رہی تھیں۔ ہر جذبہ نئے سانچے میں ڈھل گیا تھا۔ وہ چار پائی پر اوندھی لیٹی اپنے تپتے ہوئے رخساروں کو تکیے پر رگڑ رہی تھی اور اپنے آپ ہی مسکرائے جا رہی تھی۔

''شکریہ! میرے عدنان!! کہ تم نے میرے تاریک دامن میں چاند ستارے بھر دیئے میں زندگی بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی اور پھر اس نے آنے والی خوشیوں کی جگمگاہٹ سے چمکتی ہوئی آنکھیں بند کر کے سر تکیے پر ٹیک دیا اور سہانے اور میٹھے میٹھے خیالات کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو گئی، جہاں عدنان اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ساتھ تھا۔

8

''امی! عدنان کا خط آیا ہے۔''

''ہوں۔'' بلقیس نے کوئی توجہ نہ دی۔ اپنے کام میں لگی رہیں۔

''وہ اور اس کی والدہ آج سہ پہر کو یہاں پہنچ رہی ہیں۔''

''کیا؟'' وہ چونکیں۔ ''ابھی تین دن پہلے تو وہ یہاں سے گیا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''میرا مطلب ہے اتنی جلدی دوبارہ آنے کی وجہ کیا کوئی کام ہے؟'

''اس کا مجھے علم نہیں شاید کوئی کام ہی ہو۔''

سہیل ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا اور صبا پاس بیٹھی دادی اماں کے سر میں تیل لگا رہی تھی۔

''لیکن اس کی ماں کیوں آ رہی ہے اس کی تو ہم سے کوئی جان پہچان نہیں۔''

''پھر کیا ہوا اگر فی الحال ان سے آپ کی جان پہچان نہیں۔'' وہ بڑے شریر انداز میں مسکرایا۔ ''عورتوں میں تو یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ بالکل اجنبی ایک جگہ اکٹھا ہو جائیں تو صرف چند ہی منٹ بعد وہ ایک دوسرے کے شجرہ نسب تک سے واقف ہوتی ہیں۔''

''چل ہٹ!'' بلقیس نے بڑے دلار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ ''تو بس ہر وقت عورتوں کو ہی ہدف بنائے رکھا کر۔''

''توبہ توبہ!!'' زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''بھلا میں خواتین کو کبھی برا کہہ سکتا ہوں جبکہ میری پیاری پیاری امی بھی ایک عورت ہیں اور پھر'' دزدیدہ نگاہوں سے صبا کی طرف دیکھتے ہوئے وہ ہنسا۔ ''یہ چڑیل بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔''

صبا کے ذکر سے بلقیس کی تیوری چڑھ گئی۔ اس سہیل کو جانے کیا خدا کی مار تھی کہ

وہ ہر بات میں اس کا ذکر لے آتا تھا اس کا' جس سے انہیں للہی بغض تھا۔ ناگواری سے چہرہ سکیڑ کر وہ خاموش ہوگئیں۔

سہیل ان کے چہرے کے یہ تاثرات دیکھ کر زیرلب مسکراتے ہوئے بلند آواز میں کچھ گنگنانے لگا۔ وہ بڑی دیر سے ماں کے گھٹنے پر سر رکھے لیٹا تھا اور ایک لمحہ پہلے تک وہ انتہائی خوشی سے اس بیٹے کا یہ بوجھ سہارے بیٹھی تھیں مگر اب ایک دم سے ہی انہیں اپنے گھٹنے میں تھکن کا احساس ہونے لگا۔

''ہٹاؤ سر میری ٹانگیں شل ہو رہی ہیں۔'' ان کی نگاہوں اور لہجے میں بیٹے کی شکایت تھی۔ مگر سہیل نے نہ سر اٹھایا اور نہ اپنی ہنستی مسکراتی آنکھوں سے ماں کو دیکھ دیکھ کر گنگنانا بند کیا۔ ان کا پارہ آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔

صبا اب بہت کچھ سمجھنے لگی تھی اسے معلوم تھا ایسے وقت' جبکہ سہیل جان بوجھ کر اس کا ذکر کر کر کے ماں کو چڑایا کرتا تھا تو بلقیس کا سارا غصہ بغیر کسی گناہ کے صبا پر ہی اترتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی اونگھتی ہوئی دادی اماں کے بالوں میں کنگھی کی اور اس سے بیشتر کہ پھپھو کا عتاب اس پر نازل ہو' ہاتھ دھونے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئی۔

ویسے بھی پھپھو اور سہیل کی گفتگو نے اس کے روئیں روئیں میں کچھ ایسی مسرتیں بھر دی تھیں کہ اب وہ تھوڑی دیر کے لئے تنہا ہونا چاہتی تھی۔ تاکہ اپنے ان مدھ بھرے تصورات سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکے۔ اس کی زندگی کی تاریک شام میں یوں اچانک ہی صبح کے اجالے پھیل جائیں گے یہ تو وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔ چہرے پر مسکراہٹوں کی یلغار اور دل میں خوشگوار سی دھڑکنیں لئے وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ عدنان کی امی کے آنے کی وجہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔ مگر وہ سمجھ چکی تھی کہ اس سے کئے ہوئے وعدے پر عدنان پورا اترا تھا اور اسی لئے اپنی امی کو لے کر آ رہا تھا۔ کتنا اچھا تھا اس کا عدنان!

وہ مسرتوں سے ہمکنار ہوتے ہوئے اپنے کپڑوں کا چھوٹا سا بکس کھول کر بیٹھ گئی۔ اور گنگناتے ہوئے آج کے دن کے لئے کوئی سب سے اچھا لباس تلاش کرنے لگی۔

مگر اس پر تو بدنصیبی نے سایہ کیا ہوا تھا اس کے مسکراتے چہرے پر ایک دم اداسی پھیل گئی کوئی بھی تو ڈھنگ کا کپڑا اس کے پاس نہیں تھا۔ کوئی پھٹا ہوا تو کسی کا رنگ پھٹکا ہوا۔ کوئی شلوار کسی قمیض کے ساتھ نہیں مل رہی تھی۔ دوپٹے تھے تو وہ الگ خراب اور خستہ حالت میں اسے اپنی تہی دامانی پر رونا آ گیا۔

''صبا! او صبا!! کیا کر رہی ہو؟''

اس نے گھٹنوں میں سے سر نکالا۔ سہیل حیران نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

ارے! کیا ہوا تمہیں؟''

''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔'' اور وہ جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھنے کے بعد بڑی کوشش سے مسکرائی۔ ''میں۔ میں میرے کپڑے میلے ہو رہے تھے۔ سوچا گھر میں مہمان آنے والے ہیں' بدل لوں۔''

سہیل اس کے بالکل سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔ ''کپڑے تو ضرور بدلو مگر میں پوچھ رہا ہوں یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے صبا کی خوبصورت بھیگی بھیگی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ۔ یہ۔''

''ہاں یہ کیا ہو رہا تھا؟''

''کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔'' بے اختیار ہوتے ہوئے اس نے پھر گھٹنوں میں سر دے لیا۔

''اوئے پگلی! بتا بھی نا کچھ۔'' سہیل نے قریب ہو کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ''کیا مجھ سے بھی چھپائے گی بتا کیا ہوا؟''

وہ پھر بھی کچھ نہ بولی۔

''امی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں۔'' ساتھ ہی اس کی آنکھیں پھر بہنے لگیں۔

''غزالہ نے کہا ہے کچھ۔'' صبا کے آنسو اس کے دل پر اثر کر رہے تھے۔

''نہیں۔'' اس کی آنکھیں بدستور موتیوں کی لڑیاں پروئے جا رہی تھیں۔

''تو پھر یقیناً نانی اماں نے کچھ کہا ہوگا ٹھہر جا میں ابھی جا کر ان سے پوچھتا ہوں کہ کیوں میری صبا کو ہر وقت رلاتی رہتی ہیں۔'' وہ غصے میں بھرا چہرہ لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''نہیں نہیں۔'' صبا نے جلدی سے سہیل کے گھٹنوں کو تھام لیا۔

''انہوں نے بھی کچھ نہیں کہا۔''

''لیکن پھر تمہاری آنکھوں میں یہ آنسو کیوں ہیں؟'' وہ پریشان ہوتا ہوا پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''میرے پاس پہننے کے لئے کوئی اچھے کپڑے نہیں ہیں اور آج مہمان آنے والے ہیں۔''

''ارے! بس اتنی سی بات!!'' سہیل قہقہہ لگا اٹھا۔ ''میں سمجھا پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے۔''

''ہاں! یہ بھلا کوئی بات ہی نہیں۔''

''پاگل ہے تو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل تھوڑا نہیں کیا کرتے۔'' وہ اسے بزرگوں کے سے انداز میں سمجھانے لگا۔ ''اس وقت تو جیسے بھی ہیں پہن لو کل ہی انشاء اللہ تمہیں بڑے اچھے کپڑے لا دوں گا۔''

''لیکن مہمان تو آج آنے والے ہیں۔'' وہ پھر پورے جوش و خروش سے آنسو بہانے لگی۔

''اری پگلی! چپ کر اور میری بات سن۔''

''کیا!''

''پہلے یہ آنسو پونچھو پھر تمہیں ایک بڑی اعلیٰ تدبیر بتاؤں گا۔''

صبا نے جلدی جلدی آنسو پونچھ لئے۔ ''بتایئے۔''

''اس وقت تو اتنی جلد نئے کپڑے بن نہیں سکتے لہٰذا بہتر صورت یہی ہے کہ فی الحال تم انہیں میں سے کوئی نکال کر پہن لو۔''

''اوں اوں!!'' وہ پھر رونے لگی نجانے آج اسے کیا ہوگیا تھا جو یوں ضد پر اتر آئی تھی ورنہ آج تک اس نے کبھی کسی بات پر ضد نہیں کی تھی۔

''آپ بھی میرا مذاق اڑانے لگے۔'' وہ پورے خلوص سے روتے ہوئے بولی۔

''پگلی! میں کب تیرا مذاق اڑا رہا ہوں۔''

مگر وہ پھر بھی روتی ہی رہی۔

''اوہ اچھا! ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔'' سہیل بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''کیا؟'' صبا کے چہرے پر رونق آ گئی۔

''وہ جو کل ہی میری پتلون اور قمیض سل کر آئی ہے وہ پہن لو۔''

''ہائے اللہ! آپ بھی سہیل بھائی بس بڑے ہی خراب ہیں۔'' سہیل کی اس خلوص بھری پیش کش پر اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ ''بھلا آپ کے کپڑے میں کیسے پہن سکتی ہوں۔''

''تو پھر خود ہی سوچو نا کہ اس وقت کیا ہوسکتا ہے۔ خواہ مخواہ ہی روئے جا رہی ہو۔''

سچ ہی تو کہہ رہے ہیں اس وقت ہو بھی کیا سکتا ہے۔ وہ سوچنے لگی اور دوپٹے کے پلو سے بھیگے بھیگے رخساروں کو خشک کرنے لگی۔

''دیوانی! تو نے کبھی خود کو اچھی طرح دیکھا بھی ہے۔ تمہاری صورت اچھے اچھے کپڑوں کی محتاج ہی نہیں۔ تم تو اس پھٹے لباس میں بھی خدا کی قدرت کا شاہکار دکھائی دیتی ہو۔''

سہیل نے پہلے کبھی اس سے ایسی بات نہیں کی تھی آج اچانک ہی اس کے منہ سے یہ کلمات نکل گئے۔ اور پھر صبا کو بری طرح جھینپتے ہوئے دیکھ کر وہ خود بھی ٹپٹا گیا۔

''ہائے سہیل بھائی! اب چپ بھی ہو جایئے۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے بدبدائی۔

''لو تو آخر پھر میں تمہیں اور کس طرح بہلاؤں۔'' اس نے سنبھلتے ہوئے بات بنائی اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے!'' باہر جاتے جاتے وہ پھر رک گیا۔ ''میں تو تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ میرا کمرہ بڑا گندا ہو رہا ہے۔ ذرا اس کی تھوڑی سی صفائی کر دو۔''

اس نے چہرے پر سے ہاتھ ہٹا کر سہیل کی جانب نگاہ اٹھائی۔

''گول کمرے اور مہمان خانے کو بھی ایک نظر دیکھ لینا، ہوسکتا ہے عدنان کی امی کچھ دن ٹھہریں۔''

''جی بہت اچھا۔'' اس کے چہرے پر پھر سرخیوں کا اجتماع ہونے لگا۔

سہیل اس کے اطمینان کو دیکھ کر مطمئن ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔

9

''اماں!'' بلقیس ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بڑے رازدارانہ انداز میں بولیں۔

''سنا آپ نے عدنان کی ماں ہمارے ہاں آرہی ہے۔''

''ہوں۔'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیٹی کی جانب دیکھنے لگیں۔ ''مجھے تو ان کی آمد کا کوئی خاص مقصد معلوم ہوتا ہے۔''

ان کا انداز بڑا معنی خیز تھا۔

''کوئی خاص مقصد!'' ماں مجسم سوالیہ نشان بن گئیں۔ ''نجانے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''پچھلے دنوں عدنان جو آیا ہوا تھا کیا پتہ اس نے میری غزالہ کے متعلق ماں سے کوئی بات کی ہو اور وہ اسی سلسلے میں آرہی ہوں۔'' بلقیس نے اپنا خیال پوری تفصیل سے ظاہر کر دیا۔

''ہاں عین ممکن ہے۔'' وہ اپنا تیل سے چپڑا ہوا سر زور زور سے ہلانے لگیں۔

''لیکن بلقیس!'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ ''وہ جو اس دن انجینئر صاحب کے گھر سے عورتیں آئی تھیں ابھی تک ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا پہلے ان کا عندیہ تو معلوم ہو جاتا۔''

''اماں! مجھے تو کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے ورنہ اب تک جواب آچکا ہوتا۔ اتنے دن

تو ہو گئے۔'' بلقیس کی پیشانی پر کئی سلوٹیں سا پڑ گئیں۔ ''اور پھر اب تو مجھے اس بڈھو پھاپھا کٹنی پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔ اسی بہانے سینکڑوں روپے مجھ سے ہتھیا چکی ہے اور کئی ایروں غیروں کی دعوتیں بھی کرا چکی ہے اور سب سے زیادہ وہی بڈھو کھوسٹ کھاتی ہے اور ڈکار مار کر سب کچھ ہضم۔ اور نتیجے میں میری لڑکی میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر چل دیتی ہے۔''

''خود ہی تو تمہیں جلدی پڑی ہوئی ہے پھر وہ کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھا کر روپے بھی بٹورے اور تر مال بھی اڑائے۔ میں تو ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ جب وقت آئے گا خود بخود ہو جائے گا آخر وہ ایسی بھی بڑی تو نہیں ہوگئی۔''

''چلو اماں! پچھلی باتوں پر خاک ڈالو جو ہو چکا سو ہو چکا۔'' پھر بلقیس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''مجھے تو عدنان بہت پسند ہے کیسا دراز قد بانکا سجیلا ہے۔ اور سنا ہے خاندان بھی بہت اونچا ہے۔ اگر اس کی ماں نے کوئی بات کی تو میں ہاں کر دوں گی۔''

''خاندان بھی اونچا ہے اور شکل وصورت بھی اچھی ہے لیکن وہ خود کیا ہے۔ ایسا نہ ہو صرف خاندان اور شکل صورت ہی دیکھ کر نالائق کے پلے باندھ دو۔''

''اوئی اللہ اماں! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں۔ کیا آپ کو پتہ نہیں کہ وہ کیا ہے۔ اپنے سہیل کے ساتھ ہی تو پڑھا لکھا ہے۔''

''اچھا! پھر تو بہت لائق ہوا۔''

''ہاں دونوں سالا بہنوئی ایک جیسے رہتے کے ہی ہوں گے۔'' فخر اور مسرت سے بلقیس کی گردن تن گئی۔

''تم نے تو ابھی سے دونوں کو سالا بہنوئی بنا دیا۔ پہلے لڑکی کے باپ سے تو پوچھ لو۔''

''پوچھا ہوا ہے۔'' بلقیس کے چہرے پر ناگواری سلوٹیں ابھر آئیں۔

''اے بیٹی! کیسی باتیں کرتی ہو مجھے اس کے ساتھ تمہارا ایسا سلوک ذرا اچھا نہیں لگتا آخر وہ تمہارا خاوند ہے۔''

''بھاڑ میں جائے ایسا خاوند! نہ جانے آپ کو اس میں کیا نظر آیا تھا کہ میری زندگی تباہ کر کے رکھ دی۔''

''کیوں کیا ہوا تیری زندگی کو۔ وہ نکھٹو ہے' بدصورت ہے یا اپاہج ہے؟'' انہیں بیٹی پر بے طرح غصہ آ گیا۔ ایک یہی معاملہ تھا جس میں اکثر دونوں ماں بیٹی میں ٹھن جایا کرتی تھی۔

''ہاں ہاں آپ کو تو وہ ہمیشہ فرشتہ ہی نظر آتا ہے بھتیجا جو ہوا۔ سارے عیب تو مجھ میں ہی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو میں پیدا ہوتے ہی مرگئی ہوتی نہ زندہ رہتی نہ یہ زندگی کے دکھ جھیلنے پڑتے۔'' بلقیس واویلا مچا مچا کر زار وقطار رونے لگیں۔

''امی! امی جی!!'' سہیل تیز تیز قدم اٹھاتا صحن میں آیا۔

''عدنان اور اس کی امی آ گئے ہیں۔''

''کیا وہ آ گئے۔'' بلقیس کے آنسو ایک دم ہی کہیں غائب ہو گئے وہ ایک جھٹکے سے اٹھیں ان کے چہرے پر سینکڑوں رنگ بکھر رہے تھے۔

''کہاں ہیں وہ؟'' وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی سمت لپکیں۔

''امی! امی!! سنئے تو کیا ہوا آپ کو۔'' سہیل نے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔ ''یہ آپ جوتی پہنے بغیر ننگے پاؤں کیوں جا رہی ہیں؟''

''اوہ!'' بلقیس خجل سی ہو گئیں۔ ''وہ باہر کھڑی ہوں گی نا اس لئے جلدی میں اس طرف دھیان نہیں گیا۔'' اور وہ پلٹ کر جلد جلد جوتی پہننے لگیں۔

''اب میں اتنا بھی بدتمیز نہیں ہوں کہ انہیں باہر ہی کھڑا رہنے دیتا۔'' وہ ذرا ترشی سے بولا۔ ''میں انہیں بٹھا کر' پھر آپ کو اطلاع دینے آیا ہوں۔''

''غزالہ! او غزالہ!!'' بلقیس' سہیل کی سنی ان سنی کرتے ہوئے زور زور سے غزالہ کو پکارنے لگیں۔

''جی آئی امی۔'' اور چند ہی لمحوں بعد وہ مسکراتے ہوئے' اٹھلاتے ہوئے ان کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔

''آؤ عدنان کی امی آ گئی ہیں۔''

''ارے! یہ کیا؟'' غزالہ کو دیکھ کر سہیل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

گہرے گلابی لباس کے علاوہ اس نے چہرے پر بھی خاص رنگ آمیزی کی ہوئی

تھی۔ ''کیا کسی شادی کی تقریب میں جا رہی ہو؟'' سہیل نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' غزالہ شرماتے ہوئے بولی۔

''لیکن پھر یہ سب کیوں؟'' سہیل کے چہرے پر ناگوار نقوش ابھر آئے۔

''بس یونہی۔ تم کیوں پوچھتے ہو؟'' بلقیس بیٹی کو اس لباس اور ایسی سج دھج میں دیکھ کر نگاہوں ہی نگاہوں میں اس پر نثار ہوتے ہوئے بولیں۔ ''میں نے خود اسے یہ کپڑے پہننے کو کہا تھا۔''

''اور یہ اس نے چہرے کو کیا نگار خانہ بنا رکھا ہے؟'' سہیل نے اس کے سرخی پاؤڈر سے لپے چہرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔

''اپنے ہی کو بنایا ہے نا آپ کو کیا؟'' غزالہ بڑے لاڈ سے بولی۔

''میں ابھی بتاتا ہوں کہ مجھے کیا۔'' سہیل نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے گھسیٹتا ہوا غسل خانے کی طرف لے چلا۔ ''اچھے بھلے چہرے کا ستیاناس کر لیا ہے چلو ابھی منہ دھوؤ۔''

''امی! امی!!'' غزالہ چلاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ گھسٹتی چلی جا رہی تھی۔

''دیکھئے بھائی جان کیا کر رہے ہیں۔''

''سہیل کیا کر رہے ہو؟'' بلقیس' جو اپنے مہمانوں کی پیشوائی کے لئے گول کمرے کی سمت جا رہی تھیں۔ پھر پلٹ پڑیں۔ ''چھوڑ دو اسے۔''

''میں نہیں چھوڑوں گا۔'' پھر سہیل نے اسے غسل خانے کے اندر دھکیل کر باہر سے چٹخنی لگا دی۔ ''جب تک یہ سب کچھ دھوؤ گی نہیں دروازہ نہیں کھلے گا۔''

''بیٹے! یوں ضد نہ کر دروازہ کھول دے۔'' بلقیس نے بڑی نرمی سے کہا۔

''امی! جب اسے معلوم ہے کہ یہ سب مجھے پسند نہیں تو پھر کیوں یہ مجھے جان بوجھ کر چڑاتی ہے۔''

''پاگل!'' بلقیس نے مسکرا کر بیٹے کے شانے کو چھوا اور بڑے دھیمے لہجے میں

سمجھانے لگیں۔ ''تمہیں نہیں چڑاتی۔ مہمان جو گھر میں آئے ہیں اور پھر جوان لڑکیوں پر اکثر ایسے وقت آیا ہی کرتے ہیں۔''

''مگر صبا بھی تو ہے اور اسی کی ہم عمر اسے تو میں نے کبھی......''

''چل شروع کر دے پھر اسی کا ذکر۔'' انہوں نے اس کی بات کاٹ دی اور بڑے غصہ سے بولیں۔ ''اللہ کرے یہ لڑکی تو......''

اور نہ جانے بلقیس کیا کیا کہتیں کہ سہیل نے انہیں دونوں شانوں سے پکڑ کر ان کا رخ گول کمرے کی جانب پھیر دیا۔

''اس پر پھٹکاریں پھر کسی فرصت کے وقت ڈال لیجئے گا۔ ادھر مہمان آئے بیٹھے ہیں اور آپ کو اب تک ان کے پاس موجود ہونا چاہیے تھا۔''

''اوہ!'' بلقیس کا موڈ ایک دم درست ہو گیا اور وہ چہرے پر دبی دبی مسکراہٹیں لئے تیز تیز قدم اٹھاتیں گول کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

10

''آجاؤ غزالہ! اندر آجاؤ۔'' بلقیس نے عدنان کی امی سے باتیں کرتے ہوئے رخ پھیرا تو غزالہ کو چوری چوری اندر جھانکتے ہوئے پا کر جلدی سے پکار اٹھیں۔

''یہ میری بیٹی ہے آپ سے ملنے کا اسے بڑا ارمان تھا۔'' وہ عدنان کی امی سے مخاطب ہوئیں۔

چند لمحے گزر گئے مگر غزالہ اندر نہ آئی اور باہر سے ہی جھانکتی رہی۔ اب عدنان کی امی نے اسے پکارا۔ ''آجاؤ بیٹی! مجھ سے کیا شرمانا میں کوئی غیر تھوڑی ہوں۔''

''بڑی ہی شرمیلی ہے۔'' بلقیس بیٹی کی تعریف کرنے لگیں۔ ''اتنی بڑی ہو گئی لیکن بچوں کی طرح سب سے شرما جاتی ہے۔'' اور ایک بار پھر انہوں نے دروازے کی جانب

دیکھا۔ ''تمہیں بڑا شوق تھا ناکہ تمہاری بھی کوئی خالہ ہوتی یہ دیکھو خدا نے تمہیں کتنی اچھی خالہ گھر بیٹھے ہی دے دی ہے۔'' ان کے لہجے میں خوشامد تھی۔

اور عدنان کی امی بلقیس کے اس اعتماد اور محبت بھرے فقرے سے موم کی طرح پگھل کر رہ گئیں۔ بے اختیار ان کے چہرے پر مسکراہٹیں رقص کر اٹھیں۔ پاؤں کی چاپ پر انہوں نے نگاہ اٹھائی۔ غزالہ ایک جھپاکے سے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''سیدھی ہو کر بیٹھو۔'' بلقیس نے اس کی ان اداؤں پر سے نچھاور ہوتے ہوئے اسے پیار بھری ڈانٹ دی۔ اور وہ جلدی سے سر جھکاتے ہوئے یوں بیٹھ کر ایک ہاتھ کے ناخنوں سے دوسرے ہاتھ کے ناخنوں کو کریدنے لگی جیسے بردکھوئے کو آئی ہو۔

''بیٹی!'' عدنان کی امی شفقت بھری آواز میں بولیں۔ ''میں تو اب تمہاری خالہ بن گئی مجھ سے بھلا کیا شرمانا۔''

''یہ تو پاگل ہے۔'' بلقیس مسکرائیں پھر مڑ کر غزالہ کو کہنے لگیں۔ ''اپنی خالہ کے لئے کوئی چائے پانی کا انتظام کیا؟''

''نہیں نہیں مجھے اس وقت کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' غزالہ کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ بول اٹھیں۔

''واہ بھلا ضرورت کیوں نہیں آپ تو تکلف کرنے لگیں۔'' بلقیس نے بڑی اپنائیت جتائی۔ جا غزالہ خالہ کے لئے شربت بنا لا اور ادھر سہیل کے کمرے میں عدنان بھی ہے اس کے لئے بھی بھیج دیجیو میرے بچے کو پیاس لگی ہو گی۔''

''صبا کو کہیے۔'' غزالہ پر فطری ڈھیٹ پن عود کر آیا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے کندھے اچکاتے ہوئے دھیرے سے منمنائی۔

اس کے اس انداز سے پریشان ہوتے ہوئے بلقیس نے جلدی سے عدنان کی امی کی جانب نگاہ اٹھائی وہ ادھر ہی دیکھ رہی تھیں مگر بلقیس تھیں، جلدی سے سنبھل کر بات بنائی۔ ''کیا خالہ اتنی پسند آ گئیں کہ اب پاس سے اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔''

پھر وہ خود ہی اٹھ پڑیں کہ کہیں عدنان کی امی پر غزالہ کا ڈھیٹ پن ظاہر نہ ہو جائے۔ ''میں ابھی آئی آپ خالہ بھانجی باتیں کریں۔''

''بیٹی! تمہارے مشاغل کیا ہیں۔ آج کل سکولوں کالجوں میں تو گرما کی تعطیلات ہیں۔'' عدنان کی امی نے محض سلسلہ گفتگو جاری کرنے کے لئے کہا۔

''جی ہاں سکولوں میں تو چھٹیاں ہیں۔'' غزالہ بڑے انداز سے مسکرائی۔ ''مگر میں پھر بھی پڑھتی رہتی ہوں۔''

''گھر کا کام وغیرہ بھی تو کرتی ہوگی۔''

''جی نہیں میں نے تو کبھی نہیں کیا۔ میں ابھی صرف پڑھتی ہوں۔ اور ایسے کام کرنے کے لیے کریمن اور صبا جو ہیں۔'' غزالہ کے لہجے میں کچھ حقارت سی تھی مگر عدنان کی امی نے خیال نہ کیا البتہ صبا کا نام سن کر ان کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔

''کریمن تو ملازمہ ہوگی اور صبا شاید تمہارے ماموں کی لڑکی ہے۔''

''جی ہاں۔'' غزالہ نے اس کے ذکر سے ناک بھوں چڑھائی۔ ''بظاہر تو یہی کہا جاتا ہے مگر حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے۔'' وہ بھی تو بلقیس ہی کی بیٹی تھی کیوں صبا پر کیچڑ اُچھالنے سے باز رہتی۔

''کیا مطلب؟'' اس کی بات عدنان کی امی کی سمجھ میں نہ آ سکی۔

اور ابھی غزالہ اپنا مطلب واضح نہ کر پائی تھی کہ بلقیس اندر آ گئیں۔

''ہوں! تو خالہ بھانجی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولیں۔

''کوئی خاص نہیں بس یونہی اِدھر اُدھر کی۔'' عدنان کی امی نے جواب دیا۔

''عدنان کے کتنے بہن بھائی ہیں؟'' بلقیس : ان کے متعلق پوری واقفیت حاصل کرنا چاہی۔

''دو بہنیں اور دو بھائی عدنان سب سے بڑا ہے۔''

''چھوٹے سب پڑھتے ہوں گے۔''

''جی ہاں بڑی لڑکی اس سال دسویں کا امتحان دے رہی ہے۔''

''میری ہی عمر کی ہوگی۔ میں بھی اسی سال دسویں کا امتحان دینے والی ہوں۔'' غزالہ نے گفتگو میں حصہ لینے کے لئے کہا۔ وہ کسی سے کم تھی جو خاموش بیٹھی رہتی۔ عدنان کی امی نے ابھی اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سب کی نگاہیں دروازے پر مرکوز ہوگئیں۔ صبا ایک چھوٹی سی سینی اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

''آداب!'' اس نے سینی درمیانی میز پر رکھتے ہوئے بڑے ادب سے جھک کر کہا۔ صبا کے اس مئودبانہ انداز سے غزالہ دوپٹے میں منہ چھپاتے ہوئے کھی کھی کر کے ہنسنے لگی مگر عدنان کی امی نے اس کی ہنسی کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور بڑے غور سے صبا کے معصوم اور پرکشش چہرے کو دیکھنے لگیں۔

بلقیس کو ان کی نگاہوں کا یہ انداز کافی خطرناک محسوس ہوا۔ انہیں صبا پر غصہ آ گیا۔ جب وہ کہہ کر آئی تھیں کہ کریمن کے ہاتھ شربت بھیجے پھر وہ کیوں خود لئے چلی آئی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ اس نافرمانی پر اس کی اچھی طرح خبر لیتیں مگر اب سوائے صبر کے کوئی اور چارہ نہ تھا وہ اندر ہی اندر غصہ پی کر رہ گئیں۔ کچھ اور نہ سوجھا تو انہوں نے عدنان کی امی ہی کو اپنی طرف متوجہ کر لینا مناسب سمجھا۔

''سنیئے۔''

''بیٹھ جاؤ بیٹی! کھڑی کیوں ہو۔'' انہوں نے صبا کی طرف سے توجہ نہ ہٹائی اسی طرح نگاہوں میں ستائش لئے اسے دیکھتی رہیں۔

''یہ کون ہے؟'' پھر وہ بلقیس سے مخاطب ہوئیں۔

''صبا!'' بلقیس نے بڑی ناگواری سے مختصر سا جواب دیا اور پھر کڑے تیوروں سے صبا کی طرف دیکھا۔ ''کریمن کہاں تھی؟'' ان کا عدنان کی امی پر کوئی بس نہ چلا تو اس پر غصہ نکالنے لگیں۔ ''کہا جو تھا کہ اسے بھیجنا اور تم خود دادی اماں کے پاس بیٹھنا۔ انہیں اتنے دنوں سے بخار ہے مگر پہلے تم نے کبھی کسی کا کہا سنا ہے جو آج سنتیں۔ ہمیشہ سے ڈھیٹ ہو۔''

''چلو کوئی بات نہیں بچی ہے۔'' عدنان کی امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آؤ

یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ ''آپ کی صبا تو سچ مچ ہی صبا ہے۔'' وہ اس کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بلقیس سے مخاطب ہوئیں۔

بلقیس نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بس چہرے پر ناگواری کے تاثرات لئے بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گئیں۔

''بیٹی! کوئی بات کرو نا۔ شکل و صورت کے ساتھ ساتھ تمہاری تو آواز بھی اتنی میٹھی سی ہے کہ سنتے سنتے جی نہ بھرے۔'' ان کی ساری توجہ صبا کے پورے سراپا پر مرکوز تھی اور ان کے انداز میں بڑا والہانہ پن تھا۔ صبا انہیں اتنی پسند آ گئی تھی کہ وہ اس پر جی جان سے فدا ہو رہی تھیں۔

بلقیس مزید برداشت نہ کر سکیں شعلہ باز نگاہوں سے صبا کو دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں بولیں۔ ''کریمن یقیناً اپنے خاوند کے پاس گھسی ہو گی۔ صبا تم بھی یہاں جم کر بیٹھ رہیں تو پھر کھانے کا انتظام کون کرے گا۔''

صبا بلقیس کے ان تیکھی نگاہوں کی زبان بھی سمجھتی تھی۔ زبانی اور آنکھوں سے دی ہوئی جھڑکی سنتے ہی ایک دم سہم کر کھڑی ہو گئی۔

''کوئی بات نہیں کھانے کے انتظام کے لئے ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ بیٹھو بیٹی! کچھ دیر میرے پاس بھی تو بیٹھو۔'' عدنان کی امی تو واقعی اس پر پوری طرح فریفتہ ہو چکی تھیں اس لئے اس کی پیاری پیاری صورت کو اپنی آنکھوں میں بسائے رکھنے کے لئے وہ اسے وہیں ٹھہرانے پر اصرار کرنے لگیں۔

مگر بلقیس جانتی تھیں کون سی بات ان کے اور ان کی غزالہ کے حق میں نقصان دہ ہو سکتی تھی تبھی تو وہ اسے مہمانوں کے روبرو صبا کو آنے کا موقع نہیں دیتی تھیں۔ لیکن آج برا ہوا اس کریمن کے میاں کا جو درمیان میں لٹکا ہوا تھا نہ مرتا تھا اور نہ جان چھٹتی تھی۔ کریمن اور اس کے خاوند کے بعد انہیں غزالہ پر غصہ آ گیا جس کی کاہلی اور سستی نے یہ موقع آنے دیا۔ ان کے کہنے کے مطابق خود ہی جا کر شربت وغیرہ لے آتی تو کیوں یہ وقت آتا! نہ جانے اسے کب عقل آئے گی کہ کن کن مواقع پر ڈھیٹ پن انتہائی نقصان دہ ہوتا ہے مگر

اب وہ کچھ کر بھی تو نہ سکتی تھیں بے بسی سے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔

آخر اپنے چہرے کے ہر قسم کے جذبات مسکراہٹ تلے دباتے ہوئے بلقیس عدنان کی امی سے مخاطب ہوئیں۔ ''کام کر کے ابھی پھر آ جائے گی۔''

''اچھی بات۔'' وہ ذرا بے دلی سے بولیں مگر پھر فوراً ہی معنی خیز انداز میں مسکرا دیں۔ ''چلو ٹھیک ہے اتنے میں میں آپ سے کچھ ضروری گفتگو کر لوں گی۔'' پھر انہوں نے غزالہ کی جانب دیکھا۔ ''غزالہ بیٹی! تم بھی جا کر بہن کا ہاتھ بٹاؤ نا۔''

اور اس سے پہلے کہ غزالہ پھر نافرمانبرداری کرتی بلقیس جلدی سے بول پڑیں۔

''ہاں غزالہ جاؤ آج تم اپنے ہاتھ سے اپنی خالہ کے لئے کھانا بناؤ۔ انہیں بھی معلوم ہو کہ ان کی بھانجی کتنی سگھڑ ہے۔'' اور ساتھ ہی بلقیس نے ہاتھ سے اسے ٹہوکا دیتے ہوئے گویا سچ مچ ہی اٹھ جانے کو کہا۔ انہیں ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ ایسا نہ ہو غزالہ پھر جانے سے انکار کر دے۔ اور پھر دل ہی دل میں بلقیس نے شکر کیا کہ وہ ان کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ لہٰذا چپ چاپ اٹھ کر چل دی۔

صبا جانتی تھی کہ عدنان کی امی کس غرض سے ان کے ہاں آئی تھیں مگر پھپھو کے ارادے اسے بڑے خطرناک دکھائی دیئے تھے اس لئے اس کا دل بے اختیار ہوا تھا کہ وہ ان دونوں کی گفتگو سنے۔ بے شک اس کی یہ حرکت اخلاق سے گری ہوئی تھی مگر جانتے بوجھتے ہوئے بھی وہ یہ اخلاقی گناہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کی زندگی بھر کا معاملہ تھا جتنی بھی بے چینی ہوتی کم تھی۔

کھانے وغیرہ کا انتظام بہت کچھ وہ پہلے ہی کر چکی تھی اور باقی جو رہ گیا تھا اس کے لئے کافی وقت تھا۔ کچھ اگر ادھر ضائع ہو گیا تو پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ وقت پر کر لے گی۔ اس لئے اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے چپکے سے مہمان خانے میں گھس گئی۔

وہ گول کمرے کے ساتھ ملحقہ ایک صاف ستھرا کمرہ تھا۔ جس کی آج ہی اس نے مزید صفائی کی تھی۔ مہمان جو آنے والے تھے! مگر وہاں کوئی بھی نہیں بیٹھا تھا۔ عدنان

جس وقت سے آیا تھا سہیل کے کمرے میں متمکن تھا اور اس کی امی گول کمرے میں ہی تشریف فرما تھیں۔

مہمان خانے کا دروازہ اندر سے بند کر کے وہ پنجوں کے بل بے آواز چلتے ہوئے گول کمرے کے دروازے کے قریب آ پہنچی۔ دونوں کمروں کو دبیز پردے نے ایک دوسرے سے علیحدہ کر رکھا تھا۔

اس کمرے میں چونکہ اندھیرا تھا اور گول کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اس لئے وہ کسی کو نظر نہیں آ سکتی تھی۔ ویسے بھی روشنیوں میں بسنے والوں کی نگاہیں کب تاریکیوں کے اس پار جاتی ہیں۔ انہیں کسی کے دکھوں اور غموں سے کیا سروکار!

صبا کی نگاہوں کے عین سامنے والے صوفہ پر پھپھو بڑی بے نیازانہ شان سے بیٹھی تھیں۔ البتہ عدنان کی امی کی اسے صرف پشت دکھائی دے رہی تھی۔

''ہاں ہاں کہیے بلا تکلف اور بلا جھجک!'' عدنان کی امی کی کسی بات کے جواب میں پھپھو نے مسکراہٹیں ہونٹوں تلے دباتے ہوئے کہا تھا اور ان کی یہ ادا صبا کو بڑی امید افزا معلوم ہوئی۔

''میں۔ میں ایک چیز آپ سے مانگنے آئی ہوں امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں لوٹائیں گی۔'' عدنان کی امی گویا بات کرتے ہوئے ہچکچا سی رہی تھیں۔

گو ان کی بات مبہم سی تھی مگر صبا کی سمجھ میں آ گئی تھی دھیرے دھیرے اس کے رخساروں پر سرخی پھیلنے لگی ہونٹ آپ ہی آپ مسکرا اٹھے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دیکھیں پھپھو کیا جواب دیتی ہیں انہیں کے جواب پر تو اس کی زندگی کا دارومدار تھا۔ بڑی امنگوں اور آرزوؤں سے اس نے نگاہیں پھپھو کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

''میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔'' انہوں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ لڑکی والی جو ٹھہریں کیسے ایک دم ہاں کر دیتیں۔ کچھ تو اپنے آپ میں بھاری پن پیدا کرنا ہی چاہیے۔

''میں آپ کی بھتیجی کی آرزو لے کر آپ کے ہاں آئی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' پھپھو ایک دم چونکیں۔

ان کے چہرے پر عجیب قسم کی ویرانی پھیلتی نظر آئی مگر کیوں؟ وہ بھولی لڑکی یہ نہ سمجھ سکی اور سمجھتی بھی کیسے؟ وہ بلقیس کے دلی خیالات سے قطعی لاعلم تھی کہ وہ اپنی بیٹی غزالہ کے لئے عدنان پر نگاہ رکھے تھیں۔ اور یہ! یہ تو خواہ مخواہ ہی ان کے راستے میں آئی جا رہی تھی اسے آخر یہ حق کس نے دیا تھا؟

''بہن! میرا مطلب صاف ہے آپ کے در دولت پر میں یہی آس لے کر حاضر ہوئی ہوں کہ صبا کو اپنے گھر کی روشنی بنا لوں۔ امید ہے آپ مجھے بامراد لوٹائیں گی۔'' عدنان کی امی کو بلقیس کے بدلتے تیوروں کا علم نہ ہو سکا وہ وضاحت سے اپنا مدعا بیان کر گئیں۔

بلقیس پہلے جو تھوڑی بہت خوش فہمی میں مبتلا تھیں وہ ان کے ان تشریحی کلمات سے بالکل رفع ہو گئی اب وہ گم سم سی بیٹھی تھیں اور عدنان کی امی امید و بیم کے عالم میں ان کے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا صبا کا دل دھڑک دھڑک کر حلق میں آ رہا تھا۔

''پھپھو ان کی بات کا کوئی جواب کیوں نہیں دیتیں؟'' اس نے بے چینی سے سوچا۔ ''ہاں کر دیجئے نا پھپھو!'' اس کے دل کی ہر دھڑکن پکار پکار کر کہہ رہی تھی۔

''کسی اور کا معاملہ ہوتا تو میں بلا سوچے سمجھے بڑی خوشی سے ہاں کر دیتی مگر.....'' بلقیس دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے خاموش ہو گئیں۔

اور اب ان کے چہرے کی ویرانی صبا کو اپنی رگ رگ میں اُترتی محسوس ہوئی۔ نجانے وہ کیا کہنے والی تھیں؟

صبا کا جی چاہا وہ کچھ اور سنے بغیر وہاں سے بھاگ جائے مگر چاہنے کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہاں سے بھاگنا تو درکنار رہا اس میں ہلنے کی سکت نہیں تھی پاؤں زمین پر یوں پیوست تھے جیسے ازل سے ہی وہ یہاں گڑی کھڑی ہو۔

''مگر کیا؟''

''عدنان مجھے اپنے سہیل ہی کی طرح عزیز ہے اور میں آپ کو کسی دھوکے میں

رکھ کر اس کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتی۔'' پھپھو کا فقرہ صبا کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتر گیا۔

''کیوں برباد کیوں؟''

''آپ سے مجھے کچھ ایسا انس ہو گیا ہے کہ وہ بات بھی آپ کو بتا رہی ہوں جو کسی اور کو بتانے سے خاندان کی بدنامی ہوتی ہے۔''

عدنان کی امی پوری توجہ سے پھپھو کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''کہنے کو تو میری بھتیجی ہے لیکن......''

''لیکن کیا؟'' وہ درمیان میں ہی بے صبری سے بول پڑیں۔

''درحقیقت ایسا نہیں ہے۔'' پھپھو کے چہرے پر عیاری پوری طرح جلوہ افروز تھی۔ ''معلوم نہیں یہ کس کی اولاد ہے!''

صبا کی آنکھوں کے آگے ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ ''ہائے پھپھو! یہ آپ نے کیا کیا؟''

''وہ ڈگمگائی اور پھر سنبھلنے کے لئے اس نے دروازے کے ایک پٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔ مگر اس طرح وہ سنبھل نہ سکی۔ چوٹ بڑی سخت تھی۔ وہ کواڑ کے ساتھ پھسلتے ہوئے وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''کیا مطلب؟ وضاحت سے بتائیے نا۔'' عدنان کی امی تجسس بھرے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

''اس کی ماں ایک آوارہ عورت تھی۔'' بلقیس اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو گئیں۔

''یہ جانتے ہوئے بھی آپ نے اسے اپنی بھابھی بنا لیا۔'' عدنان کی امی یقین بے یقینی کے عالم میں بولیں۔

''شاید آپ جھوٹ سمجھ رہی ہیں۔'' بلقیس بڑی مکاری سے مسکرائیں۔ ''لیکن یقین جانئے میں بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ خود ہم بڑی بری طرح پھنس گئے تھے۔'' وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ''جب آپ کو بہن کہہ دیا ہے تو پھر کچھ بھی آپ سے چھپانا' میں اچھا نہیں سمجھتی۔ دراصل قصہ یہ ہے کہ اس صبا کی خالہ کی نسبت بہت عرصہ پہلے

میرے بھائی سے طے ہو چکی تھی اور عین شادی کے دن جب کہ برات ان کے گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ دلہن غائب ہے۔''

''ہائے اللہ!'' بے ساختہ کلمہ، حیرت عدنان کی امی کے منہ سے نکل گیا۔ ''پھر پھر کیا ہوا؟'' اب ان کے لہجے میں بے یقینی کم اور یقین کا عنصر زیادہ تھا۔

صبا کا سر گھٹنوں میں دبا ہوا تھا اور سارا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ اس کی حیات میں زلزلہ جو آ گیا تھا!

''بات پھیلتی تو ایک نہیں دو خاندانوں کی رسوائی ہوتی۔ لڑکی کے باپ نے میری اماں کے پاؤں پر سر رکھ دیا اور التجا کی کہ اس وقت بات نہ پھیلائی جائے اور جس طرح بھی ہو سکے اس کی عزت رکھ لی جائے۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ چاہتا تھا ہمیں خالی لوٹانے کی بجائے اپنی چھوٹی لڑکی کا ہاتھ ہمیں پکڑا دے۔''

بلقیس لمحہ بھر کے لئے سانس لینے کو رکیں مگر عدنان کی امی' جو پورا قصہ سننے کو بہت بے تاب ہو رہی تھیں' جلدی سے بولیں۔ ''پھر آپ اسی کو بیاہ لائے تو یہ صبا اس کی بیٹی ہے۔''

''ہاں یہ اسی کی بیٹی ہے۔ میری اماں کو بوڑھے باپ کے آنسوؤں پر ترس آ گیا اور ہم کوئی حیل و حجت کئے بنا اسے بیاہ لائے۔ مگر ہماری قسمت تو اسی دن پھوٹ گئی تھی جس دن ہم نے بھائی کا رشتہ لینے کے لئے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔''

''کیوں پھر کیا ہوا؟''

''چھوٹی تو بڑی سے بھی تیز نکلی۔ اسے تو اتنی شرم نہ آئی کہ وہ خاوند اور گھر بار والی ہو گئی تھی۔''

''اس نے کیا کیا؟'' ایسی باتوں میں دلچسپی لینا عورت کی فطرت ہے اور عدنان کی امی بھی ایک عورت تھیں وہ پوری دلچسپی سے ساری داستان سن رہی تھیں۔

''شادی کے کچھ عرصہ بعد تک تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میرے بھائی کی بڑی

خدمت کرتی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج بھی اس نے بڑی اچھی طرح سنبھال لیا تھا۔ میری اماں تو بہت خوش تھیں کہ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ ہوسکتا تھا بڑی بہن اتنی اچھی اور اطاعت گزار ثابت نہ ہوتی جتنی یہ ہورہی تھی۔''

''پھر؟'' بلقیس لمحہ بھر کو رکیں تو عدنان کی امی بے صبری سے بولیں۔

''مگر یہ سب ہماری خوش فہمی تھی۔ یہ خدمت اور اطاعت تو صرف ہماری آنکھوں پر پٹی باندھنے کے لئے تھی۔ سو ہماری آنکھوں پر بندھ گئی۔ گھر کے سب ہی لوگ اس پر اندھا اعتماد کرنے لگے۔ مگر وہ تھی کس کی بہن!'' بلقیس کے ہونٹوں پر حقارت بھرا تبسم پھیل گیا۔

عدنان کی امی دم بخود سی بیٹھی یہ افسانہ نما حقیقت سن رہی تھیں اور وہ جس کی دنیا لٹی جارہی تھی وہ اب یوں ساکت تھی جیسے اس میں بالکل جان نہ ہو۔ جسم کا ایک ایک قطرہ خون رگوں میں منجمد ہو چکا تھا۔ اب تو اس کے وجود میں لرزنے کی طاقت بھی باقی نہیں تھی۔

''ہماری آنکھوں پر پٹیاں بندھیں تو اس نے پر پرزے نکال لئے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ایک دو گھنٹوں کے لئے گھر سے غائب ہو جاتی وہ کبھی کسی سہیلی کے ہاں جانے کا بہانہ بنالیتی اور کبھی کسی کے ہاں۔ اماں ٹھہریں پچھلے زمانے کی سیدھی سادی عورت جھٹ اجازت دے دیتیں۔ میں بھی ان دنوں اپنے سسرال میں تھی اس کی تو رسی دراز ہوگئی۔''

''تو کیا کسی نے بھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی وہ کہاں جاتی تھی؟'' عدنان کی امی حیرت کے مارے انگشت بدنداں تھیں۔

''یہی تو کہہ رہی ہوں کہ وہ بہت چالاک تھی۔ آتے ہی ہم پر خدمت اور اطاعت گزاری کا جادو جو کر دیا تھا۔ کسی نے خیال ہی نہیں کیا اور پھر یہ صبا پیدا ہوئی۔ اس کی پیدائش پر میں میکے آئی تو گھر کے عجب رنگ ڈھنگ تھے۔ اتنی چھوٹی بچی کی بھی پروا نہ کرتی۔ کوئی اِدھر اُدھر کا بہانہ بنا کر چل دیتی۔''

''اچھا!'' عدنان کی امی کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ ایسا عجیب

واقعہ انہوں نے پہلے کبھی نہ سنا تھا۔

''دو چار دن تو خاموشی سے میں یہ تماشا دیکھتی رہی اور پھر ایک دن وہ جب روتی بلکتی بچی کو چھوڑ کر چلی گئی اور پورے چار گھنٹے بعد واپس آئی تو پھر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔'' بلقیس بڑی رقت سے سنا رہی تھیں پھر ایک دم ان کے چہرے پر جلال چھا گیا۔

''میں نے خوب کھری کھری سنائیں۔ آگے سے کچھ بولی ہی نہیں آنکھوں میں مگر مچھ کے آنسو بھرے چپ چاپ سر جھکائے سب کچھ سنتی رہی۔ بات کیسے کرتی! آنکھ کیسے ملاتی! عیب دار جو تھی۔ اور پھر اسی رات وہ گھر سے بھاگ گئی۔'' بلقیس نے قصہ ختم کر کے طویل سانس لی۔

''اسے اپنی لڑکی کا بھی خیال نہ آیا؟'' عدنان کی امی ایک عورت کے اس غیر فطری پن پر جھنجھلا گئیں۔

''کیا اس کی ممتا اولاد کے لئے بھی نہ تڑپی۔''

''ایسوں کے لئے اولاد کی محبت کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ان کی نگاہوں میں تو بس اپنے عیش ہی ہوتے ہیں نچ کہیں کی!'' بلقیس نے بڑی حقارت سے صوفہ کے پیچھے تھوک دیا۔ ''اور یہ صبا، یہ بھی ہو بہو اپنی خالہ اور ماں پر جارہی ہے۔''

''کیا سچ؟''

''تو اور نہیں کیا۔''

''توبہ! توبہ!!'' عدنان کی امی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''لاکھ خوبصورت ہو مگر میں تو ایسی لڑکی سے کبھی بھی اپنے بیٹے کی قسمت نہ پھوڑوں۔'' انہوں نے گویا اپنا فیصلہ صادر فرمادیا۔

بلقیس کے چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔

''میرا ارادہ تو بہت عرصہ سے اپنے دیور کی لڑکی سے کرنے کا تھا لیکن عدنان کے زور دینے پر مجھے یہاں آنا پڑا۔'' عدنان کی امی قدرے توقف بعد بولیں۔ ''مجھے اپنا بچہ بہت پیارا ہے اور میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کروں مگر

رہے تو میں حشر تک نہ ہوں دوں گی۔کل کلاں کو ہمارا خاندان بھی بدنامی کے گڑھوں میں جا پڑے اور مجھے اپنے خاندان کی عزت بہت عزیز ہے۔"

عدنان کا رشتہ اس کی ماں اپنے دیور کے ہاں کرنا چاہتی تھیں یہ سنتے ہی بلقیس کا رنگ ایک بار پھر اڑ گیا۔مگر تھیں بڑی جی دار حوصلہ نہ ہارا۔فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے مسکرائیں۔"اپنے عدنان کے لئے کیا لڑکیوں کی کمی ہے۔ایک سے ایک بڑھ کر حسین اور سگھڑ دنیا میں موجود ہیں۔"

"ہاں تو اور کیا۔" عدنان کی امی بڑی بے نیازی سے بولیں۔ پھر ایک لمحہ رک کر کچھ سوچا اور بڑبڑانے لگیں۔"میں بھی کہوں ایسی کیا بات ہے جو عدنان اتنی جلدی کر رہا ہے۔ کہے آج کل ہی چل کر بات طے کروں۔ جب دیکھو ہر وقت اس کی زبان پر تو اسی حرافہ کا نام تھا جانے میرے بچے پر کیا جادو کر دیا تھا۔"

ان کی بڑبڑاہٹ بلقیس کان لگا کر بڑے دھیان سے سن رہی تھیں۔ جھٹ درمیان میں لقمہ دیا۔

"میری غزالہ بھی تو عدنان سے پردہ نہیں کرتی تھی مگر وہ ایک آدھ بار سے زیادہ اس کے سامنے گئی ہی نہیں اور یہ صبا تو ہر وقت وہیں گھسی رہتی تھی۔ بہن! کیا بتاؤں آپ کو،" بلقیس بڑی رازداری سے بولیں۔"مجھے تو ہر وقت اپنے سہیل کا فکر لگا رہتا ہے۔ جب دیکھو اس کے کندھوں پر سوار اور اب تو وہ بھی کچھ ایسا اس کا دیوانہ ہو رہا ہے کہ گھر میں آتے ہی اگر لمحہ بھر کے لئے وہ دکھائی نہ دے تو اسے نجانے کیا ہونے لگتا ہے۔ایک ایک کمرے میں اسے پکارتا پھرتا ہے۔"

"ایسی لڑکی سے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔" عدنان کی امی نے نہلے پر دہلا مارا۔

"خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے آپ کو تو اپنی غزالہ کو اس کے سائے سے بھی بچانا چاہیے۔"

اب صبا میں مزید سننے کی تاب نہ تھی اس نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

اس کا جی چاہا اس ظلم پر بے اختیار چیخ دے مگر ہمیشہ کی طرح آج پھر اس نے اپنی چیخیں

اپنے سینے میں ہی دفن کر لیں۔

اور پھر اپنے لرزتے ہوئے وجود کو بڑی مشکل سے سنبھالتے ہوئے وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

11

"یہ کیا ہو گیا یہ کیسے ہو گیا؟"

وہ چارپائی پر اوندھے منہ لیٹی بری طرح رو رہی تھی اور باہر غزالہ اور بلقیس کے مسرور و فاتحانہ قہقہے فضا میں بکھر بکھر کر اسے اپنی شکست کا احساس دلا رہے تھے۔ یہ پچھلے دو دن کچھ ایسے انداز میں گزر گئے تھے کہ وہ طوفان میں بہتے تنکے کی طرح بس لہروں کے رحم و کرم پر ادھر اُدھر بھٹکتی رہی تھی اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔اور جب طوفان تھما تو اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں بیدار ہو گئیں اور اب وہ اپنی شکست خوردہ ہستی کو لئے آنسو بہا رہی تھی کہ شاید اسی طرح اسے کچھ سکون حاصل ہو جائے۔مگر ایسی اس کی قسمت کہاں؟

اب ہی تو اسے اپنی حیثیت کا پوری طرح اندازہ ہوا تھا کہ وہ دنیا کی نظر میں کیا تھی؟ باقی دنیا رہی ایک طرف' سب سے زیادہ افسوس تو اسے عدنان پر تھا۔ جسے وہ ایک باعزم اور باوفا انسان سمجھتے ہوئے اپنی ہر خواہش' ہر تمنا اور ہر آرزو اس سے وابستہ کر بیٹھی تھی۔ کتنی جلد اس نے سب فاصلے طے کر لئے تھے اور انجام کیا نکلا؟ آہیں اور آنسو! بے بسی اور بے چارگی اس کی آنکھوں سے آتش فشاں کی طرح پھوٹ رہی تھی۔

پھپھو اور عدنان کی امی کی بہت ساری باتیں اس نے سن لی تھیں۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا' اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے مگر پھر بھی ایک امید کی کرن کسی کونے میں جگمگا رہی تھی۔

اور وہ تھا عدنان!

صبا کو امید واثق تھی کہ ایک تعلیم یافتہ اور آزاد خیال انسان ہونے کی صورت میں عدنان اس کے خلاف کی گئی کسی بھی بات کو دل میں جگہ نہ دے گا۔ وہ اس سے سچی محبت کا دعویٰ جو کرتا تھا۔ بے شک ماں نے انکار کی صورت میں اپنا فیصلہ دے دیا تھا مگر وہ یقیناً یہ فیصلہ منظور نہیں کرے گا۔ اس کی محبت ایسی کچی نہ تھی۔ وہ یقیناً اپنے اور صبا کے درمیان حائل ہر چٹان سے ٹکرا جائے گا لیکن اس کے ساتھ بیوفائی نہیں کرے گا۔

اس کے ننھے سے معصوم دل کو ان سوچوں نے بہت حوصلہ دے رکھا تھا۔ نجانے پھپھو نے عدنان کی امی پر کون سا جادو کیا تھا کہ وہ غزالہ پر صدقے واری ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ غزالہ جسے صبا نے خود اپنی آنکھوں سے ایک غیر مرد کی بانہوں میں بانہیں ڈالے بیٹھے دیکھا تھا۔ عدنان کی امی کی نگاہوں میں ایسی پاک دامن' باحیا اور سگھڑ تھی کہ وہ اپنے دیور کی لڑکی کو بھی بھول گئیں جسے وہ ایک عرصے سے اپنے بیٹے کے لئے پسند کر چکی تھیں اور صبا کی نگاہوں میں اتنی گناہگار تھی کہ وہ اب اسے ایک نظر دیکھنا بھی نہ چاہتی تھی۔

کچھ بلقیس کی زبان میں جادو تھا اور بہت کچھ اس کی دولت میں جس کے شیشے میں انہوں نے عدنان کی ماں کو بڑی سہولت سے اتار لیا تھا اور وہ اسی دن غزالہ کو انگوٹھی پہنانے پر مصر ہو گئیں۔ وہی انگوٹھی جو وہ صبا کے لئے لے کر آئی تھیں۔

''نہیں بہن ایسی بھی کیا جلدی۔'' بلقیس کے عضو عضو سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ''میری غزالہ کہیں بھاگی نہیں جاتی آپ پہلے اپنے لڑکے سے تو بات کر لیجئے۔''

بلقیس پکی طرح پاؤں جمانا چاہتی تھیں ماں کو تو انہوں نے مٹھی میں کر لیا تھا مگر آج کل کے جوان لڑکوں کا کیا اعتبار!

''ہاں یہ تو آپ نے ٹھیک کہا۔ میں ابھی عدنان سے بات کرتی ہوں۔ وہ راضی ہو گیا تو انشاء اللہ انگوٹھی پہنا کر ہی جاؤں گی۔''

میز پر کھانا لگاتے ہوئے صبا نے یہ بات سنی تھی۔ کچھ پریشان بھی ہوئی مگر اتنی نہیں کہ اسے اپنی دنیا لٹتی نظر آتی عدنان پر بہت زیادہ اعتماد تھا کہ وعدے کے مطابق وہ صبا

کے علاوہ کسی کو بھی اپنا شریک زندگی نہیں بنائے گا مگر اسے کیا پتہ کہ اس کا گناہ قابل عفو درگزر نہ تھا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

گھر میں بہت سارے مہمان جمع تھے اور سب کی موجودگی میں عدنان نے خود اپنے ہاتھ سے غزالہ کو انگوٹھی پہنائی تھی۔ صبا کسی لاش کی طرح بے حس اور بے جان کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

اور جب انگوٹھی پہنانے کے بعد عدنان دلہن بنی غزالہ کے شرمائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر بے اختیار مسکرا اٹھا تو اچانک صبا کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔

اس کی ماں کا کیا ہوا گناہ' جو اس کے ماتھے پر چسپاں تھا وہ شاید کوئی اتنی زیادہ ہی بڑی چٹان تھی کہ عدنان کو اس سے ٹکرا جانے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا وہ سب کے سامنے چیخ چیخ کر فریاد کرے کہ کیوں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی اسے گناہگار ٹھہرا کر اس سے ہر خوشی اس بے دردی سے چھین لی جا رہی تھی۔ کن ارمانوں اور حسرتوں سے اس نے عدنان کو اپنے دل میں بسایا تھا اور کس کس طرح اس کی حسرتیں پاؤں تلے روندی جا رہی تھیں۔

مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی ہمیشہ سے ہی اس کی زبان نے بے زبانی سیکھی ہوئی تھی۔ البتہ اب اس میں یہ نظارہ دیکھنے کی مزید تاب باقی نہ رہی۔ ابھرتی سسکیوں کو حلق ہی میں دباتی اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ دوپہر شام ہوئی اور پھر رات ہو گئی مگر وہ اپنے کمرے میں ہی بند اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہی۔ کسی نے بھی اس کی غیر موجودگی کی طرف توجہ نہ دی جیسے سرے سے اس گھر میں اس کا وجود بھی تھا ہی نہیں۔

پھپھو' عدنان کی امی اور غزالہ کی شادمان و کامران آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں غزالہ کے قہقہے تو بات بے بات ابلے پڑتے تھے۔

اور یہ سب سن سن کر صبا کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب اسی پر ہنس رہے ہوں ہر قہقہے کے بعد اس کے آنسوؤں میں اور بھی روانی آ جاتی اور اس کی سسکیاں مزید سسکنے لگ جاتیں۔

"صبا کہاں ہے؟" دور سے کسی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

لمحہ بھر کے لئے اس کی سسکیاں تھم گئیں اور ایک موہوم سی امید کی کرن دل کی تاریکیوں میں در آئی۔ شاید عدنان نے اس کے متعلق پوچھا ہو۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے اور دل دھک دھک کرنے لگا۔ مگر دوسرے لمحے اس کی دھڑکنیں رک گئیں اور سسکیاں پھر ابھرنے لگیں۔ وہ عدنان نہیں تھا۔

سہیل نے اس کے متعلق ماں سے پوچھا۔ جواب میں جانے پھپھو نے کیا کہا وہ بڑبڑاتا ہوا آ کر اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

"اتنی بھی کیا سنگدلی! آخر وہ بھی انسان ہے۔"

اس کی آواز میں تلخی تھی۔

"صبا! صبا!!" وہ کتنی ہی دیر دروازہ کھٹکھٹاتا رہا اور اسے پکارتا رہا۔

"سو گئی ہو گی تم خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہے ہو۔" دور سے پھپھو کی تیز آواز آئی اور پھر دھیمی ہو کر بڑبڑاہٹ میں بدل گئی۔ "ہمیشہ سے ہی کاہل ہے سر شام سو جاتی ہے۔"

"بھلا شریف لڑکیوں کے چلن ایسے ہوتے ہیں۔" عدنان کی امی کا فقرہ صبا کے سینے کے پار اتر گیا چھلکتی ہوئی آنکھیں مزید چھلک پڑیں۔

"کب وہ سر شام ہی سو جاتی ہے آپ تو ہر وقت اس کے پیچھے ہی پڑی رہتی ہیں۔" یوں تو صبا کے خلاف جب بھی سہیل کے سامنے کوئی بات ہوتی وہ ضرور ٹوک دیتا۔ مگر اس وقت نجانے کیوں اسے کچھ زیادہ ہی غصہ آ گیا تھا۔ "آئندہ کسی نے اسے کچھ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔" اس نے ماں کا بھی لحاظ نہ کیا اور پھر دروازہ کھٹکھٹانا بند کرتے ہوئے دھپ دھپ زمین پر پاؤں مارتا باہر نکل گیا۔

ساری رات صبا کو نیند نہ آئی۔ وہ جاگتی رہی۔ اپنی تقدیر پر آنسو بہاتی رہی اور اپنے وجود کو کوستی رہی کہ کیوں دنیا میں آئی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ اسے یہ زندگی جسے سب نعمت کہتے ہیں ملی ہی نہ ہوتی! اور پھر صدیوں سے بھی زیادہ لمبی وہ رات بھی گزر گئی۔

بلقیس کی آواز تھی کہ سات محلے سنتے ہوں گے مگر انہیں کچھ احساس نہ تھا سمدھن

اور ہونے والے داماد کے لئے ناشتہ تیار کرنا تھا۔ ان کی گاڑی چھوٹی جا رہی تھی۔ بلقیس نے شور سے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

جانے کریمن کے خاوند کا کیا حال تھا، مگر اس وقت تو وہ بھی ان کی آواز کے ساتھ ساتھ بھاگم بھاگ کام کرتی پھر رہی تھی۔

صبا ابھی تک اپنے کمرے میں ہی بند تھی۔ نجانے کیوں عدنان یا عدنان کی ماں کا سامنا کرنے کی وہ اپنے میں ہمت نہ پا رہی تھی۔ ویسے بھی یہ واقعہ اس کے لئے اتنا بڑا حادثہ ثابت ہوا تھا کہ اتنے گھنٹے تن تنہا بند ہو کر آنسو بہاتے رہنے کے باوجود اس کے غم میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی بلکہ ہر لمحہ اسے اپنے دکھ سوا ہوتے ہی محسوس ہو رہے تھے۔

وہ تو یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ عدنان اس کے لئے فرشتہ رحمت بنے گا اور اسے اس جہنم سے نکال لے جائے گا مگر بجائے اس کے کہ وہ صبا کو اس جہنم سے نجات دلاتا اس نے تو اس کے لئے کئی اور جہنموں کے در کھول دیئے تھے۔ سب سے بڑا جہنم تو خود اس کا اپنا دل ثابت ہو رہا تھا جسے ایک لمحے کے لئے بھی چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر تڑپ رہا تھا اور صبا کو ماہی بے آب کی طرح تڑپا رہا تھا۔

"غزالہ! غزالہ بیٹی!! کہاں ہو؟ تمہاری خالہ امی جا رہی ہیں۔ اور تم سے ملنا چاہتی ہیں۔" پھپھو کی آواز صبا کے کان میں پڑی تو وہ بے اختیار ہوتے ہوئے ایک جھٹکے سے اٹھ کر دروازے تک جا پہنچی۔

جانے کون سی طاقت تھی جو اسے کھینچ لے گئی تھی کسی طلسمی انسان کی طرح آپ ہی آپ اس کا بازو اٹھا اور دروازے کی چٹخنی گر گئی۔

دل میں ایک موہوم سی امید لئے وہ دروازے کا ایک کواڑ کھول کر باہر جھانکنے لگی۔ عدنان اور اس کی امی کے علاوہ گھر کے دوسرے افراد بھی وہیں جمع تھے۔

عدنان کی امی غزالہ کو بازوؤں میں لئے چٹاچٹ اس کی بلائیں لے رہی تھیں اور عدنان بڑی میٹھی اور گہری گہری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

پہلے وہ اوٹ میں کھڑی تھی پھر جانے کیا خیال آیا ادھ کھلے دروازے میں اس

طرح کھڑی ہوگئی کہ سب کو نظر آسکے۔ خصوصاً عدنان کے تو بالکل سامنے تھی۔ پھپھو نے عدنان کو سینے سے لگایا اور ماتھا چوم کر ڈھیر ساری دعائیں دیتے ہوئے اس کی امی کے گلے جالگیں۔ یہ سب کچھ وہ بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔

کریمن جلد جلد ان کا سامان باہر لے جارہی تھی اور سہیل ایک کونے میں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا ایک تنکا دانتوں میں چبا رہا تھا۔ اور بڑے غور سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا کبھی کبھی اس کی نگاہ صبا کے کمرے کی طرف بھی اٹھ جاتی۔

عدنان اور اس کی امی' سب سے مل ملا کر زینے کی طرف بڑھے۔ بلقیس اور غزالہ بھی ساتھ ساتھ چلیں اور وہ' جو بڑی آس لئے دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی کسی نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ عدنان نے بھی اسے یوں نظرانداز کر دیا جیسے وہ اس کے لئے بالکل ہی اجنبی ہو۔ اسے تو اس پیمان کا بھی خیال نہ آیا جو ایک دن اس نے اس کے ساتھ باندھا تھا۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نظر الوداعی ہی سہی اس پر ڈال تو لیتا شاید اسی سے اس کو کچھ تسکین مل جاتی۔

مگر وہ دل میں حسرت ہی لئے رہ گئی اور وہ چلا گیا۔

ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں طوفان امنڈ آیا جسے چھپانے کے لئے وہ اپنے دل کو ہاتھوں میں دباتے ہوئے جلدی سے پیچھے ہٹ گئی وہ پیچھے ہٹی تو سہیل بھی دیوار چھوڑ کر زینے کی طرف بڑھ گیا سٹیشن تک اسے مہمانوں کے ساتھ جانا تھا۔

12

"صبا ادھر میری طرف تو دیکھ۔"

نجانے سہیل کب اس کے سرہانے آ کھڑا ہوا تھا اسے بالکل پتہ نہ چلا اور چلتا بھی کیسے؟ سسکیوں اور آہوں سے فرصت ملتی تو کسی اور طرف متوجہ ہوتی نا! سہیل کی آواز

اس کے کان میں پڑی تو اٹھ کر بیٹھ گئی مگر چہرے کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔

"صبا! بات تو سن۔"

اس نے اس کے قریب بیٹھ کر بڑی نرمی سے اس کا سر اونچا کیا۔ رو رو کر صبا کی آنکھیں بری طرح متورم ہو رہی تھیں۔ سہیل نے بڑے درد سے اس کے چہرے کو دیکھا۔

"اب بس کر۔ آخر کب تک یونہی روئے جاؤ گی۔"

وہ جواب کیا دیتی ہمدردی پائی تو وہ آنکھیں جو بظاہر اپنا سارا خزانہ خالی کر چکی تھیں' ایک بار پھر چھلک پڑیں۔ جانے ان میں اتنا پانی کہاں سے آ سمایا تھا کہ ختم ہونے کو ہی نہ آ رہا تھا۔

"تو تو پاگل ہے جو رو رو کر اپنا برا حال کر رہی ہے۔ تیری جگہ میں ہوتا تو رونے کی بجائے خوشی مناتا۔"

صبا نے سہیل کی بات نہ سمجھتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ہاں ہاں وہ تیرے قابل نہیں تھا۔"

اور وہ سہیل کے منہ سے یہ سن کر چونک سی پڑی۔

"مجھے سب معلوم ہے۔" سہیل نے اس کی چونکنے والی حیرت کا جواب دیا۔ "عدنان ہے تو میرا دوست لیکن بہت گھٹیا ثابت ہوا جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ مگر ایک بات کی خوشی بھی کہ تیری زندگی بچ گئی۔ تو جو ایک انمول ہیرا ہے، تیرے لئے تو کوئی ایسا انسان ہونا چاہیے جو ان سطحی باتوں سے بہت بلند ہو اور جو حسب و نسب سے علیحدہ ہو کر ایک انسان کو پہچانے اور تیری صحیح طرح قدر کرے۔"

صبا سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔

"تو خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہی ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب تو اس جہنم سے نکل جائے گی۔ مجھے یقین ہے اتنی عمر اس جہنم کے عذاب کے بدلے میں باقی عمر کے لئے خدا تمہیں بڑی خوبصورت سی جنت دے گا مجھے پورا یقین ہے۔" اس نے صبا کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا سر اونچا کیا۔ "ادھر میری طرف دیکھ۔"

صبا نے سر اٹھانے کے بعد سوجی سوجی آنکھیں اٹھائیں۔ سہیل بڑے غور سے ان میں جھانک رہا تھا۔ ''میری باتیں سن رہی ہو نا؟''

وہ زبان سے کچھ نہ بولی صرف اثبات میں اس نے سر ہلا دیا۔

''ان پر یقین بھی کر رہی ہو یا دوسرے کان سے نکالتی جا رہی ہو۔''

سہیل کا انداز ایسا تھا کہ بھولی بھٹکی مسکراہٹ کی ایک چھوٹی سی لہر اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

''بتاؤ یقین کر رہی ہو نا میری باتوں کا؟''

اس کی مسکراہٹ نے سہیل کی پریشانی کچھ کم کر دی۔

''ہاں۔'' صبا نے مختصر جواب دیا۔ مگر اس کا دل پھر ایک دم بے قرار ہو اٹھا اتنا بڑا زخم لگا تھا کہ بھرتے بھرتے ہی بھرتا! اس نے تو صرف سہیل کی خاطر ''ہاں۔'' کہہ دیا تھا ورنہ کاش وہ اسے اپنا دل چیر کے دکھا سکتی کیسے زخموں سے خون رس رہا تھا!

''چل اٹھ باہر آ اور کچھ کھا پی لے تو کل کی بھوکی ہے۔''

''نہیں سہیل بھائی مجھے ذرا بھوک نہیں ہے۔'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

''کیوں نہیں ہے۔'' سہیل نے اس کا بازو پکڑ کر زبردستی اسے اٹھا دیا۔ ''تمہیں معلوم نہیں کل سے میں نے بھی کچھ نہیں کھایا چل تُو چائے بنا اور دونوں پئیں اچھا؟''

''لیکن لیکن آپ نے کیوں نہیں کچھ کھایا؟'' صبا متحیر ہوتے ہوئے بولی۔

''بس ایسے ہی بھوک نہیں تھی۔'' سہیل نے بظاہر بڑی لاپروائی کا اظہار کیا مگر اس کی نگاہوں میں صبا کو عجیب سی چمک نظر آئی۔ وہ کچھ سوچنے لگی اور بڑے غور سے سہیل کی جانب دیکھنے لگی۔

''چل بھی نا۔'' سہیل نے اسے کچھ سمجھنے کا موقع نہ دیا۔ بازو پکڑ کر باہر کی سمت اسے کھینچا۔ ''مجھے بھوک لگی ہے۔''

''اچھا اچھا۔'' اور سہیل کی ہمدردی اور یگانگت بھری باتوں نے برائے چندے اسے بہلا لیا۔ سہیل کے ساتھ ہی وہ کمرے سے باہر نکلی۔ برآمدے میں دادی اماں چارپائی

پر لیٹی تھیں۔ اور ان کے قریب ہی پھپھو بیٹھی تھیں دونوں میں بہت ہی دھیرے دھیرے کوئی راز و نیاز ہو رہے تھے۔

پاؤں کی چاپ ہوئی تو دونوں ہی چونک پڑیں۔ اور سہیل کے ساتھ ساتھ صبا کو آتے دیکھ کر پھپھو کی پیشانی پر گہری گہری سلوٹیں اُبھر آئیں۔ بڑی معنی خیز نگاہوں سے انہوں نے دونوں کو دیکھا۔

''ہوں!'' ان کے ہونٹوں سے صرف اتنی صدا نکلی۔

صبا تو چپ چاپ باورچی خانے میں چلی گئی اور سہیل ماں کی 'ہوں' کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''یہ ماں بیٹی میں سر جوڑ کر کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے نانی اور ماں کے چہروں کی جانب دیکھا۔

''تمہیں کیا۔'' چہرے پر تو ناگواری کی لکیریں تھیں ہی' بلقیس کے لہجے میں بھی تلخی بھر آئی۔

''تو پھر طے رہا نا۔'' سہیل نے بڑے معنی خیز انداز میں ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ''جو آپ کا جی چاہا آپ نے کر لیا اور جو میرا جی چاہے گا میں کر لوں گا۔''

''کیا مطلب؟'' بلقیس چونکیں۔ بیٹے کے تیور کچھ ٹھیک نظر نہ آ رہے تھے۔

''مطلب وطلب آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔ فی الحال بس اتنا آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ میں آج ہی اور ابھی دو گھنٹے تک واپس جا رہا ہوں۔'' سہیل نے جیب سے گاڑی کا ایک ٹکٹ نکال کر انگلیوں میں نچایا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' بلقیس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے متحیرانہ بیٹے کو دیکھا۔

''جہاں ہمیشہ رہتا ہوں۔''

''مگر تمہاری تو چھٹیاں ابھی بہت ساری باقی ہیں۔''

''ہیں تو۔'' اس نے مختصر جواب دیا اور ٹکٹ پر نگاہیں جما دیں۔

"تو پھر۔" بلقیس نے الجھتے ہوئے بیٹے کو گھورا۔ "پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔"

"صاف صاف بھی کہہ دوں گا میں کسی سے ڈرنے والا نہیں۔" سہیل ہمیشہ سے ہی نڈر اور صاف گو تھا۔ "میں آج جا رہا ہوں تین چار دن تک لوٹ آؤں گا اور پھر......"

"سہیل بھائی!" صبا کی آواز نے اس کی بات ادھوری ہی رہنے دی۔ "چائے باہر ہی لے آؤں؟" وہ باورچی خانے میں سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں یہیں لے آؤ اور ساتھ کھانے کے لئے بھی کچھ لانا۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے تو ناشتہ کیا ہے!" بلقیس پھر حیران ہو گئیں۔ یہ سہیل آج کیسی حرکتیں کر رہا تھا۔ ناشتے اور کھانے کے درمیان سوائے چائے کی ایک دو پیالیوں کے وہ کبھی کچھ کھایا نہیں کرتا تھا۔

"میں نے آج ناشتہ نہیں کیا تھا۔" سہیل نے سر جھکاتے ہوئے ہولے سے کہا۔

"نہیں کیا تھا۔ میز پر سب کے ساتھ بیٹھے تو ہوئے تھے؟"

"ہاں۔"

"تو پھر کیوں نہیں کیا تھا؟"

"بس ایسے ہی بھوک نہیں لگی تھی۔"

"تو اب لگی ہے؟" بلقیس نے بڑے طنز سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ سہیل نے محض صبا کی خاطر بہانہ بنایا تھا۔

"امی!" سہیل کو ان کی جرح پر غصہ آ گیا۔ "کبھی اتنا بھی سوچ لیا کیجئے کہ آج آپ کسی پر رحم کریں گی تو کل خدا آپ پر رحم کرے گا۔"

"کیا؟" بلقیس کے ماتھے پر کئی شکن پڑ گئے۔

"وہ غریب کل کی بھوکی ہے اور آپ نے اسے بھولے سے بھی نہیں پوچھا۔"

"کس کے متعلق کہہ رہے ہو؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گئیں۔

"اسی کے متعلق جو آپ کے جور و ستم کا نشانہ بنتی رہتی ہے۔"

"دیکھ سہیل!" ان کے لہجے میں ایک دم ملائمت آ گئی۔ جوان بیٹا کہیں سرکشی پر نہ اتر آئے! "تو ان معاملات میں دخل نہ دے میرے لال!"

"کیوں۔ آخر کیوں؟" ماں نرم پڑیں تو بیٹے کے لہجے میں سختی آ گئی۔ "میں کیوں نہ دخل دوں ایک معصوم پر اتنے مظالم ہوتے دیکھ کر مجھ سے تو زبان بند نہیں رکھی جاتی۔"

"تم جسے معصوم کہہ رہے ہو نا وہ بھی ایک ہی دس کی گانٹھ ہے۔ کبھی اس کے چلن بھی دیکھے وہ کیا کیا کرتی ہے۔"

"کیوں اس نے کیا کیا ہے؟"

"اب یہی دیکھ کل غزالہ کی منگنی ہوئی تو وہ دیکھ نہ سکی ایسی جل بھن کر راکھ ہوئی کہ......"

"امی!" سہیل نے پوری قوت سے چلاتے ہوئے ماں کی بات کاٹ دی۔

"بس آگے کچھ مت کہیے گا ورنہ وہ احترام بھی اٹھ جائے گا جو اولاد ہونے کے ناطے مجھے آپ کا کرنا پڑتا ہے اور آپ یہ نہ سمجھیں کہ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔"

"سہیل! سہیل!!" نواسے کی آنکھوں میں خون اترتا دیکھ کر نانی خاموش نہ رہ سکیں۔ "بیٹے! ماں کے روبرو یوں نہیں بولا کرتے۔"

"نانی اماں! میں تو ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ جہاں تک ہو سکے مجھ سے امی کی کوئی بے ادبی نہ ہو مگر جب یہ خود ہی مجبور کر دیں تو۔"

"نہیں بیٹے نہیں۔ کچھ بھی ہو ہر حال میں والدین کا احترام پیش نظر رکھنا چاہیے۔"

نانی کے سمجھانے پر سہیل دھیما پڑ گیا چند لمحے خاموش رہنے کے بعد زور زور سے صبا کو پکارنے لگا۔ "صبا! ابھی تک چائے نہیں بنی؟"

"بن گئی ہے۔" باورچی خانے سے صبا کی لرزتی اور کپکپاتی آواز آئی۔

"تو پھر لاؤ نا جلدی میری گاڑی کا وقت ہوا جا رہا ہے۔"

''سہیل بیٹے! آخر تم نے ایک دم جانے کی کیوں ٹھان لی؟''

بلقیس منہ پھلائے بیٹھی تھیں۔ نانی اماں نے ہی بڑی نرمی سے پوچھا اور ابھی وہ کوئی جواب نہ دے پایا تھا کہ صبا چائے لئے آ گئی۔ باورچی خانہ پاس ہی تو تھا وہ سب کچھ سن رہی تھی اس لئے سہمی سہمی تھی اور آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

سینی رکھ کر خود جلدی سے پیچھے ہٹی اور پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی ہی تھی کہ سہیل نے آواز دی۔ ''صبا! سنو۔''

وہ لرزتے ہوئے قریب آ گئی۔

''بیٹھو یہاں۔'' سہیل کے لہجے میں سختی تھی۔ وہ چپ چاپ پلکیں جھکائے چارپائی کے ایک کونے پر ٹک گئی۔

''ادھر نہیں یہاں۔'' سہیل نے کرسی اپنے قریب کھسکاتے ہوئے اسے اشارہ کیا۔ وہ کسی معمول کی طرح، جو اپنے عامل کے بس میں ہو، بلا حیل وحجت کئے بیٹھ گئی۔

''امی! نانی اماں!! آپ دونوں بھی پئیں گی؟''

''نہیں۔'' بلقیس کے جواب میں زہر بھری تلخی تھی اور نانی اماں نے صرف سر کو نفی میں ہلا دینا ہی کافی سمجھا کچھ دنوں سے انہیں بخار آ رہا تھا اس لئے وہ زیادہ تر خاموش ہی پڑی رہتی تھیں۔

ایک پیالی اپنے آگے رکھ کر سہیل نے دوسری اٹھائی۔ صبا اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی۔ کسی مجرم کی طرح اس نے پھپھو کی جانب دیکھا۔

''ادھر کیا دیکھ رہی ہو۔'' سہیل کے فقرے نے اسے چونکا دیا۔ ''یہ لو ساتھ بسکٹ بھی کھاؤ۔'' پیالی اس کے ہاتھ میں دینے کے بعد بسکٹوں کی پلیٹ اس نے صبا کی طرف بڑھائی۔

''نہیں۔نہیں۔''

بے اختیار صبا کی سہمی سہمی نگاہیں پھر پھپھو کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کے ہاتھ میں پکڑی پیالی اتنی لرز رہی تھی کہ چائے چھلک کر پلیٹ کو بھر رہی تھی۔

''نہیں کیوں نہیں۔'' سہیل نے کڑے تیور سے اسے دیکھا۔

''مجھے بھوک نہیں۔'' وہ کپکپائی آواز میں بدبدائی۔

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہیں بھوک ہے یا نہیں چلو اٹھاؤ بسکٹ۔''

اس نے کانپتا ہاتھ بڑھایا اور ڈرتے ڈرتے ایک بسکٹ لے لیا۔ مگر اس کی نظریں بھی پھپھو کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں جس سے صاف عیاں تھا کہ انہیں یہ سب اچھا نہیں لگ رہا صبا پر مزید کپکپی طاری ہو گئی۔

''کریمن! او کریمن!! کہاں مر گئی ہو؟'' حالانکہ اس وقت کوئی کام نہیں تھا مگر پھپھو خواہ مخواہ ہی چلا چلا کر کریمن کو پکارنے لگیں۔ ''جانے کب اس اپاہج سے اسے چھٹکارا ملے گا۔'' آخر کسی نہ کسی پر تو انہیں اپنا غصہ اتارنا ہی تھا۔ سہیل کے سامنے صبا کو کچھ بھی نہ کہہ سکیں جو سامنے بیٹھی کیسی دیدہ دلیری سے کٹر کٹر بسکٹ چبا رہی تھی۔ ان کا کہیں بس چل جاتا کاش! صرف دو منٹ کے لیے ہی سہیل کہیں ادھر اُدھر ہو جاتا تو اسی طرح، جس طرح وہ بیٹھی بسکٹ چبا رہی تھی، بلقیس اسے چبا ڈالتیں۔ اس وقت ان کا دل بس یہی چاہ رہا تھا اور جب دل کی خواہش پوری نہ ہو تو بے بسی ایسی ہی عجیب وغریب حرکات کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

''غزالہ! او غزالہ کی بچی!! تو کمرے میں گھسی کیا کر رہی ہے؟''

سہیل سر جھکائے دھیرے دھیرے مسکرائے جا رہا تھا۔

''امی!''

''کیا ہے؟'' بلقیس نے بڑے تیکھے پن سے جواب دیا۔

''غزالہ کی شادی کب کر رہی ہیں؟''

وہ ایک دم چونک اٹھیں۔ انہیں یہ فقرہ سہیل کے منہ سے نکلا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے تو کبھی گھر کے معاملے میں دخل نہیں دیا تھا۔ بس آتا اور شور شرابے میں ہی چھٹیاں گزار کر چل دیتا۔ بلقیس نے کئی بار اس کی توجہ اس طرف دلائی بھی تھی کہ وہ اب

جوان تھا اور اسے کچھ سنجیدہ ہو کر گھر کے معاملات میں دلچسپی لینا چاہیے تھی مگر اس پر ماں کے سمجھانے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

''میں کیا پوچھ رہا ہوں؟'' سہیل نے ماں کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کیوں تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کیا آپ بتانا نہیں چاہتیں؟''

''نہ بتانے کی کیا وجہ ہے اور کیا تمہیں سے چھپاؤں گی؟''

بلقیس کے لہجے میں کچھ نرمی آ گئی۔ سہیل نے موضوع ہی ایسا چھیڑ دیا تھا۔ غزالہ کی شادی کا ذکر ہوا اور ان کے چہرے پر مسکراہٹیں نہ پھیلیں۔

''میں تو ابھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک ہی تو بچی ہے اس کے جانے سے تو میرے گھر کی رونق ہی ختم ہو جائے گی۔'' بلقیس کا غصہ بالکل کافور ہو چکا تھا اور اب ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دھیرے دھیرے مسکرا رہی تھیں۔ ''مگر عدنان کی امی بہت جلدی کر رہی ہیں کہتی تھیں غزالہ کے بغیر اب ایک پل کو بھی جی نہیں لگے گا۔'' یہ کہتے کہتے ان کی مسکراہٹ بے قابو ہو کر سارے چہرے پر پھیل گئی۔

''تو پھر آپ نے کیا جواب دیا؟''

''میں کہتی بھی کیا منگنی ہو جائے تو لڑکی پرائی ہو جاتی ہے۔''

''یہ تو مجھے بھی علم ہے کہ نسبت طے پا جائے تو لڑکی پرائی ہو جاتی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ پھر طے کیا پایا؟'' ماں سے بات کرتے کرتے اس نے ایک اور بسکٹ صبا کے ہاتھ میں دے دیا اس نے دزدیدہ نگاہوں سے پھر پھپھو کو دیکھا۔ مگر اب وہ اس کی طرف متوجہ نہ تھیں۔

''بڑی مشکل سے انہیں مہینے ڈیڑھ تک لائی ہوں ورنہ وہ تو اگلے ہفتے ہی برات لانے کو کہہ رہی تھیں۔''

''اچھا تھا میری چھٹیوں میں ہی کر دیتیں۔ ملازمت کا معاملہ ہے پھر کیا پتہ چھٹی ملے نہ ملے۔'' سہیل نے چائے کی پیالی خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

''ارے ہاں۔ اس کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔''

''جی ہاں آپ کو میرا خیال کیوں آنے لگا آپ کی تو بس ایک ہی اولاد ہے اور وہ ہے غزالہ۔ میں آپ کا کیا لگتا ہوں۔''

''چل ہٹ شریر کہیں کا۔ تجھے تو میں نے پھینکا ہوا ہے نا۔'' بلقیس کی آنکھوں میں ایک دم ہی بیٹے کے لئے پیار امنڈ آیا۔ ''سن رہی ہو اماں' اس کی باتیں۔'' انہوں نے ہنستے ہوئے ماں کو مخاطب کیا مگر وہ تو سوئی ہوئی تھیں۔ بلقیس پھر سہیل کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ''پگلے! تو ہی تو میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ لڑکیوں کا کیا ہے وہ تو دوسرے گھر کی رونق ہوتی ہیں۔''

''امی!'' سہیل کے چہرے پر یک لخت سنجیدگی پھیل گئی۔ ''غزالہ کے ساتھ ہی صبا کی شادی بھی کر دیجئے۔''

''کیا؟'' بلقیس کے مسکراتے چہرے پر ایک دم حیرتوں نے ڈیرے ڈال دیئے۔

صبا نے چونکتے ہوئے سہیل کی جانب دیکھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے ماں کی طرف متوجہ تھا۔ ''امی! اس میں اتنا حیران ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ غزالہ کی عمر اگر شادی کی ہے تو صبا بھی تقریباً اتنی ہی عمر کی ہے۔ اچھا ہے دونوں فرض اکٹھا ہی ادا ہو جائیں گے۔''

بلقیس نے نہ جانے کیسے اس وقت خود کو قابو میں رکھا تھا۔

''تم خود ہی سوچو اس کے ساتھ شادی کرانے کو کون راضی ہوگا۔''

''کیوں اس میں کیا عیب ہے؟''

''اب تم جانتے ہوئے بھی انجان بنو تو پھر میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' بلقیس کا لہجہ اُلجھا اُلجھا سا تھا اور وہ آنکھوں کے گوشوں سے صبا کو گھور رہی تھیں۔

''میں سب کچھ جانتا ہوں۔'' سہیل نے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

''جب خود ہی سب کچھ جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟'' بلقیس تلخی سے بولیں۔

"اگر اور کوئی اس کے ساتھ شادی کرانے کو تیار نہیں ہوتا تو کیوں آپ اسے اپنی بہو نہیں بنا لیتیں۔"

"سہیل!" بلقیس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"سہیل بھائی!" صبا کے ہاتھ سے پیالی گری اور ایک چھناکے سے ٹوٹ گئی اس کی ننھی ننھی کرچیاں ہر طرف پھیل گئیں۔ اس نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ کوئی بھی اس کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

"خدا نہ کرے جو میں اسے اپنی بہو بناؤں۔" چند لمحوں بعد بلقیس اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"یہ تو اب ہو کر ہی رہے گا امی! میں اسی لئے واپس جا رہا ہوں۔ دو تین دن میں وہاں مکان وغیرہ کا بندوبست کر کے آؤں گا اور پھر۔" ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے صبا کے لرزتے وجود کو دیکھا۔

"صبا میرے ساتھ جائے گی اور آپ کی بہو بن کر۔"

"سہیل بھائی!" صبا کی آواز یوں سنائی دی جیسے وہ کسی گہرے کنوئیں سے بول رہی ہو۔

"تم چپ رہو صبا!" سہیل نے بڑے پیار سے اسے دیکھا۔ "ایسے معاملات میں لڑکی خود نہیں بولا کرتی۔"

"ہاں ہاں نہیں بولا کرتی۔ اسی کے سکھائے سکھائے تو تم آج ماں کے سامنے ہو بیٹھے ہو۔" بلقیس کی آواز اتنی بلند تھی کہ غزالہ اور کریمن بھاگی بھاگی آ گئیں۔

"کیا ہوا امی؟"

"بیگم صاحبہ! خیر تو ہے؟"

"اب خیر کہاں۔ جس بات کا مجھے خدشہ تھا وہی ہوئی۔ ڈائن نے ڈال دیا نا میرے کلیجے پر ہاتھ۔"

"امی! اس بیچاری کو آپ خواہ مخواہ ہی کوس رہی ہیں جو کچھ کہنا ہے مجھے کہیں اس

کا کوئی قصور نہیں۔"

"کیا ہو گیا کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔"

دادی اماں ان کی بلند ہوتی ہوئی آوازوں سے بیدار ہوتے ہوئے نحیف لہجے میں بولیں۔

"اماں! بس کچھ نہ ہی پوچھو تو بہتر ہے۔" بلقیس بین کرنے کے انداز میں بولیں۔

"سہیل یہ کبھی نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں۔"

"یہ تو امی! اب ہو کر ہی رہے گا۔"

سہیل کا فیصلہ ہمیشہ ہی اٹل ہوتا تھا اور سب جانتے تھے۔ اس کی ضد تو سارے خاندان میں مشہور تھی۔

"دیکھ سہیل! اپنی اس ضد سے باز آ جا ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔"

"اچھے فیصلے کا انجام ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔" سہیل نے بڑی خوداعتمادی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ گاڑی چھوٹنے والی تھی اس لیے جلد جلد بکس میں کپڑے ٹھونسنے لگا۔

اور بلقیس۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ بے تکان بولے جا رہی تھیں صبا تھر تھر کانپ رہی تھی۔ دادی اماں بڑی تیزی سے آنکھیں جھپک رہی تھیں اور غزالہ اور کریمن ہکا بکا کھڑی تماشا دیکھ رہی تھیں۔

13

بلقیس بے تکان بولے جا رہی تھیں مگر ان کا غصہ کسی بھی طرح ٹھنڈا ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

صبا اپنے کمرے میں سہمی بیٹھی تھی۔ پھپھو کی آواز برابر اس کے کانوں میں آ رہی تھی اور اسے مزید خوف زدہ کئے دے رہی تھی۔ نجانے پھپھو کیا کرنے والی تھیں ان کے اگلے قدم کے متعلق وہ بالکل نہیں جانتی تھی کہ کدھر پڑنا تھا فی الحال تو وہ منہ بھر بھر کر اسے ہی کوس رہی تھیں کہ اس نے ان کے اچھے بھلے فرمانبردار بیٹے کو ورغلا لیا تھا۔

سہیل کو گئے تین چار گھنٹے گزر چکے تھے نہ پھپھو نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا اور نہ ہی ایک لمحہ کے لیے آرام کیا تھا بس مسلسل بولے جا رہی تھیں اور ان کو دیکھ کر صبا جو پہلے ہی دو دن کی بھوکی تھی، ایک اور فاقہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجرم بیٹھ کر کھانا کھائے اور وہ، جس کا کہ اس نے جرم کیا تھا اس کے سامنے بھوکا پیاسا بیٹھا رہے اور وہ اسی احساس تلے دبی اپنے کمرے میں سہمی بیٹھی تھی۔

''بلقیس بیٹی! اب صبر کر۔ کیا معلوم خدا آپ ہی کچھ بہتری کر دے۔'' جب بلقیس کا واویلا حد سے تجاوز کرنے لگا تو دادی اماں اپنی نحیف آواز میں بیٹی کو دلاسہ دینے لگیں۔

''ہاں ہاں۔ اب تم بھی مجھے صبر ہی کی تلقین کرنے لگ جاؤ۔'' بلقیس بپھر اٹھیں۔

''جس کے کلیجے کو ہاتھ پڑے کچھ اسے ہی معلوم ہوتا ہے۔ تم کیا جانو میرا کیا حال ہو رہا ہے۔''

''وہی تو کہہ رہی ہوں بیٹی! اس طرح ہلکان ہونے سے فائدہ؟ دو تین دن میں سہیل آ جائے گا تو اسے سب ہی سمجھائیں گے۔'' دادی اماں بڑی ملائمت سے بولیں۔ وہ بیٹی کے آگے ہمیشہ دب جایا کرتی تھیں۔ اب یہی تو ایک ان کی اولاد تھی۔ اور بلقیس ان کے اسی جذبے کو بلیک میل کر کے ہر جائز و ناجائز بات منوا لیا کرتیں۔ ''مجھے یقین ہے وہ ضرور سمجھ جائے گا اور اگر پھر بھی وہ اپنی ضد سے باز نہ آیا تو تم زہر کھا لینا۔'' انہوں نے بڑے رازدارانہ بیٹی کو سمجھایا۔

''زہر کھا لوں؟'' بلقیس نے ایک دم سہم کر پھیلی پھیلی آنکھوں سے ماں کو دیکھا اس ماں کو، جس کی وہ واحد اولاد تھی اور جو اس سے بے پناہ محبت کا دم بھرتی تھی۔ وہ یہ کہہ

رہی تھی۔ ''اماں! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

موت کے تصور نے ہی بلقیس کے جسم میں کپکپی طاری کر دی۔ انہوں نے گھبرا کر مدافعتی انداز میں بازو اپنے سینے پر جکڑ لئے جیسے سچ مچ کوئی ان کی جان عزیز نکال رہا ہو۔

''پاگل ہوئی ہو!'' دادی اماں گویا بیٹی کی نادانی پر مسکرا پڑیں۔ ''کیا سچ مچ ہی ہم تمہیں زہر کھا لینے دیں گے؟ ارے وہ تو صرف سہیل کو ڈرانے کے لئے ہوگا اسے تم سے بہت پیار ہے وہ یقیناً اپنی ہٹ چھوڑ دے گا۔''

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' بلقیس بڑے مدھم لہجے میں بدبدائیں ماں نے داؤ تو ایسا شاندار بتایا تھا کہ اگر آزمایا جائے تو نتیجہ خاطر خواہ نکل سکتا تھا۔ سہیل کو واقعی ماں سے اتنی ہی محبت تھی یہ سب ہی جانتے تھے۔ وہ گہری سوچوں میں غرق ہو گئیں اور تصور ہی تصور میں اس ڈرامے کے مختلف مناظر کو دیکھنے لگیں، جو سہیل کی آمد پر ہونے والا تھا آپ ہی آپ کبھی ان کی آنکھوں میں جلال چھا جاتا اور کبھی وہ زیر لب مسکرانے لگ جاتیں۔

''کریمن! او کریمن!!'' دادی اماں بیٹی کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو غور سے دیکھتے ہوئے ملازمہ کو پکارنے لگیں۔

''جی ابھی آئی۔'' اور پھر چند لمحوں بعد وہ ان کے حضور کھڑی تھی۔

''جا بیگم کے لئے کھانے کو کچھ لا۔'' ماں کی مامتا بیٹی کو زیادہ دیر کیسے بھوکا پیاسا دیکھ سکتی تھی۔

''رہنے دو مجھے بھوک نہیں ہے۔''

مگر اب بلقیس کے انکار میں انکار نہیں تھا محض وضع داری تھی۔ کریمن وہیں کھڑے ہو کر دادی اماں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''کھڑی ٹکر ٹکر دیدے کھول کر مجھے کیا دیکھ رہی ہو۔ کہہ جو رہی ہوں کہ کھانا نکال کر لاؤ۔'' دادی اماں نے بیٹی کی حمایت میں کریمن کو ڈانٹا۔

''وہ۔ وہ۔'' کریمن سہم سی گئی۔ ''بیگم کہہ رہی ہیں انہیں بھوک نہیں۔''

''اور میں کیا بکواس کر رہی ہوں۔'' وہ کریمن کی ناسمجھی پر جھنجھلا گئیں۔

''جی اچھا لاتی ہوں۔''

''سن کریمن! ذرا چپاتیاں گرم کر کے گھی لگا دینا۔'' بلقیس چپ چاپ ماں کے احکامات سنتی رہیں۔

تھوڑی دیر بعد کریمن گرم گرم کھانا لئے آ گئی۔ بلقیس نے بلا حیل و حجت سینی اپنے قریب سرکائی اور پھر گھی سے تر گرم گرم نوالے بڑی تیزی سے ان کے حلق سے نیچے اترنے لگے۔

اور صبا بے چاری اسی طرح بھوکی بیٹھی اپنی قسمت پر آنسو بہا رہی تھی کہ اچانک اس کے دماغ میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا اور اس کی حیات کی تاریک راہیں منور کر گیا۔ وہ جو جنم جنم سے ہی ایسی پھوٹی قسمت لئے دنیا میں آئی تھی وہی کیوں نہ زہر کھا کر خود بھی سب دکھوں سے نجات حاصل کر لے اور دوسروں کو بھی جو اس کی وجہ سے پریشانیاں مل رہی تھیں انہیں بھی چھٹکارا دلا دے۔ یہ سارا ہنگامہ اسی کی وجہ سے تو کھڑا ہوا تھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' اس نے بڑے عزم سے سر ہلایا اور اس کے حسین چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''پھپھو آپ کو زہر کھا لینے کی دھمکی نہیں دینا پڑے گی۔'' وہ اپنے آپ ہی بڑبڑائی۔ ''وہ میں خود ہی کھا لوں گی اور سہیل بھائی کے آنے سے پہلے پہلے' آپ فکر نہ کریں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا سب کچھ عین آپ کی خواہش کے مطابق۔''

وہ دل میں عزم مصمم لئے اٹھ کر کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی کبھی رک کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی جہاں سے وہ اکثر سب کی نظریں بچا کر بچوں کو پیپل کے نیچے کھیلتے دیکھا کرتی تھی۔ اس کے چہرے پر حسرت تھی اور آنکھوں میں آنسو۔ آخر وہ کس لئے دنیا میں آئی تھی۔ آج تک کوئی بھی تو اس کی خواہش پوری نہ ہوئی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ یونہی کھڑی سوچتی رہی اور بلامقصد ہی اس پرانے پیپل کو گھورتی رہی۔

دن کا باقی حصہ اس نے یونہی بے چینی اور بے قراری میں گزارا۔ کبھی ٹہل کر' کبھی کھڑکی میں کھڑے ہو کر۔ کبھی بیٹھ کر اور کبھی چارپائی پر اوندھے منہ لیٹ کر آنسو بہاتے ہوئے۔

اور پھر دن گزر گیا، مگر بڑی مشکل سے۔ صدیوں کے برابر ہو کر گزرا تھا۔ رات کے گیارہ بج گئے گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

رات کے کھانے کے لئے بھی اسے کسی نے نہ پوچھا تھا۔ پچھلے دو دن تو خود اس کا اپنا ہی جی کچھ کھانے کو نہ چاہا تھا لیکن اس وقت اسے بڑی سخت بھوک محسوس ہو رہی تھی۔

وہ دبے دبے پاؤں کمرے سے باہر نکلی برآمدے میں دادی اماں کے خراٹے گونج گونج کر ان کی موجودگی کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باورچی خانے تک پہنچ گئی بڑی آہستگی سے دروازہ بند کر کے اس نے بجلی جلائی بھوک تھی کہ اسے تڑپائے دے رہی تھی۔ جو کچھ بچا کھچا اسے ملا وہ بڑے مزے سے بیٹھ کر کھانے لگی۔

کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ ایسی جرات کبھی نہ کر سکتی کہ صبح اٹھ کر سب کو کیا جواب دیتی مگر آج اسے ایسی کوئی فکر نہ تھی۔ یہ اس کی زندگی کی آخری رات تھی اس کی صبح تو ہونا ہی نہیں تھی پھر اس سے کس طرح باز پرس ہو سکتی تھی۔ اور اسی اطمینان نے اسے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیا۔ کھا پی کر برتنوں کو ویسے ہی چھوڑ کر دبے دبے پاؤں باہر نکلی اب اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا تھا اور اس کے لئے وہ راستہ بھی ڈھونڈ چکی تھی۔

کچھ ہی دن پہلے کی بات تھی وہ سہیل کے کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی اور قریب ہی وہ چھوٹی بڑی بہت ساری ٹیوبیں اور شیشیاں پھیلائے بیٹھا رنگ برنگے سیال اور محلول اِدھر اُدھر انڈیل کر نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی کرنے کے بعد کسی تجربہ گاہ میں ملازم تھا۔ چھٹیوں میں جب گھر آتا تو اکثر فالتو وقت میں یونہی بیٹھا کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ یہ اس کا مشغلہ تھا۔

اس دن بھی وہ کسی تجربہ میں مصروف تھا اور صبا بار بار اپنا سبق چھوڑ کر اسے دیکھنے لگ جاتی۔ مزہ بھی تو بہت آتا تھا۔ سہیل کبھی چپ چاپ سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہتا اور اس کی محویت کی طرف کوئی توجہ نہ دیتا اور پھر کبھی اسے ڈانٹ دیتا کہ سبق پڑھنے کی بجائے کیوں وہ اِدھر اُدھر اپنا وقت ضائع کر رہی تھی کہ اچانک اس نے اسے سبق پڑھتے میں مخاطب کیا۔ ''صبا یہ چھوٹی سی شیشی دیکھ رہی ہو نا۔''

وہ جلدی سے کتاب سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''ہاں کیا ہے اس میں؟''

''یہ ایک قسم کا زہر ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کے کھانے سے اتنی جلدی موت واقع ہوتی ہے کہ آج تک اس کے ذائقے کا بھی پتہ نہیں چل سکا۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے آنکھیں جھپک جھپک کر سہیل کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ذائقے کا کیوں نہیں پتہ چل سکا۔'' اس کی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیلی جا رہی تھیں۔

''پاگل۔'' سہیل اس کی ہیت کذائی پر ہنس دیا۔ ''کہا جو کہ اس لئے کہ زبان پر رکھتے ہی انسان مر جاتا ہے اتنی جلد کہ محسوس کر کے بتانے سے بھی پہلے!''

''اچھا! اچھا!!'' اس نے سر ہلایا جیسے وہ سب کچھ بڑی اچھی طرح سمجھ گئی ہو اور پھر بڑی متوحش نگاہوں سے سہیل کے ہاتھ میں پکڑی اس چھوٹی سی شیشی کو دیکھنے لگی۔

پھر اچانک جانے اسے کیا سوجھا کہ مسکراتے ہوئے سہیل سے بولی۔ ''بھائی جان! یہ شیشی مجھے دے دیجئے شاید کبھی اس کی ضرورت پڑ جائے۔''

''ہش پگلی!'' سہیل نے بڑے زور سے گھورا۔ ''کیا حرام موت مرو گی انسان کی یہ حرکت اللہ میاں کو اور ہر بری حرکت سے زیادہ ناپسند ہے اس حرکت کے مرتکب ہونے والے کو وہ کبھی نہیں بخشتا۔ کبھی بھی نہیں۔ بس سیدھا جہنم میں جھونک دیتا ہے۔'' پھر سہیل نے بڑے پیار سے اسے فہمائش کی۔ ''ایسا خیال کبھی بھول کر بھی دل میں نہ لانا اچھا۔ سمجھ گئی ہو نا؟''

اور اس نے بڑے خلوص سے سر ہلا کر 'ہاں' کہہ دیا تھا۔

اور ان چند دنوں میں ہی اس پر ایسے ایسے مرحلے گزر چکے تھے کہ اسے اب اس جہنم کا بھی خوف نہیں رہا تھا جس سے اس دن سہیل نے اسے ڈرایا تھا۔ اس کے برعکس وہ تو زندگی پا کر کئی جہنموں کا عذاب بھگت چکی تھی۔ اور اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ خدا کا جہنم بھی اتنا غضب ناک نہیں ہوگا کہ وہ بھی رحیم و کریم ہے مگر انسان! وہ جب مظالم پر اتر

آئے تو حدیں ہی پار کر جاتا ہے!

وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتے ہوئے سہیل کے کمرے میں پہنچ گئی۔ چونکہ اس کا کمرہ آخری سرے پر تھا اس لئے ذرا سی آواز پیدا ہونے سے کسی کے جاگ جانے کا خطرہ نہ تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے بجلی جلاتے ہوئے الماری کی سمت بڑھی۔

''اوہ!'' وہ وہیں ٹھٹک گئی۔ وہاں تو خاصا بڑا قفل پڑا ہوا اس کا منہ چڑا رہا تھا مگر کچھ بھی ہو آج تو جیسے اپنے آہنی عزم کے آگے ہر قفل اسے بے حقیقت دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے سہیل کے کپڑوں والا بکس کھول کر اس کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ مگر وہاں بھی اسے مایوسی کا ہی منہ دیکھنا پڑا لیکن اس کے عزم میں پھر بھی کمزوری پیدا نہ ہوئی بکس کے بعد اس نے کتابوں کی شیلف' میز کی درازیں' غرض کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا مگر کہیں بھی اسے چابی نہ ملی شاید وہ ساتھ لے گیا تھا۔

مایوس ہونے کے بعد وہ پریشان ہوتے ہوئے اس کے پلنگ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ''اب کیا کروں؟'' وہ بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی۔

سہیل کے آنے پر جو ہنگامہ کھڑا ہونے والا تھا اس کا تصور ہی اسے خوف زدہ کئے دے رہا تھا۔ وہ اپنے میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے پھر اٹھ پڑی۔ ایک آخری کوشش اور یونہی بے یقینی کے انداز میں ہی اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال دیا اور پھر ایک دم اس کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ تین چار چابیوں کا ایک گچھا وہاں پڑا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے اسے گرفت میں لے لیا۔ جیسے وہ کوئی قیمتی نایاب چیز ہو اور لپک کر الماری تک جا پہنچی۔ ایک کنجی لگائی۔ مگر وہ الماری کی نہیں تھی پھر دوسری آزمائی اور اب اس کے چہرے پر قدرے پریشانی کے آثار تھے وہ بھی اس قفل کی نہیں تھی بڑی دعاؤں اور آس کے ساتھ اس نے تیسری چابی انگلیوں میں پکڑی اور وہ قفل میں گھوم گئی۔ اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ سامنے ہی وہ چھوٹی سی شیشی پڑی ہوئی تھی۔ وہی' جو کچھ ہی دیر بعد اس کے درد کا مداوا بننے والی تھی اسے تمام دکھوں اور

مصیبتوں سے نجات دلانے والی تھی۔

چہرے پر مسرت بھری مسکراہٹ لئے اس نے وہ شیشی مٹھی میں دبالی اور پھر بڑی احتیاط سے الماری بند کر کے، ہر چیز واپس اس کی جگہ پر رکھ کر، وہ اسی طرح دبے قدم اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس نے دروازے کو اندر سے چٹخنی بھی نہیں لگائی کہ توڑنا نہ پڑے۔ خواہ مخواہ سب کو تکلیف ہوگی اور پھر اسے کوستے رہ جائیں گے کہ مرتے وقت بھی مصیبت ڈال گئی۔

وہ یہ سوچتے ہوئے اپنی چارپائی پر جا بیٹھی اور اس کا ذہن ماضی کی تکلیف دہ یادوں میں ڈوبنے، ابھرنے لگا۔ ناکام حسرتوں اور تشنہ تمناؤں کے مجموعہ کا نام ہی تو اس کا زندگی تھا۔

اس نے پریشان ہوتے ہوئے شیشی کا ڈھکنا کھولا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے کانوں میں سہیل کے فقرے گونج گئے کہ خودکشی سب سے بڑا گناہ ہے اور اس کا مرتکب ہونے والا سیدھا جہنم رسید ہوتا ہے۔

اس کا ہاتھ کانپ گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا ماضی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔

''نہیں نہیں اس سے بڑا جہنم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔''

وہ جلدی سے شیشی کو ہونٹوں تک لے گئی اور ابھی ایک قطرہ اس کے منہ میں نہیں ٹپکا تھا کہ اس کے دماغ کے کسی کونے میں ایک خیال رینگ گیا۔

''آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھے دنیا میں بھی جہنم ملا اور آخرت میں بھی اب ملے گا میرا قصور کیا ہے؟'' اس کا ہاتھ دھیرے سے نیچے سرک گیا۔ ''گناہ میری ماں کا تھا کیا اسے کوئی بھی سزا نہ ملے گی اور میں جو سراسر بے قصور ہوتے ہوئے قصوروار بنی جا رہی ہوں کیا ہر دکھ ہر سزا میرے ہی لئے ہے۔'' وہ بڑی محویت سے سوچ رہی تھی۔ ''نہیں نہیں اسے بھی کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنا چاہیے۔ وہی تو میری زندگی کی بربادی کا موجب بنی۔ ہر دکھ ہر تکلیف مجھے اسی کی وجہ سے تو مل رہی ہے۔''

وہ بے اختیار ہو کر خیالات کے سمندر میں بہی چلی جا رہی تھی۔

''میں اس سے انتقام لئے بنا جان نہیں دوں گی۔ اس نے مجھے جنم دے کر جہنم کے اندر پھینک دیا۔ اور خود جانے کہاں عیش کرتی پھر رہی ہے۔ میں، جو اس آگ میں جلتی رہی۔ میرا ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی کے برابر ہو کر گزرا۔ کس طرح خاموش رہ سکتی ہوں۔ ایک زندگی سے کھیلنا بھلا کوئی جرم ہی نہیں اور وہ مجرم ہے میں اسے سزا دوں گی میں اس سے اپنی زندگی کی تباہی کا انتقام لوں گی۔'' اس کا دماغ پاگل ہو ہو کر سوچے جا رہا تھا اس نے پریشان ہو کر گھٹنوں میں چہرہ دبالیا۔

لیکن اس کو کہاں پاؤں؟ معلوم نہیں وہ کہاں ہوگی۔ کچھ بھی ہو مجھے تب تک قرار نہیں ملے گا جب تک اسے تلاش کر کے اپنا انتقام نہ لے لوں۔ خواہ اس کے لئے مجھے دنیا کی خاک کیوں نہ چھاننا پڑے۔ میں اسے ڈھونڈوں گی۔ میں اسے تلاش کروں گی اور پھر۔ اس نے سر اونچا کر کے مٹھی میں دبی ہوئی شیشی کو بڑے پیار سے دیکھا۔ پھر اس کے سامنے بیٹھ کر یہ جاؤں گی اسے سب کچھ بتا کر موت کو گلے لگاؤں گی یقیناً اس کے لئے یہ بہت بڑا انتقام ہوگا کہتے ہیں نا کہ ماں اولاد کی تکلیف نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دوں گی یقیناً اس کے لئے یہ بہت بڑی سزا ہوگی۔

اس نے ایک عزم سے اردگرد نگاہ دوڑائی اور پھر ماں سے انتقام لینے کی تیاری میں مصروف ہوگئی۔

14

دادی اماں چارپائی پر دراز تھیں اور بلقیس ان کے پاس بیٹھیں بڑے رازدارانہ انداز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ جواب میں کبھی دادی اماں اپنا سفید بالوں والا سر زور زور سے ہلانے لگتیں اور کبھی صرف آنکھیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھتی رہتیں۔

کمرے کے دروازے میں چند لمحے کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی پھر دھیرے

دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے ان کی طرف بڑھی۔ قدموں کی چاپ پر پھپھو نے سر اٹھایا۔ صبا بغل میں ایک چھوٹی سی گٹھڑی دبائے چلی آ رہی تھی۔ دادی اماں کی پشت اس کی طرف تھی بلقیس کی نگاہوں میں حیرت دیکھ کر تجسس کے مارے جلدی سے انہوں نے کروٹ بدلی۔

صبا ان کی چارپائی کے قریب پہنچ چکی تھی۔

''دادی اماں! میں جا رہی ہوں۔'' انہوں نے محسوس کیا صبا کی آواز بہت بدلی ہوئی تھی۔

''کیا؟'' وہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔

''میں جا رہی ہوں۔'' اس نے بڑے گھمبیر لہجہ میں اپنی بات دہرائی۔

''کہاں؟''

''بس! جہاں عافیت کی جگہ ملی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔'' دادی اماں متحیر سی اسے دیکھ رہی تھیں۔

''میری وجہ سے جو اس گھر میں ہنگامہ برپا ہوا ہے وہ اسی طرح فرو ہو سکتا ہے۔'' وہ بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔

''پہلے خود ہی اسے سکھایا پڑھایا اور اور اب چلی ہے جھگڑا مٹانے پھاپھا کٹنی!'' پاس سے بلقیس نے بڑی حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھپھو!'' وہ جو ہمیشہ ہی سہمی سہمی رہتی تھی اور کبھی کسی کے آگے بول نہیں سکتی تھی اس وقت بڑے جلال میں تھی۔ بلقیس کی بات پر اسے سخت غصہ آ گیا۔ بڑی دلیری سے بولی۔ ''آخر کوئی حد بھی ہوتی ہے اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی آپ کو چین نہیں آیا؟'' غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آواز بھی کافی بلند تھی۔

''کیوں میں نے کیا کیا ہے؟'' صبا کا سرخ چہرہ دیکھ کر بلقیس قدرے دھیمی پڑ گئیں۔

''کون سا ایسا عیب ہے جو آپ نے مجھ بے گناہ میں نہیں ڈالا۔''

''جو جیسا ہوا سے ویسا ہی دنیا کہتی ہے۔'' بلقیس نگاہیں نیچی کر کے بڑبڑائیں۔

''قسم کھا کر کہیں آپ نے کبھی میرا کوئی عیب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟'' صبا نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

بلقیس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کر خاموش ہو گئیں۔

''آپ کبھی قسم نہیں کھائیں گی پھپھو! مجھے یقین ہے اور خود آپ کو بھی علم ہے کہ آپ جو کچھ میرے خلاف پھیلاتی رہتی ہیں اس میں ذرہ بھر بھی سچائی نہیں ہوتی۔'' صبا جب دل میں ٹھان چکی تھی کہ وہ اب کسی صورت یہاں نہیں رہے گی تو پھر کسی سے ڈرنے کی اسے ضرورت کیا تھی۔ کیوں نہ دل کا غبار اچھی طرح نکال لے۔ اور اس جذبے نے آخر اس کی زبان کھلوا ہی دی۔

''آپ کو یہ بھی علم ہے اس دن کسی اجنبی کے ساتھ کوٹھے پر میں نہیں بلکہ غزالہ تھی۔ لیکن آپ نے سارا الزام مجھ پر رکھ دیا تھا محض اس لئے کہ آپ کی بیٹی جو شریف ماں کی اولاد ہے بدنام نہ ہو اور میں۔'' اس نے بڑے دکھ سے دادی اور پھپھو کو دیکھا۔

''میرے تو بدنامیاں اور رسوائیاں جنم جنم سے ہی پلے بندھی ہیں۔ میرا کیا ہے میں تو آپ کی نگاہ میں اسی قابل تھی اور پھر.....'' اس کی آنکھوں میں غیظ چھا گیا۔

''پھر عدنان کی ماں اس گھر میں آئیں۔ مجھے معلوم ہے وہ کیا مقصد لے کر یہاں آئی تھیں اور پھر آپ نے کیا کیا داؤ کھیلے میں سب جانتی ہوں۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' بلقیس کے جھکے ہوئے سر کو دادی اماں نے حیرت سے دیکھا۔ ''بلقیس کچھ مجھے بھی تو بتاؤ یہ صبا کیا کہہ رہی ہے؟''

''کچھ نہیں دادی اماں!'' اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ''آپ پوچھ کر کیا کریں گی جو ہونا تھا ہو چکا۔'' اس نے پھر بلقیس کی طرف نگاہ پھیری ''اور پھپھو! اب ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے مگر اس کا کوئی حل آپ پا نہیں سکیں گی۔ سہیل بھائی بہت ضدی ہیں آپ لاکھ زہر کھانے کی دھمکیاں دیں سب ہی جانتے ہیں آپ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ آپ سچ مچ کھا لیں گی۔ صرف دھمکیوں سے کون ڈرتا ہے۔''

تلخی بھرا تبسم اس کے لبوں پر پھیل گیا۔ وہ پھر بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ''پھپھو! یقین کیجئے آپ کے بیٹے کو میں نے کچھ نہیں سکھایا اس لئے کہ میں نے کبھی ایسا سوچا ہی نہیں تھا۔ ایک پل، ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں، سہیل بھائی نے جو فیصلہ کیا ہے صرف اپنی مرضی سے اور اس کا صرف یہی حل ہے کہ میں اس گھر کو خیر باد کہہ دوں۔''

یہ کہتے کہتے وہ پلٹی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی زینے کی جانب چلی۔

''صبا! رک جاؤ۔'' دادی اماں زور سے چلائیں۔ ''کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔''

''پہلے کون سی میری زندگی بڑی خوشگوار ہے۔''

''صبا! تم بعد میں پچھتاؤ گی نہ جاؤ۔''

''نہیں دادی اماں میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔'' اور اس کے قدم بڑھتے ہی گئے۔

''تم نہیں جانتیں زمانہ بہت خراب ہے۔ تباہ ہو جاؤ گی، برباد ہو جاؤ گی۔ رک جاؤ۔'' دادی اماں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر نقاہت کی وجہ سے اٹھ نہ سکیں۔ ''بلقیس روکو اسے۔'' انہوں نے پاس بیٹھی بلقیس کو جھنجھوڑ ڈالا۔ گھر سے قدم باہر نکالنے کی یہ اس کی عمر نہیں ہے۔ کیوں تباہی کے منہ میں جا رہی ہے۔ اسے کچھ سمجھاؤ۔''

لیکن بلقیس چپ چاپ بیٹھی رہیں ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ جاتی تھی تو جائے ان کی بلا سے۔ وہ اس وقت بے حد غصے میں تھیں ابھی کیسے ان کے منہ در منہ ہو رہی تھی اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنا رہی تھی۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے اور صبا کے سچ کی تلخی نے انہیں اور بھی اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ ان کی دانست میں اب اس کا گھر سے چلے جانا ہی بہتر تھا نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ سہیل کی ضد کا جب آپ ہی آپ حل نکلا آ رہا تھا تو پھر وہ کیوں اسے روکتیں، سارا جھگڑا ہی ختم ہوا جا رہا تھا۔

دادی اماں نے دیکھا کہ بلقیس بڑی مطمئن سی بیٹھی تھیں اور صبا اب زینے تک پہنچ گئی تھی۔ وہ زور زور سے کریمن اور غزالہ کو پکارنے لگیں۔

''کریمن! اری او کریمن! غزالہ! کوئی بھی نہیں سن رہا ارے کوئی ادھر آئے!''

''جی نانی اماں۔'' دور سے غزالہ کی آواز آئی۔

''ابھی آتی ہوں بس یہ ایک صفحہ ختم کر لوں۔''

''نہیں نہیں پہلے آؤ۔'' وہ بڑی عجلت سے بولیں۔ صبا زینہ اتر رہی تھی۔

''اماں! کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ تو ایسے ہی کہہ رہی ہے اور آپ سچ مچ ہی اس کی باتوں میں آ گئیں فکر نہ کریں کہیں نہیں جاتی۔''

''نہیں بلقیس! مجھے اس کے ارادے بہت خطرناک دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھا نہیں کیسا اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پھر ہوتا بھی کیسے نہ! تم نے بھی تو حد کی ہوئی ہے بچپن کی بات اور تھی اب تو وہ کافی ہوشیار ہو گئی ہے سب کچھ سوچنے سمجھنے لگی ہے آخر وہ بھی انسان ہے کہاں تک برداشت کرتی۔'' شاید دادی اماں کا خون جوش مار اٹھا تھا وہ بڑے غصہ سے بیٹی کی جانب دیکھ رہی تھیں۔

''جی ہاں اب سارا قصور میرا ہی ہے۔'' بلقیس منہ پھلا بیٹھیں۔

''غزالہ! غزالہ! اب آ بھی جاؤ۔''

''صبا! بے شک چلی جانا مگر میری ایک بات سنتی جاؤ''

غزالہ کے آنے تک شاید اسی طرح وہ اسے روک سکیں۔

مگر صبا بڑھتی چلی گئی۔ اب تو صرف کوئی غیبی طاقت ہی اسے روک سکتی تھی۔ اس کا عزم اتنا مضبوط تھا!

''کیا ہے نانی اماں؟'' غزالہ سر پیر سے بے خبر بھاگی چلی آ رہی تھی۔

''بھاگ کر نیچے جاؤ اور جس طرح بھی ہو سکے صبا کو باہر جانے سے روکو۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' غزالہ نانی اور ماں کی جانب دیکھنے لگی۔

''یہ بعد میں پوچھنا پہلے تم جلدی سے جاؤ۔'' دادی اماں انتہائی عجلت سے بولیں۔ اور ان کی ہدایت کے مطابق غزالہ بھاگی بھاگی نیچے اتر گئی۔

''کریمن!'' دادی اماں اور بھی بلند آواز میں پکارنے لگیں۔ ''اری او کریمن!

کہاں چلی گئیں تم؟''

کریمن چھت سے بھاگتے ہوئے نیچے اتری۔ ''کیا ہوا خیر تو ہے؟'' وہ دادی اماں کی غیر حالت کو بڑی پریشانی سے دیکھنے لگی۔

''بھاگ کر نیچے جاؤ غزالہ بھی گئی ہے جس طرح بھی ہو سکے دونوں اس کو پکڑو دھکڑ کر اوپر لے آؤ۔'' وہ ایک سانس میں کہہ گئیں۔

''جی بہت اچھا۔'' کریمن مزید کچھ پوچھے بنا تعمیل حکم کے لئے لپکی چلی گئی۔

''توبہ! ایسا بھی کسی کا خون سفید نہ ہو۔'' وہ بیٹی کی جانب غصہ سے دیکھتے ہوئے بڑبڑائیں۔ جو بڑے ٹھسے سے یوں اردگرد سے بے پروا بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''خون ہو بھی۔'' بلقیس اسی طرح رخ پھیرے پھیرے بولیں۔

ماں نے بیٹی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے بھلا کوئی جیت سکتا تھا۔ اور پاؤں کی چاپ پر منتظر نگاہوں سے زینے کی جانب دیکھنے لگیں۔ آگے آگے غزالہ اور پیچھے پیچھے کریمن چلی آ رہی تھیں۔ غزالہ کے چہرے پر بے پروائی اور کریمن کے چہرے پر پریشانی تھی۔ ''ہمیں تو وہ کہیں نظر نہیں آئی۔'' غزالہ دھپ کر کے کرسی پر بیٹھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''ہوا کیا بیگم صاحبہ؟'' کریمن نے پریشانی بھرے متجسس لہجے میں پوچھا۔

''صبا کہیں چلی گئی ہے۔'' بلقیس کا انداز ہمیشہ کی طرح طنزیہ تھا۔

''آخر کو بیٹی کس کی تھی اسی جیسا ہونا تھا نا...... اور بہانہ کیا بنایا کہ ہم سے تنگ آ کر چلی گئی ہے ہونہہ!'' بلقیس مسکرائیں۔ ''پہلے ہی کسی سے وقت مقرر کر رکھا ہوگا۔''

''بلقیس! اب جانے دو۔''

کریمن نے دیکھا دادی اماں کے رخساروں پر آنسوؤں کی قطاریں تھیں۔

''کریمن!'' پھر وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔ ''جا ذرا بھاگ کر معلوم کر گڈو کا باپ گھر ہے؟''

''کیوں اسے کیا کہنا ہے؟'' غزالہ نے پوچھا۔

''وہ مرد ہے دو چار اور کو ساتھ لے کر اِدھر اُدھر دیکھ آئے گا ابھی کہیں دور نہیں گئی ہوگی۔''

''اب مل چکی وہ۔''

کریمن تیز تیز چلتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئی۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

''یہ کیا ہو گیا؟''

اسے صبا سے ہمیشہ سے ہی بڑی ہمدردی تھی۔ اس پر ڈھائے جانے والے سب مظالم وہ دیکھتی تھی۔ اندر ہی اندر اس کے دل تڑپا کرتا تھا مگر وہ ایک ملازمہ تھی اور اس کے اپاہج خاوند کی روزی کا معاملہ تھا۔ سب کچھ سن سکتی تھی دیکھ سکتی تھی لیکن بول نہ سکتی تھی۔

اور پھر سیڑھیاں اترتے اترتے اس کی چال میں اور بھی تیزی آ گئی اب وہ بھاگ رہی تھی۔

''یا اللہ! صبا مل جائے یا اللہ صبا مل جائے۔''

بڑے خلوص سے اس کے دل سے دعا نکل رہی تھی۔

15

اس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا اس لئے وہ کسی راستے سے واقف نہ تھی بس اللہ توکل نکل آئی تھی۔ دادی اماں کے روکتے رہنے کے باوجود وہ رکی نہیں تھی۔ اس کے کانوں میں ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں پڑتی رہی تھیں مگر اس نے سب کچھ ان سنا کر دیا تھا۔ اب جب تک وہ اس عورت کو' جو اس کی ماں کہلاتی تھی لیکن حقدار نہ تھی' تلاش نہ کر لیتی اسے چین نہیں پڑنا تھا۔ پھاٹک سے باہر نکلی ایک لمحہ کے لئے اس نے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا بازار خالی تھا بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ ایک سمت چل پڑی۔

کوئی خاص منزل نہ تھی کوئی مقام نہ تھا کہ وہ کچھ سوچتی وہ تو بغل میں اپنی چھوٹی سی گٹھڑی دبائے' سر جھکائے چلی جا رہی تھی اردگرد کا کوئی پتہ نہ تھا کون آ رہا تھا کون جا رہا تھا۔

دو تین گھنٹے یونہی بلا مقصد ہی چلتی رہی موڑ آتا اسی طرح سر جھکائے مڑ جاتی بغیر کسی راہ کا تعین کئے۔ آخر اسے تھکن سی محسوس ہونے لگی چاروں طرف نگاہ دوڑائی شاید کوئی ایسی جگہ نظر آ جائے جہاں وہ بیٹھ کر کچھ دیر کے لئے ستا سکے۔

مگر وہ یہ دیکھ کر گھبرا اٹھی کہ وہ ایک بڑی پر رونق سڑک کے فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔ بے شمار لوگ اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں اتنے لوگ کبھی نہ دیکھے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف خوب سجی ہوئی دکانیں تھیں مرد عورتیں خرید و فروخت کر رہے تھے۔ سڑک پر سائیکلیں' موٹریں' رکشا اور تانگے بھاگے پھر رہے تھے ہٹو بچو کا غل مچا ہوا تھا۔

وہ گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اجنبی جگہ پر وہ تنہا کھڑی تھی وہ پریشان ہو گئی۔ کیا کرے کدھر جائے؟

لمحہ بھر کے لئے اس کے دل میں خیال آیا کہ گھر سے نکل کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ اب بھی وقت تھا واپس چلی جائے مگر دوسرے ہی لمحے گزرے ہوئے ماضی کا اس پر بیتا ہوا ایک ایک ظلم اور ایک ایک ستم اس کی نگاہوں میں پھر گیا۔

''نہیں نہیں۔ اب تو اپنا ارادہ پورا کر کے ہی رہوں گی ایسی زندگی کی مجھے ضرورت نہیں جو سسک سسک اور مر مر کر گزرے۔''

اس کا جوش پھر تازہ ہو گیا اس نے پھر اردگرد نگاہ دوڑائی اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بس کھڑی تھی اور لوگ اس میں سوار ہو رہے تھے۔ تصویر کے علاوہ اس نے سچ مچ کی بس کبھی نہ دیکھی تھی۔ البتہ سہیل سے سنا بہت کچھ تھا کہ اس میں بیٹھنے کا بہت مزہ آتا تھا۔

اس کا شوق اسے اس کے قریب کھینچ لے گیا وہ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر کھڑکی میں

سے اندر جھانکنے لگی۔ اسے کوئی پروا نہ تھی کہ اسے یوں دیکھتے پا کر کوئی کیا کہے گا اسے تو بس صرف بس دیکھنے کا شوق تھا اور وہ دیکھ رہی تھی۔

''کیوں بی بی تم نے بھی جانا ہے؟'' بس کنڈکٹر نے اسے یوں جھانکتے دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں۔'' اس نے بلا سوچے سمجھے سر ہلا دیا۔ اس میں بیٹھ کر سیر کرنے کا اس کا بہت دل چاہ رہا تھا۔ سہیل بھائی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مزہ آتا تھا تبھی تو لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر خود آگے بڑھ رہے تھے۔

''چلو پھر۔'' کنڈیکٹر نے آگے گھس کر جلدی جلدی لوگوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے اس کے لئے راستہ بنا دیا۔ ''آ جاؤ۔''

وہ جھجکتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بڑھی۔ شوق بھی تھا مگر پھر بھی اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا تھا اور چہرے کا رنگ فق ہوا جا رہا تھا۔ اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ۔'' کنڈیکٹر نے اک سیٹ کی جانب اشارہ کیا وہاں پہلے بھی ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی ہوئی تھی۔

''نہیں میں کھڑکی کے پاس بیٹھوں گی۔'' اس نے بالکل بچوں کی طرح ضد کی

کنڈیکٹر اور وہ عورت دونوں ہی اس کے اس انداز پر بے اختیار مسکرا دیئے۔

''لو تم یہاں آ جاؤ میں ادھر بیٹھ جاتی ہوں۔'' وہ عورت ادھر کھسکتے ہوئے بڑے پیار سے اسے دیکھنے لگی۔

مسرور ہوتے ہوئے اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر بیٹھ گئی اور پشت کے ساتھ سر ٹیک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

''کیا ہوا؟'' اس عورت نے بڑے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں جلدی چلنے سے سانس پھول گیا ہے۔'' صبا نے اپنے حواس کو قابو کرتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

''اکیلی ہو؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

''جی ہاں۔'' اور صبا گردن موڑ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگی۔

لوگ اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ قریب سے کاریں' سائیکلیں اور تانگے وغیرہ گزر رہے تھے۔ اس کے لئے یہ سب کچھ بالکل نیا تھا۔ وہ بڑی محویت سے دیکھنے لگی کتنا اچھا لگ رہا تھا اسے یہ سب!

وہ کھوسی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ چونکی۔ بس چل پڑی تھی۔ آہستہ آہستہ اور پھر تیز۔ سب کچھ پیچھے بھاگنے لگا تھا۔ وہ بڑی محظوظ ہو رہی تھی۔

اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا وہ جلدی سے پیچھے مڑی۔

''ٹکٹ لیا تھا؟'' وہی عورت پوچھ رہی تھی۔

''نہیں۔'' صبا بے پروائی سے کہتے ہوئے پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سب کچھ اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ یہ سڑک' یہ اردگرد بنے مکان۔ یہ اتنے سارے لوگ۔ اور کاریں موٹریں وہ پھر محو ہوگئی۔

''سنو۔'' اسے پھر مخاطب کیا گیا۔ ''اب بھی ٹکٹ لے لو۔''

''اچھا۔''

اور وہ عورت کنڈکٹر کو بلانے لگی۔ ''اسے ٹکٹ دے دو۔''

''وہاں سے نہیں لیا؟''

''نہیں۔''

''کہاں جانا ہے؟'' کنڈیکٹر نے صبا سے پوچھا اور وہ اس سوال پر گھبرا سی گئی اب وہ کیا بتاتی وہ تو خود نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں جانا تھا۔ حیران حیران آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''بی بی! میں پوچھ رہا ہوں کہاں جانا ہے؟''

اب اس عورت نے بھی غور سے صبا کے چہرے کی طرف دیکھا ''بیٹی! جہاں جانا چاہتی ہو بتا دو نا۔'' اس نے بڑے ملائم لہجہ میں کہا۔ لیکن صبا اسی طرح کبھی کنڈیکٹر کی

جانب اور کبھی اس عورت کی طرف دیکھتی رہی۔ ان کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''پیسے نہیں ہیں؟'' اس عورت نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''ہیں۔'' صبا نے جلدی جلدی گٹھڑی کھولی۔ کپڑے اوپر نیچے الٹ پلٹ کر ایک سلوٹوں بھرا دوپٹہ نکال لیا۔ دونوں بڑے غور سے اس کی مصروفیت دیکھ رہے تھے۔ دوپٹے کے ایک کونے میں کچھ لپٹا ہوا تھا۔ جلدی جلدی کھول کر نکال لیا۔ وہ پانچ پانچ کے تین نوٹ تھے یہ سب وہ تھے جو سہیل نے ملازمت ملنے کے بعد ہر عید پر اسے دیئے تھے۔ اور وہ اس نے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ تینوں کے تینوں صبا نے عورت کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ کنڈیکٹر اور وہ عورت دونوں پھر ہنس دیئے۔

''جانا کہاں ہے؟'' کنڈیکٹر نے پھر پوچھا۔ اس سوال نے صبا کے ہونٹوں پر پھر خاموشی طاری کر دی۔ اس کی منزل تو کوئی تھی نہیں!

''لاہور ہی کا دے دو۔''

عورت سمجھ دار تھی صبا کی اس خاموشی نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا اس لئے اس نے اپنے آپ ہی جواب دے دیا۔

''یہ لو۔'' کنڈیکٹر نے بڑے معنی خیز انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے ایک ٹکٹ اس کی طرف بڑھایا۔ صبا کا کانپتا ہاتھ اٹھا اور ٹکٹ تھام لیا۔

اس ٹکٹ کی قیمت کیا تھی صبا نے یہ بھی نہ معلوم کیا۔ گردن موڑ کر پھر کھڑکی میں سے باہر دیکھنے لگی سب کچھ پیچھے کو بھاگتا ہوا کتنا دلچسپ لگتا تھا۔ سہیل بھائی ٹھیک ہی تو کہتے تھے وہ پھر محو ہوگئی۔

اس عورت نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے خود ہی اس کے پندرہ روپوں میں سے اس کا کرایہ ادا کیا اور باقی رقم اس کے دوپٹے کے کونے میں باندھ کر دوپٹہ گٹھڑی میں رکھ دیا۔

''تمہاری شادی ہو چکی ہے؟'' اس عورت نے صبا کو اپنی طرف متوجہ کرتے

ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' صبا نے دھیرے سے جواب دیا۔

''پھر اکیلی کہاں جا رہی ہو؟''

''میں میں؟'' صبا کچھ بھی نہ بتا سکی۔ گڑبڑا کر رہ گئی۔

''گھر سے بھاگ آئی ہو نا؟'' اس نے بہت آہستہ کہا۔

''نہیں۔ نہیں تو۔'' وہ ایک دم گھبرا اٹھی۔ وہی فقرہ' جو اس کی ماں کے لئے استعمال ہوتا تھا' آج اس کے لئے کہا گیا تھا اس کا رنگ اڑ سا گیا۔

''میں تو کسی کو ڈھونڈنے کے لئے گھر سے آئی ہوں۔''

''کس کو؟'' وہ عورت تو وکیلوں کی طرح جرح کئے جا رہی تھی۔ ''بتاؤ کس کو تلاش کر رہی ہو۔''

''ایک عورت کو۔'' صبا نے مختصر جواب دیا۔

''ایک عورت کو۔'' وہ بے اعتباری سے صبا کو گھورنے لگی۔ ''کیا مطلب؟''

اب صبا اسے کیا سمجھاتی وہ خود اس کے پے در پے سوالات سے تنگ آئے جا رہی تھی۔ کوئی جواب دیئے بنا پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

بس اب شہر کی حدود سے نکل آئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف دور دور تک پھیلا ہوا سبزہ آنکھوں کو بہت بھاتا تھا۔ درخت قطار در قطار پیچھے کی سمت بھاگتے ہوئے اسے بہت اچھے لگ رہے تھے سب کچھ بھول کر وہ یہ نظارہ دیکھنے لگی۔ کتنی ہی دیر ہوگئی۔

اس عورت نے پھر اس کا بازو ہلایا۔ صبا نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''صبا۔''

''کتنے بھائی بہن ہیں؟''

''کوئی نہیں۔''

''اکیلی ہو؟''

''ہاں۔''

''ماں سوتیلی ہے؟''

''نہیں تو۔''

''پھر گھر سے کیوں بھاگی ہو؟''

جس بات سے اسے چڑ تھی وہی بار بار کہی جا رہی تھی اور اب صبا کو غصہ آ گیا۔ کوئی جواب دیئے بنا رخ پھیر لیا۔

بس کسی پر رونق سڑک سے گزر رہی تھی کھیتوں کی بجائے اب پھر مکان اور دوکانیں نظر آنے لگیں بس کی رفتار کم ہو رہی تھی۔

''نان کباب۔''

''گرما گرم پکوڑے۔''

''کیلے۔ سیب۔ مالٹے۔''

خوانچہ والے آوازیں لگاتے ہوئے بس کے ساتھ ساتھ بھاگے چلے آ رہے تھے۔ یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر اسے ایک دم ہی بھوک لگ گئی۔ صبح کا اس نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

ایک جھٹکے سے بس رک گئی۔ خوانچہ والے کھڑکیوں کے اندر جھانک جھانک کر آوازیں لگانے لگے۔ وہ بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی۔

''بھوک لگی ہے؟'' اس عورت نے شاید اس کی نگاہوں کی زبان پڑھ لی تھی۔

''ہاں۔'' صبا نے اس کی طرف رخ پھیرا۔

''کیا کھاؤ گی؟''

صبا ایک ایک چیز کو بڑے غور سے دیکھنے کے بعد بولی۔ ''نان کباب۔''

''تم ذرا ادھر ہٹو میں تمہیں خرید دیتی ہوں۔'' صبا پیچھے کھسکی تو وہ کھڑکی میں سے تقریباً آدھا دھڑ باہر نکال کر زور زور سے نان کباب والے کو آوازیں دینے لگی۔ صبا بڑی حیرت سے اس کی حرکات دیکھ رہی تھی۔

"یہ لو کھاؤ۔" اپنی جگہ پر بیٹھ کر اس نے گھٹنوں پر سب کچھ پھیلا لیا صبا پہلے تو جھجکی لیکن جب کبابوں کی تیز خوشبو اس کی ناک میں پہنچی تو وہ صبر نہ کر سکی۔

جلد جلد تین چار لقمے اوپر تلے لینے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ اکیلی ہی کھائے جا رہی تھی اور جس نے لے کر دیا تھا اسے اس نے پوچھا تک نہ تھا۔ وہ اپنی اس حرکت پر آپ ہی شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔ "آپ نہیں کھائیں گی؟"

"میں بھی کھاتی ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ "میں نے تو صبح بھی خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تھا سارا دن سفر میں جو گزرنا تھا۔"

وہ آہستہ آہستہ نوالے لینے لگی۔

"پیاس لگی ہے؟" کھا چکنے کے بعد اس نے صبا سے پوچھا۔

"ہاں۔" صبا نے مشکور نگاہوں سے اسے دیکھا۔

16

"بیٹی!"

صبا اونگھتے اونگھتے چونکی وہ اسے ہلا کر پھر مخاطب کر رہی تھی۔

"یہ تو بتاؤ اب جاؤ گی کہاں؟"

صبا خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی جس بات کا خود اسے علم نہیں تھا وہ اس عورت کو کیا بتاتی' اور جہاں مرضی ہو جاتی۔ آخر اسے اس کے لئے اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا تھی۔ وہ کچھ جھنجلا سی گئی اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر پھر اونگھنے لگی۔

جب سے پیٹ بھرا تھا اسے نیند آئے جا رہی تھی اب باہر بھی کوئی ایسا انوکھا نظارہ نہ رہا تھا۔ بس ویسے ہی دور دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور درخت بڑی تیزی سے پیچھے کو بھاگ رہے تھے اکتا کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ جوان ہو' خوبصورت ہو اور زمانہ بڑا نازک ہے۔" صبا آنکھیں کھول کر خاموشی سے اس کی بات سنتی رہی بس کی رفتار اب پھر کم ہو رہی تھی۔ "آخر ایسی کیا بات ہو گئی جو تم گھر سے بھاگ آئی ہو؟"

تجسس نے عورت کے منہ سے پھر وہی بات کہلوائی جس کی صبا میں سننے کی مزید تاب نہ تھی۔

بس رک گئی کچھ مسافر اترنے لگے اور کچھ نئے چڑھنے لگے خوانچے والوں کا شور مچ گیا۔

بے شک وہ عورت بڑی ہمدرد تھی اس کا بہت خیال رکھ رہی تھی لیکن اب اس کی معیت صبا کے لئے دوبھر ہوئی جا رہی تھی۔ کیوں وہ بار بار اس کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی کر رہی تھی۔ صبا کی برداشت اب جواب دے چکی تھی۔ گٹھڑی بغل میں دباتے ہوئے چپکے سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس عورت نے پوچھا۔

"ابھی آتی ہوں۔" مبہم سا جواب دے کر صبا جلدی سے بس سے اتر آئی۔

مبادا وہ کوئی اور سوال کر بیٹھے اور پھر جدھر منہ اٹھا تیز تیز قدموں سے چل پڑی۔

اسے چلتے ہوئے آدھ پون گھنٹہ گزر گیا تھا۔ اسے کچھ علم نہ تھا کہ وہ کدھر جا رہی تھی۔ شور کی آواز سنائی دی تو ٹھٹک کر وہیں رک گئی اور دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ اس سے تھوڑے فاصلے پر داہنی سمت ایک باغ تھا وہیں سے شور کی آواز آ رہی تھی۔

سڑک پر اتنی زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتی وہ جلدی سے سڑک پار کر گئی۔ باغ کے اردگرد چھوٹی چھوٹی باڑھ تھی۔ وہ اندر جھانکنے لگی اور پھر بے اختیار اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہت سارے بچے وہاں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اور یہ شور انہیں کا تھا۔ وہ خاموشی سے کھڑے ہو کر بڑے شوق اور دلچسپی سے انہیں کھیلتے دیکھنے لگی۔ کیسے مزے سے وہ کھیل رہے تھے۔ اور یوں بے فکری سے کھیلنا کبھی بھی اس کے نصیب میں نہیں ہوا تھا۔ اب تو خیر بڑی تھی وہ تو بچپن میں بھی کبھی یوں نہ کھیلی تھی۔ وہ نگاہوں میں

بڑی حسرت لئے کھڑی تھی اور بچپن کو ان بچوں کے درمیان دیکھ رہی تھی کتنا حسین سپنا تھا!

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟"

وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ باڑھ سے پرلی طرف ایک چھوٹی سی بچی گردن اٹھائے حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں تمہاری آنکھ مچولی دیکھ رہی ہوں۔" صبا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا تم نہیں کھیل رہیں؟"

"کھیل رہی ہوں۔ میں یہاں چھپنے آئی تھی تو تم پر نظر پڑ گئی۔" پھر وہ ایک دو قدم اور آگے بڑھ آئی۔ "ہم اچھا کھیل رہے ہیں نا؟"

"ہاں بہت اچھا۔"

"آؤ تم بھی ہمارے ساتھ کھیلو۔" بچی نے خوش ہوتے ہوئے اسے دعوت دے ڈالی۔

"سچ؟"

صبا کو یقین نہ آیا۔ بڑے تو بڑے، وہاں تو بچے تک اس کے سائے سے دور بھاگا کرتے تھے۔

"ہاں ہاں سچ مچ آؤ۔"

"لیکن میں اتنی بڑی ہوں۔"

"پھر کیا ہے۔" بچی نے بڑی فراخدلی سے کہا۔

"اوہ!" صبا خوشی سے بے اختیار ہو کر بولی۔ "کدھر سے اندر آؤں؟"

"اصلی راستہ تو وہ اس طرف ہے۔" بچی نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "لیکن تم یہیں سے آ جاؤ ہم بھی اکثر یونہی پھلانگ کر آ جایا کرتے ہیں۔"

"اچھا۔" صبا فوراً تیار ہو گئی۔

"یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟" بچی نے پوچھا۔

"میرے کپڑوں کی گٹھڑی ہے۔"

"لاؤ یہ مجھے پکڑا دو اس طرح آسانی سے آ سکو گی۔"

مزید کچھ پوچھے بغیر بچی نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ بلند کئے۔ صبا کو اس کی یہ بات بے حد پسند آئی اس عورت سے زیادہ عقل والی تو یہ ننھی سی بچی تھی۔

صبا نے سوچتے ہوئے جلدی سے اسے اپنی گٹھڑی تھما دی اور پھر خود بھی پھلانگ کر اندر پہنچ گئی۔ وفور مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہوا جا رہا تھا۔

"ارے! یہ کون ہے؟" سب بچے ان کے اردگرد اکٹھا ہو گئے۔

"یہ میری سہیلی ہے۔" بچی بڑے فخر سے بولی۔

"تمہاری سہیلی؟" سب نے صبا کو سر سے پیر تک دیکھنے کے بعد اس ننھی منی چیز کو حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"ہاں ہاں میری سہیلی۔ ابھی ابھی بنی ہے۔" بچی نے گھبرا گھبرا کر ان کی حیرت بھری نگاہوں کو دیکھتے ہوئے جلدی جلدی کہا۔

"سچ مچ؟" بچی کا یقین نہ کرتے ہوئے ان سب نے صبا کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"ہاں۔" صبا نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"تو آؤ پھر۔" وہ چونکہ بڑی تھی اس لئے اس کی بات کا سب کو یقین آ گیا۔

اور وہ ان سب کے ساتھ کھیلنے لگی۔ اس کی بڑائی کو مدنظر رکھتے ہوئے بچوں نے گویا اسے اپنا سردار تسلیم کر لیا تھا۔ جس جس طرح کہتی سب فوراً اس کی تعمیل کرتے۔ ساری زندگی میں اسے کاہے کو کبھی ایسی افسرانہ شان ملی تھی۔ وہ خوشی سے بے اختیار ہوئی جا رہی تھی۔ کھیل میں وہ اس قدر محو تھی کہ اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ کوئی خیال نہ تھا اور آنے والے وقت کا کوئی احساس نہ تھا۔

رات کی سیاہی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ کھیل کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے سب بچے اپنی اپنی جوتیاں پہن کر گھروں کو واپس جانے کی تیاری کرنے لگے۔ کھیل کھیل کر وہ بڑی سخت تھک گئی تھی۔ ایک درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر ستانے کے لئے بیٹھ گئی۔

سب بچے اپنی اپنی چیزیں سمیٹ کر گھروں کو چل دیئے۔ کسی نے بھی اپنے سردار کی طرف توجہ نہ دی یہاں تک کہ اس ننھی بچی نے بھی اپنی نئی نویلی سہیلی کو نہ پوچھا۔ پھولے ہوئے سانس کو ہموار کر کے اس نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ باغ سنسان پڑا تھا۔ تاریکی گہری ہوتی جا رہی تھی اور وہ وہاں تنہا تھی خوف کے مارے اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

بچپن میں اسے اور غزالہ کو سہیل جنوں بھوتوں کی بے شمار کہانیاں سنایا کرتا تھا اور اب ان کہانیوں والے سب ہی جن بھوت بازو پھیلائے اس کی سمت چلے آ رہے تھے۔

اس نے جلدی سے آنکھیں بند کر کے چہرہ گھٹنوں میں چھپا لیا کتنی ہی دیر یونہی بیٹھی رہی۔ آخر ہمت کر کے آنکھیں کھولیں تاریکی زیادہ ہو جانے کی وجہ سے جن بھوت اور بھی ہیبت ناک ہو گئے تھے۔ چیخ مار کر اس نے پھر چہرہ چھپا لیا اور بے اختیار رونے لگی۔

''اب کہاں جاؤں؟''

مگر اسے تو کوئی راہ نہ سجھائی دے رہی تھی۔ دن تو چل پھر کر گزر گیا تھا۔ رات کہاں گزارتی!

یہ میں نے کیا کیا۔ یہ میں نے کیا کیا؟ دادی اماں نے اتنی بار بلایا تھا مجھے رک جانا چاہیے تھا۔ وہ بری طرح پچھتا رہی تھی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ یونہی گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی روتی رہی اور سوچتی رہی۔

دور دور تک کوئی متنفس نہیں تھا جو چیخ چلا کر مدد کو بلا لیتی۔ سڑک پر سے البتہ کبھی کبھی کوئی سواری گزر جاتی، مگر وہاں تک اس کی آواز کیسے پہنچتی سوچ سوچ کر اس کا دماغ خراب ہوا جا رہا تھا کہ اچانک اسے ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔

اس طرح ڈر ڈر کر مرنے سے تو بہتر تھا وہ وہی زہر کھا کر سب دکھوں، مصیبتوں سے نجات حاصل کر لیتی، جو وہ ماں سے انتقام لینے کے لئے ساتھ لائی تھی۔

چہرہ اسی طرح گھٹنوں میں چھپائے چھپائے اس نے ہاتھ بڑھایا اور ٹٹول ٹٹول کر اپنی گٹھڑی پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ آنکھیں کھولنے کی ہمت وہ خود میں نہ پا رہی

تھی۔ تاریکی میں بڑے بڑے درخت سچ مچ کے جن بھوت معلوم ہوتے تھے۔ کتنی دیر ٹٹولتے رہنے کے باوجود گٹھڑی نہ ملی تو مجبوراً اسے آنکھیں کھولنا پڑیں۔

خدا کے کلام کا ورد کرتے ہوئے اس نے سر اٹھایا اور گٹھڑی تلاش کرنے لگی معاً اسے یاد آیا۔ کھیلنے کے وقت اس نے ادھر باڑھ کے پاس رکھ دی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھے بنا نظریں جھکائے وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اس طرف چلی گئی جہاں اس نے گٹھڑی رکھی تھی مگر اس کا دل دھک دھک کر اٹھا۔ نجانے کب کوئی اس کی گٹھڑی اٹھا لے گیا تھا! رہی سہی نجات کی راہ بھی کھو گئی بے بسی پھر اس کی آنکھوں سے چھلک پڑی۔

''کون ہو تم یہاں اکیلی بیٹھی کیوں رو رہی ہو؟'' پوچھنے والے کا لہجہ ہمدردی بھرا تھا۔

صبا نے جلدی سے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھایا ٹارچ کی روشنی اس پر پڑی۔ آپ ہی آپ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ نجانے پوچھنے والا کون تھا؟ چہرے پر روشنی پڑنے کی وجہ سے وہ اسے بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔

''کیا راستہ بھول گئی ہو؟'' پھر پوچھا گیا اور اب روشنی بھی ہٹالی گئی تھی اس نے بڑے غور سے مخاطب کرنے والے کو دیکھا اندھیرے میں سوائے انسان کے ہیولے کے اسے اور کچھ نہ دکھائی دے سکا۔

''بتاؤ نا بات کیا ہے؟ اگر کسی مدد وغیرہ کی ضرورت ہے تو میں حاضر ہوں۔''

''میری گٹھڑی کوئی اٹھا لے گیا ہے۔'' بسورتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا تھا اس میں۔''

''میرے کپڑے اور پیسے۔'' وہ پھر رو پڑی۔

''کہیں جا رہی تھیں؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟''

وہ سٹ پٹا گئی۔ اس سوال کا جواب تو خود اس کے اپنے پاس بھی نہ تھا خاموش ہو گئی۔

"تم نے بتایا نہیں کہاں جا رہی تھیں؟"

"میں۔ میں۔" وہ ہکلا کر رہ گئی۔

اور اب ٹارچ کی روشنی اس کی پورے سراپا پر پھیل گئی۔ وہ کسمسائی۔

"کیا بتانا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پھر کچھ تو کہو مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"لاہور۔" جلدی میں وہ یہی کہہ سکی۔

"چلو یہ تو اچھا ہوا میں بھی لاہور ہی جا رہا ہوں چلو میرے ساتھ۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی جائے یا نہ جائے؟ نہ جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا اور یوں ایک اجنبی کے ساتھ چل دینا بھی ٹھیک معلوم نہ ہوتا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔" وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔

"چلو اٹھو پھر۔"

"نہیں۔" اس کا دل جیسے اندر سے پکارا۔

"نہیں؟" حیرت بھرے لہجے میں پوچھا گیا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شش و پنج میں پڑی رہ گئی۔

"نہیں جانا چاہتیں تو تمہاری مرضی مجھے تو دیر ہو رہی ہے۔" وہ چل دیا۔

وہ پھر اکیلی رہ گئی تھی۔ جتنی دیر وہ موجود رہا تھا صبا کو ڈر نہیں لگا تھا۔ اور اب پھر اس کی حالت غیر ہونے لگی اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ہوا سے ہلتے ہوئے درخت یوں دکھائی دیئے جیسے کالے دیو اس کی جانب بڑھے چلے آ رہے ہوں بڑی مشکل سے چیخیں اس نے حلق میں دبائیں اور جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ وہ ابھی اس سے زیادہ دور نہیں پہنچا تھا۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔ رک جاؤ۔" وہ چلاتے ہوئے بڑی تیزی سے اس کے پیچھے بھاگی

اندھیرے میں کوئی نرم سی چیز اس کے پاؤں کے نیچے آ گئی۔ شاید سانپ تھا اسے ایک دم خیال آیا اور اب وہ مزید ضبط نہ کر سکی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

"کیا ہوا؟" وہ پلٹ کر تیز تیز قدم اٹھاتا اس کے قریب آ گیا۔

"سس۔ سس۔ سانپ۔" وہ بھاگ کر کانپتے ہوئے اس کے ساتھ لگ گئی۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ۔"

"تم نے خود ہی انکار کیا تھا۔"

"نہیں نہیں میں مر جاؤں گی۔"

"کیا؟" اس کا مطلب صبا سمجھ نہ سکی۔

"اگر اتنی بزدل تھیں تو اکیلی گھر سے نکلی کیوں تھیں۔" ہمدردی کی بجائے اب اس کے لہجے میں طنز تھا۔ صبا لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکی چلتے چلتے رک کر حیرت سے اسے دیکھا مگر تاریکی میں اس کا چہرہ نظر آ رہا تھا تو چہرے کے اتار چڑھاؤ کا کیسے اندازہ کرتی۔

"سچ سچ بتاؤ تم اس وقت یہاں کیوں تھیں؟" وہ مشکوک لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

"کھیلتے کھیلتے رات ہو گئی اور پھر میری گٹھڑی بھی کوئی اٹھا کر لے گیا۔"

اب وہ سڑک تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے رک کر صبا کی بات کی صداقت معلوم کرنے کے لئے بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ سڑک پر ہلکی ہلکی روشنی تھی پہلے اتنی بار کوشش کرنے کے باوجود صبا کو سوائے ہیولے کے اور کچھ نہ دکھائی دے سکا تھا یہ ذرا سی روشنی غنیمت معلوم ہوئی۔ عین اسی لمحے اس نے بھی نگاہیں اٹھائیں تا کہ اپنے ساتھ ہمدردی کرنے والی ہستی کو دیکھ سکے۔ ہلکے سانولے رنگ کا وہ ایک خوش پوش اور پرکشش نوجوان تھا۔ بڑے غور سے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہی تھی شاید یہ جانچنے کے لئے کہ اس پر اعتبار کیا جا سکتا تھا یا نہیں۔

"گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو۔ کوئی چور لفنگا نہیں ہوں۔"

"میں نے کب کہا۔" اور صبا نے جلدی سے نگاہیں نیچی کر لیں۔

"اسی لئے تو شاید تم نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تھا۔"

''نہیں۔نہیں تو۔''

''جھوٹ نہ بولو۔'' اس نے بڑے وثوق سے کہا اور نجانے کیوں وہ اس کی تردید نہ کرسکی۔

''اب بتاؤ کہاں جانا ہے؟''

''لاہور۔''

''موٹر سائیکل پر کبھی بیٹھی ہو۔'' اس نے سڑک کے کنارے کھڑی ایک موٹر سائیکل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔''

''تو پھر۔'' وہ کچھ پریشان سا ہوگیا۔

''بیٹھ جاؤں گی۔'' صبا نے ایسے ہی کہہ دیا۔

''تو آؤ پھر جلدی کرو بہت دیر ہوگئی۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا۔''میری ماں تو جائے نماز بچھا کر بیٹھی ہوگی۔''

''تمہاری ماں کو تم سے بہت پیار ہے؟'' صبا نے بڑی حسرت سے پوچھا۔

''کون سی ماں ایسی ہے جسے اپنی اولاد سے پیار نہیں ہوتا اور پھر میں تو اس کا اکلوتا بیٹا ہوں۔'' اس نے سر جھکا کر موٹر سائیکل سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

صبا کو یک لخت اپنی ماں یاد آ گئی شاید وہ دنیا میں واحد مثال تھی بے اختیار اس کے لبوں سے آہ نکل گئی اسی کی قسمت ایسی ہونا تھی!

''لو بیٹھو یہاں۔'' اس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کر کے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔

''اور دیکھو یہاں سے خوب مضبوطی سے پکڑے رکھنا۔''

''اچھا!''

پھٹ پھٹ کی آواز کے ساتھ موٹر سائیکل چل پڑی۔ ہوا کا زور اتنا زیادہ تھا کہ صبا کو یوں محسوس ہوا جیسے ابھی پیچھے کی طرف اڑ جائے گی۔ اندر ہی اندر ڈر کے مارے اس کا خون خشک ہو رہا تھا مگر وہ دل کڑا کر کے بیٹھی رہی اور بڑے خشوع و خضوع سے درود

شریف پڑھتی رہی۔

''بھوک وغیرہ لگی ہو تو مجھے بتا دو۔'' دور آبادی کے آثار دکھائی دیئے تو اس نے موٹر سائیکل آہستہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''پیاس لگی ہے۔'' صبا نے جھجکتے جھجکتے کہا۔ ویسے اب اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر تکلف کر گئی۔ کیوں کسی پر ضرورت سے زیادہ بوجھ بنے۔ اتنا تھوڑا تھا وہ اسے اس سنسان جگہ سے نکال لایا تھا۔

''لو تم اس بینچ پر بیٹھو میں ابھی تمہارے لئے کچھ لے کر آتا ہوں۔''

سڑک کے کنارے اس نے موٹر سائیکل روکتے ہوئے کہا۔

وہ خاموشی سے اتر کر فٹ پاتھ پر بنے بنچ پر جا بیٹھی۔ سڑک پر اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ کبھی کوئی سواری بھی گزر جاتی۔

''کھانا کب کھایا تھا؟''

''نہیں نہیں۔ کچھ کھاؤں گی نہیں۔''

''میری بات کا جواب دو۔'' اس نے تند لہجے میں کہا۔

''صبح تقریباً گیارہ بجے۔''

''ہوں۔'' اور وہ بغیر مزید کچھ کہے سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ صبا اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پندرہ بیس گز چلنے کے بعد وہ موڑ مڑ کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ سارے دن کی تھکی ہوئی تھی بنچ کی پشت سے سر ٹکا کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

لاہور پہنچ کر پھر وہ کہاں جائے گی؟ وہ سوچنے لگی۔ اب تو کوئی پیسہ بھی پاس نہ تھا اور نہ پہننے کو کپڑا۔ اس تہی دامانی کے ساتھ کب تک گزارہ کرسکتی تھی۔ وہ لامتناہی سوچوں میں گم ہوگئی۔ ماں سے انتقام کے جوش میں وہ گھر سے نکل تو آئی تھی مگر اب اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ اتنی بڑی دنیا میں آخر وہ کہاں اسے تلاش کرے۔ فی الحال تو وہ خود ہی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ وہ پچھتانے لگی۔ کیا واپس چلی جائے اسے خیال

آیا۔مگر اب تو گھر کے دروازے بھی اس کے لیے بند ہو چکے تھے۔ پہلے ماں کا گناہ ہی اسے جینے نہیں دے رہا تھا اور اب تو نادانستگی میں وہ خود بھی وہی گناہ کر بیٹھی تھی۔

معاً اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوند گیا۔سہیل بھی تو لاہور میں ہی رہتا تھا۔کیوں نہ اس کے پاس چلی جائے وہ یقیناً اسے کچھ نہیں کہے گا۔اس کی ہر خطا اور ہر غلطی معاف کر دے گا۔وہ ایسا ہی فراخ دل تھا لیکن پھر اس کی نگاہوں میں پھپھو کا غضب ناک چہرہ گھوم گیا ان کے تصور نے ہی اسے لرزا دیا۔

ایک دم اس کے چہرے پر تیز روشنی پڑی اور پھر ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کے قریب ہی کوئی گاڑی آ رکی۔صبا نے چونکتے ہوئے آنکھیں کھولیں۔ایک لمبی کار عین فٹ پاتھ کے ساتھ مل کھڑی تھی ہلکے رنگ کی یہ چمکیلی سی کار کتنی خوبصورت تھی وہ بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔کار کا اگلا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کا شخص باہر نکل کر اس کی سمت بڑھا۔وہ گھبرا سی گئی۔

''آپ نے کہیں جانا ہے؟''

''نہیں۔نہیں ہاں۔'' گھبراہٹ کے مارے نجانے منہ سے کیا نکل گیا۔

''آپ شاید بس کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔'' اس کا لہجہ بڑی ملائمت اور حلیمی لئے تھا۔''اگر لاہور جانا ہے تو میں آپ کو لفٹ دے سکتا ہوں۔''

''جانا تو لاہور ہی ہے۔'' وہ اس خوبصورت کار کو دیکھتے ہوئے کھوئی کھوئی سی بولی۔

''تو آیئے پھر۔''

''لیکن۔''

''تکلف کی کوئی بات نہیں۔''

''مگر میں تو اس کے ساتھ جا رہی تھی۔''

''کس کے ساتھ؟''

''وہ وہ۔اس کا نام مجھے نہیں معلوم۔''

وہ بے اعتباری سے ہنس دیا کیونکہ وہ یہی سمجھا تھا کہ صبا تکلف کی بنا پر محض

بہانے بنا رہی تھی۔

''آیئے نا مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔''

اس کے اصرار پر صبا کا دل ڈگمگانے لگا۔موٹر سائیکل پر جتنی دیر بیٹھی رہی تھی اسے ڈر لگتا رہا تھا اور یہ اتنی خوبصورت کار، یہ یقیناً بہت آرام دہ ہوگی۔اور پھر اس کے لئے وہ موٹر سائیکل والا بھی اجنبی تھا اور یہ بھی بلکہ یہ زیادہ قابل اعتبار ہو سکتا تھا کیونکہ چہرے بشرے سے اس کی عمر پچاس کے قریب قریب لگتی تھی۔یہ سب کچھ سوچ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔اس شخص نے آگے جا کر جلدی سے کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔اندر بیٹھتے بیٹھتے ایک بار پھر صبا کو اس کا خیال آیا۔وہ رک گئی۔

''بیٹھئے بھی لاہور پہنچتے پہنچتے بہت رات ہو جائے گی۔''

صبا نے نگاہ اٹھا کر اس سمت دیکھا جدھر وہ گیا تھا شاید واپس آ رہا ہو مگر اس کی نظریں مایوس ہی لوٹیں وہ کہیں دکھائی نہ دے رہا تھا۔

''ادھر کیا دیکھ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' اور وہ مڑ کر کار میں بیٹھ گئی نرم نرم گدے دار سیٹ بڑی آرام دہ تھی۔صبا نے پشت کے ساتھ سر ٹیک دیا اور نیم دراز ہو گئی۔

''اچھا ہی ہوا جو اس کے ساتھ آ گئی۔'' صبا نے سوچا۔''اب آرام سے تو پہنچوں گی۔موٹر سائیکل پر تو ڈر ڈر کر ہی جان نکلی جا رہی تھی۔''

اطمینان کا سانس لیتے ہوئے صبا نے نگاہ اٹھا کر کار کے سامنے والے شیشے سے باہر دیکھا۔وہ وہی موڑ تھا' جدھر وہ گیا تھا۔

''اوہ! رک جایئے۔'' صبا بڑی عجلت سے بولی۔وہ سامنے سے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا اور دونوں ہاتھوں میں اس نے کچھ اٹھا رکھا تھا۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' اس نے کار روکے بنا پوچھا۔

''وہ۔وہ۔'' کار بہت آگے بڑھ چکی تھی۔''اوہ! مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔'' وہ مسکرایا۔''تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ابھی اس کا انتظام ہوا جاتا ہے۔''

"مگر۔مگر......" وہ مڑ مڑ کر پچھلے شیشے سے باہر دیکھ رہی تھی اب تو وہ بہت آگے نکل آئے تھے۔اس لئے کچھ کہنا فضول تھا وہ بے بس سی ہو کر رہ گئی۔

"وہ یقیناً مجھے وہاں نہ پا کر پریشان ہو رہا ہو گا یہ میں نے اچھا نہیں کیا مجھے اسے بتا کر آنا چاہیے تھا۔" وہ بڑے خلوص سے پچھتانے لگی اور پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آ گیا۔ کہ کیوں ہمیشہ جلد بازی سے کام لیتی تھی پھر کار میں بیٹھے اس شخص پر غصہ آ گیا۔ جو اصرار کر کے اسے لے آیا تھا۔

جس تیزی سے کار فراٹے بھرتی جا رہی تھی اس تیزی سے اس کا ذہن خیالات کی دنیا کے چکر لگا رہا تھا۔

"آپ بہت خاموش ہیں کوئی بات کریں نا، دو تین گھنٹے کا سفر باتوں میں دلچسپی سے گزر جائے گا۔" اس نے کار میں لگے چھوٹے سے شیشے کا رخ صبا کی جانب پھیر کر اس میں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے خیالات میں مگن بیٹھی رہی اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

"کیا سوچ رہی ہیں؟" اس نے پھر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ ٹال گئی۔ اب اسے کیا بتاتی کہ وہ اپنی بے وقوفی کے باعث ایک انسان سے زیادتی کر بیٹھی ہے اور اب پچھتا رہی تھی۔

"تو پھر آپ اتنی خاموش کیوں ہیں؟"

"نہیں تو۔"

"آپ شادی شدہ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"ماں باپ بہن بھائی سب لاہور میں ہوں گے؟"

"جی ہاں۔"

اور اب صبا اس کے سوالات سے تنگ آتی جا رہی تھی اسے اس کو یہ پولیس والوں کی طرح چھان بین اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ایک وہ بھی تو تھا اس نے ایک حرف تک

نہ پوچھا تھا اور ساتھ لے کر چل پڑا تھا۔صبا کو پھر اس کا خیال آ گیا۔کیا معلوم وہ ابھی تک اسے وہیں تلاش کرتا پھر رہا ہو۔اس کا جی چاہا واپس مڑ چلے مگر یہ بھی تو اس کے بس میں نہ تھا کار والا اس کا زرخرید غلام نہ تھا کہ جہاں کہتی لئے پھرتا۔دل مسوس کر رہ گئی۔

"آپ کا نام؟" قدرے توقف کے بعد اس نے پھر پوچھا۔

"صبا۔"

"صبا!" وہ مسکرایا۔"نام تو بہت اچھا ہے۔"

اس کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں صبا چہرے پر ناگواری کے تاثرات لئے خاموش رہ گئی۔

"پڑھتی ہوں گی۔"

"جی نہیں۔"

"پڑھ چکی ہیں۔"

"جی نہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"جی میں کچھ نہیں پڑھی ہوئی۔" صبا اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"بالکل نہیں ایک جماعت نہیں؟" وہ کچھ بہت ہی زیادہ باتونی تھا۔

"جی نہیں۔"

"یہ تو بہت برا ہوا۔"

"کیا مطلب؟" صبا نے شیشے میں سے بڑی حیرت سے اسے گھورا۔"میری پڑھائی کو آپ نے کیا کرنا ہے؟"

"آپ شاید برا مان گئی ہیں۔" وہ نرمی سے بولا۔"میں نے تو صرف اس لئے کہا تھا کہ تعلیم اچھی چیز ہوتی ہے۔آپ کو تھوڑا بہت ضرور پڑھنا چاہیے تھا۔" پھر اس نے ایک دم موضوع بدل دیا"آپ کو فلم دیکھنے کا شوق ہے۔"

"میں نے کبھی فلم نہیں دیکھی۔"

''کبھی نہیں؟'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''زندگی میں ایک بھی نہیں۔''

''جی نہیں۔''

''عجیب بات ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔ ''دل میں کبھی شوق بھی پیدا نہیں ہوا۔''

اس کا باتونی پن صبا پر بڑا گراں گزر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر خاموشی سے بیٹھ کر اپنے متعلق کچھ سوچنا چاہتی تھی کہ لاہور پہنچ کر کہاں جائے۔ اسے کوئی ٹھکانہ نہ سوجھ رہا تھا۔

''پھر آپ نے بتایا نہیں کیا آپ فلم دیکھنا چاہتی ہیں؟''

''جی نہیں۔ جی نہیں۔'' اور اب میں مزید برداشت نہ رہی بے قابو ہوتے ہوئے وہ زور سے چلا پڑی۔ ''روکیے کار اور مجھے یہیں اتار دیجئے۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے گردن موڑ کر حیرت سے اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں بس میں لاہور نہیں جانا چاہتی۔''

''آپ کی مرضی۔'' اس نے کار روکتے ہوئے پیچھے مڑ کر دروازہ کھول دیا۔

''لیجئے۔'' اور خود وہیں بیٹھا مسکراتا رہا۔

صبا نے بلا کچھ سوچے سمجھے پاؤں باہر لٹکا دیئے اور نیچے اترنے ہی لگی تھی کہ باہر نگاہ جا پڑی۔ سنسان علاقہ تھا اور ہوا سائیں سائیں کرتی درختوں میں سے گزر رہی تھی۔ ٹہنیوں کی ایک دوسرے سے رگڑنے کی آواز بڑی دہشت ناک تھی۔ تاریکی اتنی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا۔ سہم کر اس نے جلدی سے پاؤں پھر اندر کر لئے۔

''نہیں نہیں مجھے تاریکی سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' اس نے آپ ہی جلدی سے دروازہ بھی بند کر دیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا اس کی حرکات دیکھتا رہا تھا اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

''چلئے نا۔'' وہ شیشوں سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔ اتنا اندھیرا تھا کہ اسے اب اندر بیٹھے ہوئے بھی ڈر محسوس ہو رہا تھا۔

''اس عمر میں اکثر لڑکیاں جذباتی ہوتی ہیں۔'' اس نے ہنستے ہوئے کار چلا دی۔

17

وہ ایک بہت ہی خوشنما اور وسیع و عریض کوٹھی تھی۔ اس کے پورچ میں اس نے کار کھڑی کر دی اور مڑ کر پچھلی سیٹ پر نگاہ ڈالی۔

اپنے ہی شانے پر سر نہوڑے ہوئے صبا اردگرد سے بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ سوتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ حسین لگ رہی تھی اس کے لبوں پر مسرور سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

سیٹی بجاتا ہوا وہ باہر نکلا اور برآمدے میں لگے ایک سوئچ پر انگلی رکھ دی۔

ٹن۔ ٹن۔ ٹن دور کہیں گھنٹی کی آواز گونج گئی۔ چند لمحوں بعد سامنے والا دروازہ کھلا۔ وہ ملازمہ تھی۔

''بیگم صاحبہ کہاں ہیں؟'' اس نے بڑی عجلت سے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں بیٹھی آپ ہی کا انتظار کر رہی ہیں۔''

''انہیں جلدی سے باہر بھیجو۔''

''آپ نے بہت دیر کر دی۔'' برآمدے میں سے نسوانی آواز آئی تو وہ جلدی سے پلٹ پڑا۔

''ہاں بس ہو ہی گئی۔''

''یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں؟''

''فوزیہ! ادھر آؤ۔''

وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اس کے قریب آ گئی اور متحیر سی خاوند کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''گاڑی میں پچھلی سیٹ پر ایک لڑکی سو رہی ہے۔ اسے جگا کر اندر لے چلو اور ہاں یہ بتاؤ کھانا کھا لیا ہے؟''

''نہیں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔''

''بس تو تم اسے لے آؤ میں خانساماں سے کہہ کر کھانا لگواتا ہوں۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' وہ ادھر سے ہٹ کر برآمدے کی طرف بڑھا مگر سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر پھر رک گیا۔ ''سنو فوزیہ! بڑے پیار اور محبت سے جگانا ایسے کہ وہ محسوس کرے جیسے اپنوں میں ہی ہے۔''

''مگر ہے کون؟''

''گجرات کے بسوں کے اڈے سے تھوڑے فاصلے پر فٹ پاتھ پر بنے ایک بینچ پر سو رہی تھی۔''

''تو آپ کیوں ساتھ لے آئے؟''

''میری فوزیہ بڑی بھولی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''ذرا آگے بڑھ کر اس کی شکل و صورت تو دیکھو۔''

''اوہ! اچھا سمجھ گئی۔'' اس نے جھک کر سوئی ہوئی صبا کو بڑے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن یہ راضی ہو جائے گی؟''

''اب یہ تمہارا کام ہے۔ دیکھیں کہاں تک کامیاب ہوتی ہو۔'' اس نے بڑی لمبی سی جمائی لی۔ ''اوہ! بہت تھک گیا طاہر اور نائلہ کہاں ہیں؟''

''سو گئے۔'' اور اس نے بڑی آہستگی سے صبا کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''سنئے۔'' فوزیہ نے پلٹ کر جاتے جاتے خاوند کو پکارا۔ ''اس کا نام کیا ہے؟''

''بتایا تو صبا تھا آگے خدا جانے۔'' اور وہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔

''صبا'' فوزیہ نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بڑی ملائمت سے پکارا۔

پہلی ہی آواز پر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی نیند بھری بڑی بڑی آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں۔ فوزیہ بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

''آپ کون ہیں؟'' صبا کی نیند اچھی طرح کھلی تو جلدی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ میں کہاں ہوں؟ مجھے تو لاہور جانا تھا۔''

''یہ لاہور ہی ہے۔'' فوزیہ بڑے پیار سے بولی۔ ''رات بہت ہوگئی ہے اس وقت تم میرے پاس رہو۔ صبح جہاں جانا ہوگا وہاں ہم تمہیں پہنچا دیں گے۔''

''لیکن آپ کون ہیں؟''

''جن کے ساتھ تم آئی ہو وہ میرے خاوند ہیں۔''

اور وہ گویا مطمئن سی ہوتے ہوئے خود پر جھکی فوزیہ کو دیکھنے لگی مگر چونکہ روشنی کی سمت اس کی پشت تھی اس لئے اس کی صورت اسے اچھی طرح دکھائی نہ دے سکی۔

''آؤ نکلو باہر۔'' صبا ہچکچائی۔ کیا کرے؟ مگر پھر اسے خیال آیا کہ اس وقت جائے گی بھی کہاں؟ یہ تو گویا اس کے لئے غیبی مدد تھی۔ ''آؤ نا سوچ کیا رہی ہو فکر نہ کرو تم جہاں کہو گی تمہیں پہنچا دیں گے۔'' اس کے لہجے میں اتنی ملائمت تھی اور وہ اتنے خلوص سے کہہ رہی تھی کہ انکار کرنا واقعی کفران نعمت کے مترادف تھا۔

''چلئے۔'' وہ کار سے باہر نکل کر اس کے ساتھ ساتھ چل دی برآمدے میں بڑی تیز روشنی ہو رہی تھی۔ رک کر اس نے فوزیہ پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ سفید ساڑھی میں ملبوس گداز جسم والی فوزیہ اسے بڑی اچھی لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' فوزیہ کی مسکراہٹ بھی بڑی دلفریب تھی۔

''آپ مجھے اچھی لگ رہی ہیں۔''

''اوہ!'' اور وہ صبا کی سادگی بھری صاف گوئی سے بے حد محظوظ ہوتے ہوئے بے اختیار ہنس دی۔

''فوزیہ!'' کمرے سے اس کے خاوند کی آواز آئی۔ ''جلدی آؤ بڑی سخت بھوک لگی ہے۔''

''جی آئی۔'' پھر وہ صبا سے مخاطب ہوئی۔ ''تمہیں بھی بھوک لگی ہو گی؟''

''ہاں۔'' اس نے اقرار میں گردن ہلائی۔

''تو آؤ پھر۔'' فوزیہ کو اس کی بے تکلفی پسند آئی بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

’’فوزیہ! اب آ بھی جاؤ۔‘‘ اس کے خاوند نے پھر آواز دی۔

’’آ تو رہی ہوں۔ اگر اتنی ہی زیادہ بھوک لگی ہوئی ہے تو آپ کھانا شروع کریں۔‘‘ اور فوزیہ صبا کو سیدھا کھانے کے کمرے میں ہی لے گئی۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک بہت بڑی میز مختلف قسم کے کھانوں سے بجی تھی اور ایک کرسی پر وہی کار والا شخص بیٹھا بڑی للچائی ہوئی نگاہوں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔

’’آپ شروع کریں نا ہم ہاتھ دھو کر آ رہی ہیں۔‘‘ فوزیہ نے خاوند کو یوں بیٹھے دیکھا تو بے اختیار مسکراتے ہوئے بولی۔ ’’آؤ صبا! یہاں ہاتھ دھولو۔‘‘ اور وہ خود بھی اسی کمرے میں لگے بیسن پر ہاتھ دھونے لگی۔

کھانے کے دوران وہ دونوں میاں بیوی آپس میں نجانے کیا کیا باتیں کرتے رہے، صبا نے دھیان دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ہر طرف سے بے خبر اپنی ہی سوچوں میں کھوئی بیٹھی کھانا کھاتی رہی۔

سب کچھ ہی کتنا لذیذ تھا۔ وہ بھوک سے بھی زیادہ ہی کھا گئی۔ کھانا ختم ہوا تو فوزیہ اسے لئے دوسرے کمرے میں آئی۔

’’یہ تمہارا بستر ہے اور وہ رات کو پہننے والے کپڑے۔‘‘

صبا نے اس ریشمی شب خوابی کے لباس کو دیکھا اور پھر غیر ارادی طور پر اس کی نگاہیں اپنے پہنے ہوئے کپڑوں پر جا پڑیں۔ وہ ان سے کہیں زیادہ قیمتی تھے۔ بڑی شرمندگی سے اس نے فوزیہ کی جانب دیکھا۔

’’صبح تمہارے لئے دوسرے کپڑوں کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔‘‘ فوزیہ بڑی سمجھدار تھی۔ صبا کی نگاہ سے ہی سب کچھ بھانپ گئی تھی۔ ’’اور وہ دیکھو، وہ غسلخانہ ہے تولیہ صابن وغیرہ سب کچھ وہاں موجود ہے۔ یہ ساتھ والا ڈریسنگ روم ہے۔ سنگھار میز پر کنگھا برش، کاجل، سرخی پاؤڈر سب کچھ موجود ہے بلا تکلف استعمال کر سکتی ہو۔‘‘

پھر وہ صبا کی جانب بڑی اپنائیت اور پیار سے دیکھتے ہوئے مسکرا دی۔ ’’اب آرام سے سو جاؤ صبح ملاقات ہوگی شب بخیر!‘‘ اور وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی کمرے سے

باہر نکل گئی۔

صبا دم بخود سی کھڑی تھی۔ فوزیہ نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا تو کھٹاک کی آواز سے چونکی۔ وہ شاید کسی پریوں کے دیس میں چلی آئی تھی اس نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ کھڑکیوں اور دروازوں میں بڑے خوبصورت ریشمی پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے کے پورے فرش پر بہت موٹا اور نرم قالین بچھا تھا بے ساختہ اس کی نگاہ اپنے پاؤں کی طرف اٹھ گئی۔

اتنے خوبصورت قالین پر اس کی پرانی سی جوتی کچھ زیادہ ہی بدنما لگ رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ پرے ہٹ گئی جوتی اتار کر اب ننگے پاؤں قالین پر رکھے تو اسے بہت بھلا محسوس ہوا۔ کچھ دیر وہ بلا مقصد ہی اس پر اِدھر اُدھر چلتی رہی۔

پھر اس کی نگاہ بستر پر جا پڑی۔ بڑا خوبصورت پلنگ تھا اور اس کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر انتہائی نفیس لیمپ رکھا تھا اس نے قریب جا کر اس کا بٹن دبایا۔ کمرے کی تیز روشنی میں اس کی ہلکی آسمانی روشنی گم سی ہو کر رہ گئی۔ کچھ سوچ کر اس نے کمرے کی بجلی بجھا دی۔ اب ہر طرف آسمانی روشنی پھیل گئی تھی۔ اس ہلکی روشنی میں سارے کمرے کا ماحول بڑا ہی سہانا لگ رہا تھا۔

ساتھ والے ڈریسنگ روم میں جا کر اس نے وہی شب خوابی کا لباس پہن لیا۔ وہ شاید فوزیہ کا تھا۔ لیکن ڈھیلا ہونے کے باوجود اسے بہت پسند آیا جسم کے ساتھ اس کا نرم نرم لمس کسی اور ہی قسم کا احساس دلا رہا تھا۔ وہ سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو کر شیشے میں سے اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

یہ ہلکے گلابی رنگ کا لباس اس پر کتنا پھب رہا تھا وہ اپنے آپ ہی سے شرما گئی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے پھر سونے کے کمرے میں آئی۔

بستر اتنا نرم تھا کہ وہ اس پر بیٹھ کر کتنی ہی دیر اس کی ملائم ملائم سطح پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر بڑی آہستگی سے لیٹ گئی۔ تکیوں کے اندر نجانے کیا بھرا ہوا تھا کہ ان کی نرمی رخسار رگڑنے لگی۔ ایسا شاندار کمرہ، اتنا نرم گداز بستر، یہ ملائم سا ریشمی لباس، ساری زندگی

تھا؟ وہ بے حد خوش تھی اب تو ماں سے انتقام کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا تھا اتنی خوشگوار زندگی پر کون ہوگا جو موت کو ترجیح دے گا۔

''ارے! تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو میں تیار ہو بھی گئی۔''

''اوہ!'' اس نے سر اٹھا کر فوزیہ کی جانب دیکھا اس کی عمر پینتیس سال سے بھی زیادہ ہوگی۔ اور وہ دو بچوں کی ماں بھی تھی مگر چہرے بشرے سے وہ چوبیس پچیس سے زیادہ نہ لگتی تھی۔ صبا اس کی سج دھج دیکھتی رہ گئی۔

''کیا جانے کا ارادہ نہیں؟''

''کیوں نہیں۔'' صبا جلدی سے بولی۔ جتنی فلمیں اس نے دیکھی تھیں سب ہی اسے بہت اچھی لگی تھیں۔ اتنی اتنی خوبصورت لڑکیاں گاتی ہوئی اور رقص کرتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ انہیں فلم کے علاوہ دیکھے اور سٹوڈیو جانے سے یقیناً اس کی یہ خواہش پوری ہوسکتی تھی پھر وہ کیسے انکار کرتی۔

''تو چلو نا پھر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔''

''لیکن یہ ساڑھی باجی! مجھ سے نہیں باندھی جائے گی۔''

''کیوں نہیں باندھی جائے گی۔'' فوزیہ نے بڑی پیار بھری گھرکی ڈالی۔ ''میں ابھی تمہیں سکھائے دیتی ہوں بالکل مشکل نہیں ہے۔''

صبا ذہین کافی تھی بہت جلد ہر بات سمجھ جاتی۔ فوزیہ کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑتی تھی۔ ساڑھی میں تو اس کے متناسب جسم کا حسن اور بھی چمک اٹھا تھا۔ اسکے لمبے لمبے بالوں کا بڑا سا جوڑا بناتے ہوئے فوزیہ نے نگاہ بھر کر آئینے میں اسے دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی باریک لکیر انہیں اور بھی خوبصورت بنا رہی تھی۔ سفید موتیوں کی دو لڑی والی مالا اس کی صراحی دار گردن کا حسن اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔ وہ اپنے حسین چہرے اور مناسب دراز قد سے کسی ملکہ کی طرح باوقار لگ رہی تھی۔ فوزیہ کی نگاہیں جمی کی جمی رہ گئیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔

''صاحب کا فون آیا ہے کہ وہ سٹوڈیو میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں کب تک

پہنچیں گی؟''

''بس انہیں کہہ دو آ ہی رہی ہیں اور زینت سنو۔'' ملازمہ کو واپس جاتے جاتے فوزیہ نے پھر مخاطب کیا۔ ''حفیظ سے کہو گاڑی باہر نکالے۔''

''جی بہت اچھا باجی! تھوڑی دیر ٹھہر جائیں طاہر اور نائلہ سکول سے آ جائیں تو انہیں بھی ساتھ لے چلیں۔''

''نہیں۔ بچوں کے جانے والی جگہ نہیں ہے اور پھر پچھلے دو تین دن عجائب گھر اور چڑیا گھر وغیرہ کی سیر تو کر لی اب گھر بیٹھ کر پڑھیں۔ امتحان قریب آ رہے ہیں۔'' فوزیہ جلدی جلدی بولی۔ ''چلو آؤ ہم چلیں بہت دیر ہوگئی۔''

دونوں اکٹھی باہر نکلیں۔ گیراج میں سے چھوٹی کار نکالے شوفر ان کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔

19

''آپ کو بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔''

''اچھا ابھی آئی۔'' زینت کو جواب دے کر وہ ویسے ہی بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہی تھکاوٹ سے ابھی تک اس کا جسم چور چور تھا۔

سہ پہر کو سٹوڈیو گئی ہوئی وہ رات کو تین بجے واپس آئی تھی۔ فوزیہ کے خاوند نے بڑی اچھی طرح انہیں سارا سٹوڈیو دکھایا تھا۔

کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی کتنی دیر وہ دیکھتی رہی تھیں۔ ایک تیار فلم کے چیدہ چیدہ مناظر بھی انہیں دکھائے گئے تھے۔ کسی فلم کے لئے نور جہاں کا گانا ریکارڈ ہو رہا تھا وہ بھی سنا تھا۔ کئی مشہور اداکاراؤں، اداکاروں اور ہدایت کاروں سے اس نے صبا کا تعارف کرایا تھا۔ فوزیہ تو شاید انہیں پہلے سے ہی جانتی تھی کیونکہ وہ ان سے خاصی بے تکلفی سے

باتیں کرتی رہی تھی البتہ اسے اتنے لوگوں میں بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی۔ سارا وقت وہ زیادہ تر خاموش ہی رہی تھی مگر پھر بھی وقت بڑا دلچسپ گزرا تھا۔

واپس آئیں تو بستر پر لیٹتے ہی اسے نیند آ گئی اور اب زینت کے آنے سے بمشکل دو منٹ پہلے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

ویسے ہی لیٹے لیٹے گردن اٹھا کر اس نے میز پر رکھی گھڑی کی طرف نگاہ کی۔ دس بج چکے تھے۔ اپنی ساری زندگی میں اتنا دن چڑھے تک وہ کبھی نہیں سوئی تھی۔ اسے پوری طرح احساس تھا مگر وہ پھر بھی لیٹی رہی اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ فوزیہ بلا رہی تھی اسے جانا چاہیے تھا یہ سوچ کر جی نہ چاہتے ہوئے بھی آخر اسے اٹھنا ہی پڑا۔ مگر ذہن میں ابھی تک کل کے واقعات ہی گردش کر رہے تھے۔

سب نے ہی ان کی کتنی خاطریں کی تھیں۔ کسی نے چائے پلائی تھی تو کسی نے کوکا کولا۔ ایک ہدایت کار نے بڑی مزیدار آئسکریم کھلائی تھی۔ اس کا ذائقہ ابھی تک اسے اپنے منہ میں محسوس ہو رہا تھا۔ غرض ہر کوئی اس کے ساتھ بے حد عزت اور پیار سے پیش آیا تھا اور وہ جو ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ گالی سنتی آئی تھی اس سلوک سے نہال ہو ہو گئی۔ اپنی اس بدلی قسمت پر اسے آپ ہی آپ رشک آ رہا تھا۔ اور یہ سب فوزیہ اور اس کے خاوند کی بدولت تھا۔ کتنے اچھے تھے دونوں! وہ من ہی من میں ان کی مشکور ہو رہی تھی اور اس وقت کو مبارک سمجھ رہی تھی جب وہ موٹر سائیکل والے کو چھوڑ کر کار میں جا بیٹھی تھی۔

''آؤ آؤ یہاں میرے پاس بیٹھو۔'' فوزیہ کی آواز سن کر صبا چونکی۔ خیالات میں کھوئی خود فراموشی کے عالم میں جانے کب وہ فوزیہ کے کمرے میں آ پہنچی تھی۔ ''کیا بہت تھک گئی تھیں؟'' فوزیہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''ناشتہ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو گیا۔ دو تین بار تمہیں زینت دیکھنے گئی مگر تم سو رہی تھیں۔''

''جی ہاں۔'' صبا مختصراً بولی۔

''زینت!'' فوزیہ نے بلند آواز میں پکارا۔ ''صبا کے لئے ناشتہ یہیں لے آؤ اور میں صرف چائے کی ایک پیالی پیوں گی۔''

''ہاں صبا!'' پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔ ''سناؤ پھر کل کی سیر کیسی رہی کچھ پسند آئی؟''

''ہاں بہت۔'' صبا نے بڑی صاف دلی سے کہا۔ ''سچی باجی میرا تو وہاں سے آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔''

''اگر تمہیں وہ جگہ اتنی ہی پسند ہے تو کل پھر چلے جائیں گے۔''

''نہیں نہیں روز روز تو اچھا نہیں نا لگتا۔'' اس کے لہجے میں سادگی تھی۔

''صبا! آج میں تمہیں ایک بات بتاؤں؟''

''جی۔'' کوئی خاص بات ہی ہو گی جبھی تو فوزیہ نے اس انداز میں کہا تھا وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''شادی سے پہلے میں فلموں میں کام کیا کرتی تھی۔''

''کیا سچ؟'' صبا بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔

''ہاں بالکل سچ!'' اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو فوزیہ جھٹ تاڑ گئی۔ ''تم اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو فلموں میں کام کرنا کوئی ایسی انوکھی بات تو نہیں۔''

''لیکن لیکن۔'' اور صبا بڑبڑا کر رہ گئی۔ کچھ کہہ نہ سکی۔

زینت اس کے لئے ناشتہ لے آئی تھی۔ وہ جھک کر فوزیہ کے لئے پیالی میں چائے انڈیلنے لگی۔

''لیکن کیا؟'' جیسے فوزیہ کچھ سننے کے لئے بے تاب ہو۔

''میں نے تو سنا ہے فلموں میں کام کرنا اچھا نہیں ہوتا۔'' صبا نے قدرے جھجکتے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

''یہ تمہیں کس نے کہا؟'' فوزیہ ذرا تیزی سے بولی۔ ''پڑھے لکھے اور آزاد خیال لوگوں کا تو قطعی یہ خیال نہیں۔ البتہ جاہل اور دقیانوسی قسم کے لوگ کہتے ہوں گے۔''

''میری دادی اماں اور پھپھو کہا کرتی تھیں۔''

''اوہو!'' فوزیہ بڑے زور سے قہقہہ لگا اٹھی۔ ''تمہاری دادی اماں اور پھپھو کو ان

باتوں کا کیا علم...... وہ ٹھہریں پرانے زمانے کی عورتیں جو اکثر سنے سنائے پر یقین کئے بیٹھی رہتی ہیں۔ حقیقت وہ کیا جانیں‘ اب تم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ کوئی برائی نظر آئی تمہیں؟“

”نہیں تو۔“

”تقریباً آٹھ دس سال میں نے فلموں میں کام کیا ہے مجھے تو آج تک کوئی عیب دکھائی نہیں دیا۔ خود میرا اپنا خاوند فلمیں بناتا ہے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو نہ میں خود کام کرتی اور نہ اپنے خاوند کو ایسا معیوب کام کرنے دیتی۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“ صبا نے فوزیہ سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔

”میں تو کہتی ہوں صبا! تم بھی فلموں میں کام شروع کر دو۔“

”کیا؟“ صبا ایک دم سٹ پٹا سی گئی۔

”ہاں ہاں کیا ہرج ہے؟“

”میں۔ میں۔“ وہ بڑی بری طرح گھبرا گئی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فوزیہ ایسی عجیب بات کر بیٹھے گی۔

”ہائے! تم اتنا پریشان کیوں ہو گئیں۔ یقین کرو تمہیں بالکل اپنی حقیقی بہن کی مانند سمجھتے ہوئے میں نے ایسا مشورہ دیا ہے۔“ پھر وہ صبا کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر بولی۔ ”تمہارا کوئی گھر نہیں‘ کوئی آسرا نہیں بالکل بے سہارا ہو اچھا ہے خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاؤ گی۔“

صبا سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی قدرے توقف کے بعد فوزیہ پھر بولی۔

”سوچو تو...... دربدر ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہو۔ پھر تم خود زمانے کو ٹھوکر لگانے کے قابل ہو جاؤ گی۔ آج تمہیں کوئی پوچھتا نہیں کل ہر کوئی تمہاری جھلک دیکھنے کو بے تاب ہوگا۔“ فوزیہ کا لہجہ تیز ہوتا جا رہا تھا اور صبا بڑے دھیان سے اس کا ایک ایک حرف سن رہی تھی۔ جو سو فیصدی نہ سہی لیکن بڑی حد تک درست تھا۔

”آج تمہارے پاس ایک وقت کا پیٹ بھرنے کو کچھ نہیں ہے۔ ہمت کرو کل نوکر

چاکر‘ ایسی ہی خوبصورت کاریں‘ ایسا ہی وسیع و عریض بنگلہ تمہارا اپنا ہوگا تمہاری اپنی ملکیت تمہیں کسی کے ہاتھوں کی طرف دیکھنا نہ پڑے گا۔“

صبا خاموش بیٹھی تھی انڈے مکھن‘ توس وغیرہ سب کچھ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی ٹھنڈی ہو چکی تھی مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ فوزیہ کی باتوں نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

”کیا ہوا صبا! کیا میری کوئی بات بری لگی؟“ کتنی دیر خاموشی سے بیٹھے صبا کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے بڑی حلیمی سے پوچھا۔

”نہیں باجی! آپ نے تو جو کچھ کہا ٹھیک ہی کہا۔“

”پھر یوں خاموش کیوں ہو گئیں؟“

”آپ کے مشورے کے متعلق سوچ رہی تھی۔“

”میں تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کر رہی صبا! تم میری چھوٹی بہن ہو۔ جب تک جی چاہے میرے پاس رہو۔ میں تمہیں بوجھ نہیں سمجھتی۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے باجی!“

اور وہ مزید کچھ کہے بغیر کھوئی کھوئی سی اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

یہ خوبصورت کمرہ اور اس کا سہانا ماحول‘ یہ اس کا زیب تن کیا قیمتی لباس کہیں آنے جانے کے لئے موجود کاریں‘ ہر خدمت کو تیار کھڑے ملازم اور ملازمائیں غرضیکہ یہ ساری شان و شوکت اس کی اپنی نہ تھی کسی کی تھی۔ وہ خود تو بالکل تہی دست اور بے خانماں تھی۔ فوزیہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی صبا سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ اس کا اپنا بھی ہو سکتا ہے صرف اپنی ملکیت! فوزیہ کی ایک ایک بات اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اور وہ خیالات میں ڈوبی کسی بے قرار روح کی طرح کمرے کے اندر چکر لگا رہی تھی۔

20

''صبا! ہاشمی صاحب تمہیں بلا رہے ہیں۔''

وہ بیٹھی بڑی محویت سے شوٹنگ دیکھ رہی تھی کہ دردانہ نے آ کر اس سے کہا۔ اس وقت اس کا دل بالکل اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا اتنا شاندار منظر فلمایا جا رہا تھا! مگر ہاشمی صاحب کے بلاوے پر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جانا پڑا وہ جس فلم میں کام کر رہی تھی اس کے فنانسر وہی تھے۔ انکار نہ کر سکی چہرے پر ناگواری کی سلوٹیں لئے اٹھ کر چل دی۔

کتنے دنوں سے وہ روز سٹوڈیو آ رہی تھی وہ جس فلم میں کام کرنے والی تھی اس کی ابھی تھوڑی سی کاغذی تیاری باقی تھیں اس لئے اسے اپنا کام تو کوئی ہوتا نہیں تھا دوسری فلموں کی شوٹنگ ہوتے دیکھتی رہتی۔

فوزیہ کا خاوند اسے روز اسی مقصد کے تحت یہاں لے آتا تھا کہ اس طرح جب اپنی فلم میں کام کرنے کا وقت آئے تو وہ کافی تجربہ حاصل کر چکی ہو گی اور پھر اس پر بہت زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔

''آ جاؤ تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔'' ہاشمی صاحب کے کمرے سے باہر ہی کھڑی دروازے کے اندر سر گھسیڑ گھسیڑ کر وہ جھانک رہی تھی کہ آواز آئی۔ وہ ٹھٹک گئی سامنے والی کرسی پر جہاں وہ اکثر تشریف فرما ہوتے تھے اس وقت تو نہیں تھے پھر آواز کہاں سے آئی تھی وہ وہیں کھڑی ہو کر سوچنے لگی۔

''اب آ بھی جاؤ۔'' اندر سے پھر آواز آئی۔

اس نے گردن آگے بڑھا کر پرلی طرف دیکھا ادھر کونے میں پڑے صوفہ پر وہ نیم دراز تھے صبا اندر چلی گئی۔

''دروازہ بند کرتی آؤ اور کوئی نہ آ جائے بہت ضروری گفتگو کرنا ہے۔'' صبا نے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے ان کے قریب چلی گئی۔

''یہاں بیٹھ جاؤ۔'' انہوں نے خود سمٹتے ہوئے اپنے پاس ہی اس کے لئے جگہ بنائی مگر صبا ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''فرمائیے۔'' اس نے بڑے مودبانہ کہا۔ کیونکہ یہاں پر سب ہی ہاشمی صاحب کی بہت عزت کرتے تھے۔ فوزیہ کا خاوند بھی ان کے اشارے پر چلتا تھا۔ پھر وہ کیسے نہ کرتی۔ ویسے دلی طور پر نجانے کیوں اسے پہلی ملاقات سے ہی ہاشمی صاحب کچھ اچھے نہیں لگے تھے۔ بظاہر دیکھنے میں ان میں کوئی عیب اسے دکھائی نہیں دیا مگر پھر بھی ان سے بات بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ نجانے کیوں؟ بہت سوچنے پر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ سکا تھا کہ آخر ایسا کیوں تھا۔

اس کے برعکس ہاشمی صاحب تھے کہ تقریباً روز اسے اپنے کمرے میں بلا بھیجتے اور بلا مقصد ہی اِدھر اُدھر کی گپ شپ مارتے رہتے۔ ان کے بلانے پر آ تو وہ جاتی تھی مگر صرف مجبوری کے تحت!

''سناؤ یہاں کا ماحول پسند آیا؟''

''جی ہاں بس ٹھیک ہی ہے۔''

''یعنی کہ خوش ہو۔'' انہوں نے ہنس کر کہا۔ ہاشمی صاحب اکثر بلا وجہ ہی ہنس دیا کرتے تھے۔ اور ان کی عادت صبا کو بالکل اچھی نہیں لگتی تھی۔ ان کی ہنسی کا جواب ہلکی سی مسکراہٹ سے دے کر خاموش ہو گئی۔

''ذرا مجھے گلاس میں وہ شربت تو تھوڑا سا ڈال دو۔'' ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے گلاس میں سے آخری گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے انہوں نے سامنے پڑی میز کی طرف اشارہ کیا۔

صبا نے اٹھ کر گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا اور ان کے حکم کے مطابق تھوڑا سا شربت اس میں ڈال دیا۔ نہ جانے وہ کیسا شربت تھا عجیب طرح کی بو صبا کے ناک میں چڑھی۔ ایک دم اس کی ناک سکڑ گئی اور اس نے گلاس جلدی سے ہاشمی صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ وہ صبا کی سکڑی ہوئی ناک دیکھ کر بے اختیار قہقہہ لگا اٹھے۔

''جانتی ہو یہ کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''یہ آبِ حیات ہے۔'' انہوں نے ہاتھ سے گلاس پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے صبا کا بازو پکڑتے ہوئے کھینچ کر اسے اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ ''لو تم بھی چکھو۔''

''نہیں نہیں۔'' سر پیچھے ہٹاتے ہوئے صبا بے اختیار چلا پڑی اتنی دور سے ہی اس کی بساند دماغ کو چڑھ رہی تھی تو منہ کیسی لگاتی! ''مجھے تو دور سے ہی ابکائی آ رہی ہے۔''

اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا۔

''پہلے ایسے ہی لگتا ہے مگر بعد میں جو سرور آتا ہے اور ذائقہ وہ بو وغیرہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔''

''اچھا! تو یہ شراب ہے۔''

''ہاں۔'' ہاشمی صاحب پھر ہنس دیئے۔

''چھی چھی بُری بات۔'' صبا بے ساختہ بولی۔

''میں نے سنا ہے تم فلم میں کام کرنے کو بھی برا کہتی تھیں جس طرح وہ شروع کر دیا اسی طرح ایک دن یہ بھی پینے لگو گی۔'' اور وہ پھر قہقہہ لگا اٹھے۔ ''یہاں جو بھی آتا ہے پہلے پہل ایسی ہی باتیں کرتا ہے اور پھر سب ٹھیک ہو جاتے ہیں سب ٹھیک!''

انہوں نے صبا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا شاید نشہ چڑھ رہا تھا۔ ''فوزیہ' دردانہ' کرن' دیکھو کیسے سب سیدھی راہ پر آ گئیں اب سب ہی پیتی ہیں۔''

بڑی حیرت سے ان کی بہکی بہکی باتیں سن رہی تھی حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کا اسے علم نہ تھا۔

''اور میری جان ایک دن تم بھی ایسی ہو جاؤ گی خود بھی پیو گی اور اپنے گورے گورے ہاتھوں سے مجھے بھی پلاؤ گی۔'' انہوں نے صبا کے گرد بازو پھیلا دیا۔ اور دوسرے ہاتھ سے ایک اور گھونٹ چڑھا گئے۔

''چھوڑیئے مجھے' صبا نے تلخی سے کہا اور خود کو ان کی گرفت سے چھڑانے لگی۔

''مجھے ایسی بے تکلفی اچھی نہیں لگتی۔''

''کیوں اچھی نہیں لگی؟'' انہوں نے بڑے طنز سے صبا کو گھورا۔ ''اور یہ قیمتی قیمتی لباس' اچھی سے اچھی خوراک اور کاروں کی سیریں' کیا یہ سب اچھا لگتا ہے؟'' انہوں نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے دوسرا بازو بھی صبا کے گرد پھیلا دیا۔

اب وہ پوری طرح ان کے شکنجے میں تھی۔

''کیا مطلب؟'' وہ بڑی متحیر سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی اور ساتھ ساتھ کسمساتے ہوئے خود کو ان کے بازوؤں سے نکالنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔

''مطلب یہ کہ یہ اسی کی قیمت ہے۔''

''اوہ!'' صبا چونکی ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں پوری طرح سارا معاملہ آ گیا تھا۔

''تو یہ بات ہے۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ لیکن مجھے ایسی دولت نہیں چاہیے جو عزت دے کر ملے۔'' پھر اس نے بڑی حقارت سے انہیں دیکھا۔ ''اپنی دولت اپنے پاس ہی رکھیے اور مجھے جانے دیجئے میں یہاں نہیں رہوں گی۔''

''مگر اب تو تم معاہدہ کر چکی ہو۔''

''وہ آج سے منسوخ سمجھئے۔''

''لیکن اب تو ایسا نہیں ہو سکتا اب تو تمہیں اس کی رو سے کام کرنا ہی پڑے گا تم اب کہیں نہیں جا سکتیں۔'' وہ بڑے طنز سے ہنسے۔

''میں کسی معاہدے وغیرہ کو نہیں جانتی۔ بھاڑ میں جائے ایسا معاہدہ۔ مجھے کسی کی کوئی پروا نہیں ہے۔''

''دیکھوں گا کیسے نہیں ہے۔'' ہاشمی صاحب کو بھی ضد آ گئی۔ ''خود کو سمجھتی کیا ہو!'' اور وہ زبردستی پر اتر آئے۔ بازوؤں کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے انہوں نے اپنا منہ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا۔

''ہاشمی صاحب! چھوڑ دیجئے مجھے ورنہ میں زور سے چلا دوں گی پھر خواہ مخواہ آپ سب میں بے عزت ہو جائیں گے۔''

"میری کبھی بے عزتی نہیں ہوسکتی میرے پاس دولت ہے۔" انہوں نے بڑے غرور سے کہا اور پھر بڑے زور سے ہنسے۔ "چلاؤ بے شک اپنی پوری آواز سے چلاؤ۔ مگر دیکھ لینا تمہاری آواز کسی کے کان میں نہیں پہنچے گی میری دولت نے سب کے کان بند کر رکھے ہیں۔"

"میں فوزیہ باجی کے خاوند کو بلاتی ہوں۔"

اور اب ہاشمی صاحب کے قہقہے نے سچ مچ درو دیوار ہلا دیئے۔

"وہ تو میری بائیں مٹھی میں ہے تم اسے کیا سمجھتی ہو۔" وہ پھر بڑے غرور سے مسکرائے۔ "تمہاری نہیں میری آواز پر وہ بھاگا بھاگا آئے گا۔"

صبا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اب کیا کرے؟ وہ بری طرح پریشان ہونے لگی۔ کیسی بری جگہ آ پھنسی تھی۔

شراب کا نشہ جوں جوں تیز ہو رہا تھا صبا کے گرد ہاشمی صاحب کی گرفت بھی مضبوط ہوتی جا رہی تھی اور اس کے علاوہ ان کی دوسری زبردستیاں بھی بڑھنے لگی تھیں۔ بار بار اپنا منہ صبا کے چہرے کے قریب لے جاتے وہ اِدھر اُدھر ہو کر ان کی ہر جارحانہ کوشش سے خود کو بچا تو رہی تھی مگر تابہ کے! آخر وہ ایک کمزور صنف عورت سے تعلق رکھتی تھی اور ہاشمی صاحب کی نسبت زیادہ طاقت کے مالک مرد ہونے کے علاوہ کھا کھا کر پلے ہوئے بھی تھے۔ پریشانی اور فکر کے مارے صبا کی جان نکلی جا رہی تھی۔ کسی طرح ان کے بازوؤں کے حلقے سے نکل آتی۔ صبا سوچ رہی تھی تو پھر تو ان کے چنگل سے چھڑانا زیادہ مشکل نہ تھا وہ ان کے مقابلے میں بہت دبلی پتلی تھی۔ بڑی آسانی سے بھاگ کر دور جا سکتی تھی۔ مگر یہ ان کے مضبوط بازوؤں کا حلقہ! اب تو اسے اپنا سانس بھی گھٹتا محسوس ہو رہا تھا اس نے پوری قوت سے ان کے بازو میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔

"اس طرح کچھ نہیں بنے گا۔" وہ زور سے ہنسے۔

"اب تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے نہیں چھڑا سکتی۔"

اور واقعی اپنی ہر کوشش کے باوجود وہ اس کے حلقے کو نہ توڑ سکی۔ انہوں نے اس

کے گرد سے لے جا کر دونوں ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسا رکھے تھے صبا کے کاٹنے سے بازو سے خون نکل آیا تھا وہ درد سے بلبلا اٹھے تھے۔ لیکن انہوں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔

"خبیث! پاجی! کمینے! چھوڑ مجھے تیری اپنی بھی چار لڑکیاں ہیں کچھ خدا کا خوف کر۔"

"میری لڑکیوں کا نام لینے والی تو کون ہوتی ہے۔"

"خدا کرے ان سب کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو۔" بے بس ہوتے ہوئے صبا نے بددعا دی۔ بات بڑی سخت تھی انہیں ایک دم غصہ آ گیا۔ آگ بگولہ ہوتے ہوئے انہوں نے ایک زوردار تھپڑ صبا کے چہرے پر جڑ دیا۔ بے شک اس کا رخسار جل اٹھا تھا مگر اسے اس تکلیف کی پروا نہ تھی۔

وہ مضبوط حلقہ ٹوٹ گیا تھا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے پورا زور لگا کر خود کو چھڑا لیا اور بڑی پھرتی سے بھاگ کر دور جا کھڑی ہوئی وہ بڑی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ یہ سب کچھ اس طرح پلک جھپکنے میں ہو گیا تھا کہ خود ہاشمی صاحب بھی ہکا بکا رہ گئے۔ حقیقت کا احساس ہوا تو اس کے پیچھے بھاگنے کے لئے اٹھ ہی رہے تھے کہ صبا نے شراب والا برتن اٹھایا اور ساری کی ساری ان کے چہرے پر پھینک دی۔

"تیری یہ جسارت!" ان کی آنکھیں بند تھیں اور بالوں میں سے شراب کے قطرے قطار در قطار ان کے چہرے پر گر رہے تھے۔ "اب تو تجھے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" وہ آنکھیں صاف کرنے کے لئے جلدی جلدی جیبوں میں سے رومال تلاش کرنے لگے۔ تا کہ اسے پھر گرفت میں لے سکیں۔ مگر صبا بھی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب تک کہ وہ آنکھیں صاف کرتے وہ دروازہ کھول کر باہر نکل چکی تھی۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ایک سمت کو بھاگی۔ اتنے دنوں میں وہ سٹوڈیو کے راستوں سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔

ہمیشہ ہی رات کی تاریکی سے اسے بہت ڈر لگا کرتا تھا مگر اس وقت تاریکی نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ اندھیرے اندھیرے میں سے گزرتے ہوئے چھپتے چھپاتے وہ سٹوڈیو کی حدود سے نکل گئی۔ فوزیہ کے گھر کے دروازے بھی اب اس کے

لئے بند ہو گئے تھے۔ ایک بار پھر طوفان میں بہتے تنکے کی طرح بے یار و مددگار تھی۔ اور رات تاریک اور سنسان تھی۔ جیسے گزری ہوئی ساری عمر ہی وہ چلتی رہی تھی۔ تھک کر اسے یہی محسوس ہو رہا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ رات کی تاریکی صبح کے اجالے میں منہ چھپاتی پھر رہی تھی۔

اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی زیادہ آباد علاقہ نہیں تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکا دکا مکان بنے ہوئے تھے۔ جو سب سے پہلا دکھائی دیا اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر زمین پر ہی بیٹھ گئی۔ بوجھل دماغ تھا اور بوجھل پاؤں۔ مزید ایک لمحہ کے لئے کچھ سوچنے اور ایک قدم چلنے کی سکت نہ تھی۔ سانس پھول رہا تھا۔ پیاس تھی کہ اپنی شدت سے اسے بے قرار کیے دے رہی تھی۔ جب ذرا دم میں دم آیا تو اسے بجھانے کی تدبیر سوچنے لگی۔ دور دور تک کوئی متنفس بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ مانگ ہی لیتی۔ پانی کے دو گھونٹ کا کیا تھا شاید ہی کوئی پلانے سے انکار کرتا۔

گزرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ پیاس اور بھی شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔

جب بالکل برداشت سے باہر ہو گئی تو بے قرار ہو اٹھی اور جس مکان کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی تھی اسی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جب مانگنا ہی تھا تو دوسرے تیسرے در تک کیوں جاتی۔ یہی کیوں نہ سہی!

دو تین بار کھٹکھٹایا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ نہ جانے گھر والے کسی مردوں سے بھی بدتر نیند سوئے تھے کہ جاگ ہی نہیں رہے تھے۔ اور اب کی بار اس نے اپنی پوری قوت سے دروازے کو پیٹ ڈالا۔ اگر چند منٹ اور اسے پانی نہ ملا تو اس کا بے ہوش ہو جانا یقینی تھا۔

''کیا ہے کیوں اتنی زور زور سے دروازہ پیٹا جا رہا ہے؟''

جدھر سے آواز آئی تھی ادھر اس نے رخ پھیرا ساتھ والے مکان کے کھلے دروازے میں ایک شخص آنکھیں مل مل کر جھانک رہا تھا۔

''اس مکان میں کوئی نہیں رہتا اتنا بڑا تالا لگا ہوا دکھائی نہیں دے رہا۔'' بڑا اکھڑ سا لہجہ تھا۔

صبا نے اس کی بات کی صداقت معلوم کرنے کے لئے پورے دروازہ پر نگاہ دوڑائی۔ سچ مچ نیچے والی کنڈی پر اتنا بڑا قفل پڑا ہوا تھا۔

''اوہ!'' وہ کھسیانی ہو کر رہ گئی۔

''کس سے ملنا ہے؟'' وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

''کون ہے؟'' پیچھے سے کسی نے اس شخص سے پوچھا تھا۔

''معلوم نہیں کوئی عورت ہے ساتھ والے خالی مکان کا دروازہ کھٹکھٹا رہی ہے۔''

اس نے پیچھے گردن موڑ کر کہا اور پھر مڑ کر صبا کی جانب دیکھنے لگا جو اب اسی کی سمت چلی آ رہی تھی۔

''پیاس لگی ہے دو گھونٹ پانی مل جائے گا؟''

وہ صبا کو سر سے پیر تک غور سے دیکھنے لگا۔ ''ہاں۔'' اور پھر وہ مزید کچھ کہے بغیر مڑ گیا صبا وہیں چوکھٹ پر بیٹھ کر پانی کا انتظار کرنے لگی۔

''آخر ہے کون؟'' اسے اندر سے کسی کی آواز سنائی دی۔

''اب یہ مجھے کیا علم کہ کون ہے بتا تو دیا کہ کوئی عورت ہے۔'' پھر وہی تند لہجہ ''ایسا مزیدار خواب دیکھ رہا تھا۔'' وہ بڑبڑایا اور ساتھ ہی کسی برتن میں پانی انڈیلنے کی آواز آئی۔

''تجھے تو بس ہر وقت خواب ہی دکھائی دیتے رہتے ہیں۔'' یہ کسی عورت نے کہا تھا اس کے بعد وہ بڑے زور سے ہنس دی۔

''اور تو ہر وقت ہنہناتی رہتی ہے۔'' بڑے غصیلے لہجے میں کہا گیا۔

''یہ پانی کہاں لئے جا رہے ہو؟''

''اس نے مانگا ہے۔''

اور پھر قدموں کی آواز ادھر آتی سنائی دی۔

''عجیب انسان ہے صحیح صحیح بتاتا ہی نہیں کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے؟''

''سرداراں! تو خود جا کر دیکھ۔''

’’یہ لو۔‘‘ وہ قریب آیا تو صبا جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے لیا۔ جیسے وہ خود میلے کچیلے پیوند لگے کپڑوں میں تھا ویسا ہی گندا سا ایلومینیم کا گلاس بھی تھا۔ جو ہاتھوں کے ساتھ چپک رہا تھا۔

صبا کو بڑی سخت کراہت محسوس ہوئی۔ وہ جہاں پلی بڑھی تھی اس گھر میں صفائی کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ خصوصاً پھپھو کو تو خبط کی حد تک عادت تھی۔ اٹھتے بیٹھتے ہاتھ دھوتی رہتیں اور برتن صاف کرتی رہتیں۔

اس کا دل چاہا وہیں کسی نالی میں گلاس اور پانی پھینک دے مگر دوسرے ہی لمحے پیاس کی شدت نے اسے اس کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ آپ ہی آپ اس کا ہاتھ ہونٹوں تک بڑھتا چلا گیا۔ اگر یہ بھی پھینک دیا تو پھر! اب تو بالکل ہی اس میں برداشت باقی نہ رہی تھی جیسا بھی تھا وہ اسے آب حیات سمجھ کر غٹا غٹ چڑھا گئی۔

گلاس خالی کر کے واپس دینے کے لئے بڑھایا۔ ساتھ ہی نگاہیں بھی اٹھ گئیں اور ایک کندھے پر اسے دو سر نظر آئے۔ اس کے کندھے کے اوپر سے سر نکال کر وہ اسے بڑی تجسس بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو وہ سانولا سا چہرہ ایک دم مسکرا اٹھا۔

’’اندر آ جاؤ۔‘‘ وہ صبا کے خوبصورت لباس کو بڑے اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔

’’کہیں شادی پر جا رہی ہو؟‘‘

صبا کو اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی مگر وہ ضبط کر گئی۔

’’نہیں۔‘‘

’’چلو شروع ہو جاؤ۔ باتیں تم عورتوں کو تو بس ایک ہی لت ہوتی ہے۔‘‘

وہ بڑی ناگواری سے بڑبڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے ہٹتے ہی وہ جوان لڑکی جلدی سے اس کی جگہ آ کھڑی ہوئی۔

صبا نے دیکھا وہ بھی اسی قسم کے لباس میں تھی۔ میلا اور پیوند زدہ! البتہ اس کے ہونٹوں پر بڑی پرسکون مسکراہٹ تھی۔ ان کا ایسا لباس دیکھ کر صبا کو ان پر بے حد ترس آیا مگر

ساتھ ہی اس کی سکون اور طمانیت بھری مسکراہٹ نے اس کے دل میں رشک پیدا کر دیا۔ بے شک اس کے اپنے تن پر یہ قیمتی کپڑے نہ ہوتے مگر کاش اس کے چہرے کو یہ سکون بھری مسکراہٹ نصیب ہوتی!

’’کیا بات ہے؟‘‘ اس نے صبا کو سوچوں میں کھوئے دیکھا تو مسکراتے ہوئے بولی۔

’’کچھ نہیں۔ تھکی ہوئی ہوں جی چاہ رہا ہے تھوڑی دیر کے لئے کہیں بیٹھ کر ستا لوں۔‘‘ صبا دبے دبے لہجے میں بولی۔ جیسے خود اپنے آپ سے ہی بات کر رہی ہو۔ صاف صاف نہ کہہ سکی تھی کہ وہ بے سہارا تھی اور اسے پناہ چاہیے تھی۔ وہ کوئی پیشہ ور منگتی تو تھی نہیں کہ بے تکلفی سے ہر ایک کے آگے دست طلب دراز کرتی پھرتی۔

’’ہاں ہاں آ جاؤ اندر جتنی دیر جی چاہے آرام کر لینا۔‘‘

’’سرداراں! باہر کی ہو کر ہی رہ گئیں!‘‘

’’آئی بابا!‘‘ وہ گردن موڑ کر وہیں سے چلائی اور پھر صبا کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’آ جاؤ۔‘‘

صبا نے ہچکچاتے ہوئے چوکھٹ میں قدم رکھا لمحہ بھر کے لئے ٹھٹکی کچھ سوچا اور پھر اس کے پیچھے پیچھے اندر چلی گئی۔

کافی بڑا کمرہ تھا لیکن پرانا سا تھا۔ جا بجا دیواروں کا پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ فرش کا بھی وہی حال تھا۔ جگہ جگہ سے اینٹیں نکل کر گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کسی کھنڈر میں آ گئی ہو۔ ایک کونے میں تھوڑے سے گندے گندے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ سارے کمرے میں کم از کم آٹھ دس نفوس تو ہوں گے ہی جو میلی سی دریاں بچھائے سو رہے تھے۔ اور ایک بوڑھا شخص جس کی سفید داڑھی پیٹ تک جھول رہی تھی۔ آنکھیں پھاڑے اسے آتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سرداراں نے آگے بڑھ کر جلدی جلدی ایک میلا سا کپڑا زمین پر بچھا دیا۔

’’یہاں بیٹھ جاؤ۔‘‘

"کون ہے یہ؟" وہی سفید لمبی داڑھی والا بوڑھا مخاطب تو سرداراں سے ہوا تھا مگر نگاہیں صبا پر جمی ہوئیں تھیں۔

"معلوم نہیں بابا۔" پھر اس نے صبا کے چہرے کی طرف مستفسرانہ نگاہ کی۔

"تھک گئی تھی۔ تھوڑی دیر ستانے کے لئے آ گئی ہوں۔" صبا نے مدھم لہجے میں وہی بات دہرادی۔

"کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ پھر۔"

اور بابا کی اجازت ملنے کی دیر تھی وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔

"سرداراں! اٹھا ان سب کو کام پر نہیں جانا دن چڑھ گیا ہے۔ صبح تڑکے ہی تو زیادہ کمائی ہوتی ہے اور تو ایک گھونٹ چائے کا پلا دے۔"

سرداراں بابا کے کہنے کے مطابق ایک ایک کو ہلا ہلا کر اور جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانے لگی۔ "چل بے اٹھ، کیسی لمبی تان کر سو رہا ہے۔ کیا تیری ماں قبر سے آ کر تیرے لیے کمائی کرے گی۔" ایک کی ٹانگ پکڑ کر اس نے کھینچی اور ساتھ ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی میں بابا بھی شریک ہو گیا تھا جس کی ٹانگ کھینچی تھی وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا اور بڑی تیوریاں چڑھا کر سرداراں کو گھورنے لگا۔

"سرداراں! تو اپنی شرارتوں سے باز آ جا ورنہ دیکھنا تو سہی کیسے گن گن کر بدلے لوں گا۔" یوں تو وہ دھمکی دے رہا تھا مگر اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔

"ابے جا جا بڑا آیا بدلے لینا والا۔ ایسی گئی گزری میں بھی نہیں۔" وہ اسے انگوٹھا دکھاتی ہوئی ساتھ والی کوٹھری میں بھاگ گئی۔ "بابا! اسے منع......"

اور ابھی اس نے اپنا فقرہ پورا نہیں کیا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ کونے میں بیٹھی صبا کی طرف اٹھ گئی۔ "ارے! یہ کون ہے؟" پھر وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"سن رے شیرے!" سرداراں کوٹھری سے نکل کر بھاگتے ہوئے اس کے قریب آ گئی اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر بڑے رعب سے بولی۔ "مجھے تیری ایسی نگاہیں ذرا پسند نہیں کوئی جوان عورت سامنے آ جائے تو تو ہمیشہ اسی طرح گھور گھور کر دیکھتا ہے۔ اگر تو اپنی

یہ عادت نہیں چھوڑے گا تو میں تجھ سے شادی نہیں کراؤں گی۔ کیوں بابا ٹھیک ہے نا؟"

بابا نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔

"ہاں تو میں نے کہہ دیا ہے۔"

"تُو تو چائے بنانے گئی تھی۔"

"بنا تو رہی ہوں۔" وہ بابا کی طرف تیوریاں چڑھاتے ہوئے دیکھ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ "ایک تو تمہیں صبح ہوتے ہی چائے کی پڑ جاتی ہے۔"

شیرا اس کے سانولے سے بگڑے چہرے کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"چاچا اپنا کام کر بیٹھا دانت نکال رہا ہے۔" اور پھر ساتھ ہی وہ مسکراہٹ کو ہونٹوں تلے دباتے ہوئے کونے میں جا کر چولھا جلانے لگی۔

صبا چپ چاپ بیٹھی ہوئی ہر ایک کی حرکات دیکھ رہی تھی۔ سبھی جاگ چکے تھے۔ وہ سب تین عورتیں چار مرد اور دو بچے تھے۔ ان کا ایک دوسرے سے رشتہ کیا تھا صبا کو کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سوائے سرداراں اور شیرے کے۔ ان کی نگاہوں کے انداز اور دبی دبی مسکراہٹوں سے ہی اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سرداراں شیرے کی منگیتر تھی!

ہر ایک نے اٹھتے ہی پہلا سوال بابا سے اسی کے متعلق کیا تھا۔ بابا کا جواب وہی تھا جو صبا نے اسے دیا تھا۔ کسی کی تسلی ہوئی کسی کی نہیں۔ بہرحال سب عجیب عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ صبا نے غور کیا سب کے تقریباً ایک جیسے ہی میلے' پھٹے ہوئے اور جا بجا پیوند لگے کپڑے تھے۔ بچے تو دونوں ہی ننگے تھے۔ ہائے بچارے! ان کی غربت نے صبا کو دکھی کر دیا۔

"چائے پیو گی؟" سرداراں اس کا کندھا ہلا کر پوچھ رہی تھی۔ صبا خیالوں میں کھوئی کھوئی نجانے کب اونگھ گئی تھی۔ جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

اس نے دیکھا سب ہی ایک ایک پیالہ پکڑے بیٹھے تھے۔ چائے پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ دونوں بچے اس کے قریب' عین سامنے اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عجوبہ ان کے گھر میں آ گیا تھا۔

"کل کی جمعرات تو خوب لگی۔" ان میں سے ایک بڑھیا اپنے پوپلے منہ میں زبان پھیرتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

"کل بہت کما لیا تبھی تو آج اتنا دن چڑھے تک سب سوتے رہے۔" بابا نے طنز سے کہا۔

"رات کو چار بجے تو سوئے تھے یہ بھی تو سوچو نا۔" وہ جس نے صبا کو پانی پلایا تھا بڑے غصیلے انداز سے بابا کو دیکھتے ہوئے اپنے اسی اکھڑ لہجے میں بولا۔

"اس کی شکل پر تو میں نے ہنسی آج تک دیکھی ہی نہیں یہ یونہی جل جل کر مر جائے گا۔" سرداراں اس کے غصیلے چہرے کو دیکھتے ہوئے ہنسنے لگی۔

"تو بکواس نہ کر ہر ایک بات میں اپنی ٹانگ اڑاتی ہے۔" اور وہ جلدی جلدی چائے کے باقی گھونٹ حلق میں انڈیل کر' پیالہ رکھنے کی بجائے وہیں پٹختا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ سرداراں بڑے زور سے قہقہہ لگا اٹھی۔

"سڑیل کہیں کا۔ شکر ہے میری شادی اس کے ساتھ نہیں ہو رہی اس نے ایک دو سال تک سڑ سڑ کر مر جانا تھا اور پھر میں اس جوانی کی عمر میں رانڈ ہو جاتی۔ شکر ہے خدا کا!" اس کی بات پر سب ہی قہقہہ لگا اُٹھے۔

صبا نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ نجانے کیسی تھی۔ بالکل گرم پانی سا بہت ہی بدمزہ لیکن وہ پھر بھی پینے لگی اسے بھی تو بھوک لگ رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد اسے ان کی مفلسی پر اور بھی ترس آنے لگا کاش! وہ ان غریبوں کے لئے کچھ کر سکتی۔

اور پھر اس کا دماغ عجیب عجیب سوچیں سوچنے لگا ایک وہ تھے جن کے پاس بے شمار دولت تھی اور جسے وہ کس بے دردی سے شراب میں بہاتے تھے اور معصوم لڑکیوں کی عصمتوں کے سودے کرتے تھے۔ اور ایک یہ بیچارے جن کے پاس پیٹ بھرنے کو روٹی نہ تھی اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نہ تھا۔ اگر وہ اپنی دولت کا غلط استعمال کرنے کی بجائے ایسے حاجت مندوں پر خرچ کرتے تو ان کی آخرت سنور جاتی اور ان کی دنیا۔ آخر ایسا کیوں نہیں تھا کون ان دولت مندوں کو سمجھائے کہ اصل راستہ یہ ہے وہ نہیں جو وہ اختیار کئے

ہوئے تھے۔

وہ پورے خلوص سے سوچ رہی تھی۔ بڑے زور سے کوئی آواز آئی۔ صبا نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"تم آرام سے کوئی کام بھی نہیں کر سکتیں۔" سرداراں کے ہاتھ سے ایک پیالہ گر کر ٹوٹ گیا تھا اور بابا اس نقصان پر اسے جھڑک رہا تھا۔

"میں نے جان بوجھ کر تھوڑا اسے توڑا ہے۔" اور وہ ناک بھوں چڑھا کر باقی پیالے اٹھانے لگی۔ "وہ تو جیسے ماں کے لاٹ صاحب ہیں نا سب ایسے ہی چھوڑ کر چل دیتے ہیں میں کسی کی نوکر نہیں ہوں آئندہ سب کو کہہ دینا اپنے کام آپ کریں۔"

وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی اور دھپ دھپ پاؤں مارتی اِدھر اُدھر چیزیں اٹھاتی رکھتی پھر رہی تھی۔ کمرے میں اور کوئی بھی نہیں تھا شاید سب ہی کہیں جا چکے تھے وہ دونوں بچے تک غائب تھے۔ اب صرف بابا اور سرداراں وہاں رہ گئے تھے۔

برتن وغیرہ سمیٹ کر سرداراں نے بھی اپنی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی میلی کچیلی اوڑھنی اوڑھی اور ایک لاٹھی اٹھا کر بابا کے پاس آئی۔ "یہ لو۔"

بابا نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ خاموش بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر نجانے کیا ہوا ایک دم صبا کی جانب چلا۔

"آخر بات کیا ہے تُو کون ہے اور یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" بابا بڑے مشکوک انداز میں اسے گھور رہا تھا اور اس کے لہجے سے صاف غصہ عیاں تھا۔

"بابا! کیسے بات کر رہے ہو۔ گھر آئے مہمان سے بھلا کوئی یوں بھی بولتا ہے۔" سرداراں جلدی سے آگے آ گئی۔

"مہمان!" بابا نے اسی تند لہجے میں سرداراں کو ڈانٹا۔ "فقیروں کے گھر میں بھی کبھی مہمان آئے ہیں؟"

"تو کیا اب اسے دھکے دے کر نکال دو گے؟" سرداراں بھی اسی طرح گرم ہوتے ہوئے تلخی سے بولی۔ "میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی بیچاری کو آرام کرنے دو

"گھڑی آ بیٹھی تو کیا گناہ ہو گیا اور اس ویرانے میں کہاں جاتی۔" سرداراں کو نہ جانے صبا کی کون سی ادا پسند آ گئی تھی خواہ مخواہ ہی اس کی حمایت میں بابا سے دو بدو ہو رہی تھی۔

"تو چپ رہ سرداراں! تجھے دنیا کا کیا پتہ یہاں کیا کیا جعل ہوتے ہیں یہ جو صبح سویرے کی آ کے بیٹھی ہوئی ہے ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔" پھر وہ صبا کے سامنے بیٹھ گیا۔ "سچ سچ بتا لڑکی تو کون ہے ورنہ اس ڈنڈے سے تیری کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"کہیں تو پولیس کی بھیجی ہوئی تو نہیں ہے۔"

"نہیں بابا! میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں۔" اور پھر ساتھ ہی صبا کی آنکھوں سے آنسو قطار در قطار رخساروں پر بہنے لگے۔

"بابا! کیوں اس بیچاری کو رلا رہا ہے؟" سرداراں نے دھکا دے کر بابا کو پیچھے ہٹا دیا اور خود جلدی سے صبا کے قریب بیٹھ کر اپنی میلی سی اوڑھنی سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ "نہ میری بہن تو نہ رو بابا کی تو یونہی رعب ڈالنے کی عادت ہے۔"

"اگر پولیس سے تیرا کوئی تعلق نہیں تو بتا پھر تو کون ہے؟" بابا نے سرداراں کی بات گویا سنی ہی نہیں اسی طرح منہ سے کف اڑاتے ہوئے بولا۔

"میں۔ میں۔" وہ بابا کی شعلہ اگلتی نگاہوں سے بری طرح سہم گئی تھی۔ "بابا! میں ایک مصیبت زدہ لڑکی ہوں۔"

"مصیبت زدہ!" اور اس کے ریشمی اور قیمتی لباس کو دیکھ کر بابا بے اختیار قہقہہ لگا اٹھا۔ "یہ چکمے کسی اور کو دے میں ان میں آنے والا نہیں۔"

"یقین کرو بابا! میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔" صبا کے آنسو تھے کہ کسی بند ٹوٹ جانے والے دریا کی طرح بہہ رہے تھے اور سرداراں نگاہوں میں بڑی ہمدردی لئے اسے دیکھ رہی تھی۔ "بابا! یہ میرے کپڑے نہیں ہیں۔ یہ تو" اور پھر صبا روتے روتے اپنی روئداد سنانے لگی بابا بڑے دھیان سے اس کا ایک ایک حرف سن رہا تھا اور اس کی نگاہیں صبا کے چہرے پر گڑی تھیں۔ شاید وہ یہ پرکھ رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی تھی یا جھوٹ۔

"ہائے بیچاری!" آخر میں سرداراں بڑبڑائی۔

"پھر اب کیا ارادہ ہے؟ کیا ہمارے پاس رہو گی؟"

"ہاں۔" صبا نے آنسو پونچھتے ہوئے سر ہلایا۔

"اللہ قسم!" سرداراں وفور مسرت سے بے اختیار ہوتے ہوئے صبا کو لپٹ گئی۔

"ہائے مجھے کتنا ارمان تھا کہ میری بھی کوئی سہیلی ہوتی۔" سرداراں اسے آنکھوں میں بھر لینے والے انداز میں دیکھ رہی تھی اور نگاہوں میں اس پر سے تصدق ہوئی جا رہی تھی۔ "پکا وعدہ کرتی ہو نا کہ یہیں رہو گی؟"

"میرا اور کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تو پھر میں کہاں جا سکتی ہوں۔" اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں طغیانی آ گئی۔

"نہ نہ بس۔" سرداراں نے پھر اسے گلے سے لگا لیا۔ "تو فکر نہ کر میں جو تیرے پاس ہوں۔"

21

"بابا! اسے کھول دے نہیں تو یونہی بے چاری مر جائے گی۔" سرداراں روتے ہوئے ہاتھ جوڑ جوڑ کر بابا سے التجا کر رہی تھی۔

"وہ جب تک میری بات نہیں مانے گی میں اسے نہیں کھولوں گا۔"

"آخر تم اسے اتنا مجبور کیوں کر رہے ہو۔ وہ جب بھیک مانگنے پر نہیں راضی ہوتی تو نہ سہی۔ گھر کے دوسرے کام کر لیا کرے گی دیکھا نہیں کیسے دو دنوں میں ہی اس نے گھر کو چمکا کر رکھ دیا تھا۔"

"بھیک منگوں کو چمکتے گھروں سے کیا سروکار!"

"سب کے کپڑے کیسے دھو دھلا کر صاف کر دیئے تھے۔"

"صاف کپڑے تو ہمارے لئے مندے کا باعث بن جاتے ہیں۔"

''پھر آخر تم چاہتے کیا ہو؟'' وہ جھنجھلا دی۔

''یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔''

''کیوں آخر ایسی کیا بات ہے۔''

''وہ تم سب سے زیادہ کمائے گی۔'' بابا بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''حالانکہ تم کالی کلوٹی ہو لیکن جب ایک ہی صدا لگاتی ہو تو کس طرح ہر طرف سے تمہاری جھولی میں سکوں کی بارش ہوتی ہے جوان ہونا۔ اس لئے اور جب یہ بھیک مانگنے نکلے گی تو'' بابا کی آنکھوں میں ایک چمک سی لہرائی۔

''تو کیا؟''

''تو ہمارا گھر دولت سے بھر جائے گا جوانی کے ساتھ ساتھ اس کے پاس حسن بھی ہے جتنا ہم سب مل کر کماتے ہیں اس سے زیادہ یہ اکیلی کما لیا کرے گی۔''

''لیکن جب وہ نہیں مانتی پھر۔''

''دو چار دن اور بندھی رہے گی تو آپ ہی ہوش ٹھکانے آ جائیں گے پھر سب کچھ مان جائے گی۔ سب کچھ!'' اور بابا اپنا حقہ گڑگڑانے لگا۔

''اگر جیتی رہی تو نا!''

''تو اس کی اتنی طرفداری کیوں کرتی ہے جا اپنا کام کر۔''

چند لمحے سرداراں چپ چاپ بابا کے چہرے کو دیکھتی رہی پھر اٹھ کر کوٹھری کی سمت چل دی بابا نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر مسکرا کر اپنے میں گم ہو گیا۔

صبا کے ہاتھ پاؤں ایک مضبوط رسی سے بندھے تھے اور وہ نڈھال سی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ سرداراں اس کے پاس آ گئی۔ ''تو بابا کی بات مان کیوں نہیں لیتی تجھے اس حال میں دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔''

''سرداراں! میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں بھیک نہیں مانگ سکتی۔''

''بابا نے تو کہا ہے تو منہ سے ایک لفظ نہ بولنا۔ بس صرف ہر آتے جاتے کے آگے ہاتھ پھیلا دینا۔ اس صورت میں بھی وہ کہتا ہے تم سب سے زیادہ کما لوگی ہر کوئی تیری

شکل دیکھ کر ہی بہت پیسے دے دے گا۔''

''ایسی ذلت کی کمائی میں نہیں کروں گی۔''

''اس میں ذلت کی کیا بات ہوئی۔''

''یہ تم نہیں سمجھ سکتیں کیونکہ تم پلی بڑھی اسی ماحول میں ہو۔'' پھر وہ دھیرے سے بولی۔ ''تم خود ہی سوچو سرداراں! رات ہوتی ہے تو تم سب کھنکتے چمکتے سکوں سے بھری جھولیاں لئے آتے ہو اور انہیں مٹی میں دبا دیتے ہیں تمہارے پیٹ میں کبھی صاف ستھری غذا نہیں جاتی۔ لوگوں کے، جن میں کئی بیمار بھی ہوتے ہیں۔ جھوٹے کھانے اور کوڑے پر پھینکے ہوئے پتے چاٹ چاٹ کر تم سب گزارا کرتے ہو۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ایسی زندگی، ایسی دولت تو میں کبھی قبول نہ کروں۔ کبھی بھی۔ اس سے تو فاقے اچھے!'' پھر وہ جیسے اپنے آپ سے بڑبڑائی ''یوں ہٹے کٹے ہو کر بھیک مانگنا سب سے بڑی لعنت ہے یہ خالص حرام کی کمائی ہوتی ہے اور حرام کے کمائے ہوئے پیسے کا یہی حشر ہوتا ہے وہ اپنے بھی نصیب میں نہیں ہوتا۔''

''نجانے تو کیسی باتیں کر رہی ہے؟'' سرداراں بڑے بھولپن سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ ''پھر۔ پھر کب تک یوں بندھی رہے گی تو اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہے اور ادھر بابا وہ بھی بہت ظالم ہے۔'' سرداراں بہت دکھی ہو رہی تھی۔

''چاہے اسی طرح عمر گزر جائے لیکن یہ ناممکن ہے کہ میں بھیک مانگوں مجھ سے ہر ایک کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا جائے گا یہ میرے بس میں نہیں۔''

سرداراں کچھ سوچتے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

''کیوں؟'' بابا نے حقے کی نے منہ سے پرے ہٹاتے ہوئے مسکرا کر سرداراں کی طرف دیکھا۔ ''کچھ تیرے سمجھانے کا بھی اس پر اثر ہوا؟''

سرداراں کوئی جواب دیئے بنا چپ چاپ ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئی۔

''بڑی سہیلی سہیلی ہو رہی تھی۔'' بوڑھے کے لہجے میں طنز تھا۔

''ہاں تو پھر تمہیں کیا۔ تم اپنی سنبھالو۔'' اور وہ کتنی ہی دیر بڑبڑاتی رہی۔

''اتنی رات ہوگئی کیا سونے کا ارادہ نہیں ہے؟'' بابا نے کھنکارتے ہوئے اٹھ کر حقہ ایک طرف رکھا۔ ''اب سو جا صبح ذرا سویرے جاگنا ہے کتنے دنوں سے اس لڑکی کی وجہ سے پورا دن نہیں لگ رہا۔''

اور وہ لیٹ گیا سرداراں اب بھی سوچوں میں گم بیٹھی ہوئی تھی۔

کمرے میں مختلف قسم کے خراٹوں کی آواز گونج رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی خواب میں بڑبڑا بھی اٹھتا مگر وہ اسی طرح اردگرد سے بے خبر اپنے خیالوں میں کھوئی تھی۔ شاید آدھی سے بھی زیادہ رات گزر گئی تھی۔ اب تو بابا بھی گہری نیند میں مدہوش تھا۔ سرداراں بہت احتیاط کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی اور دبے دبے قدموں سے چل کر کوٹھری میں داخل ہوئی۔

صبا وہیں ٹیڑھی ہوئی پڑی تھی قریب جاکر بہت آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ صبا چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

''کیا ہوا؟'' وہ گڑبڑاتے ہوئے بولی۔

''چپ۔'' سرداراں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئی اور رسی کی گرہیں کھولنے لگی۔

''یہ شیرے کمبخت نے لگائی ہیں نا کھل ہی نہیں رہیں۔''

وقت گزرا جا رہا تھا بہت کوشش کے باوجود جب اس سے کوئی گرہ نہ کھل سکی تو شیرے کو گالیاں دیتی ہوئی بڑے کمرے سے مٹی کا دیا اٹھا لائی اس کے ننھے سے شعلوں نے منٹوں میں اس کی مشکل آسان کردی جلدی جلدی صبا کے اردگرد لپٹی رسی کھول کر اسے آزاد کردیا۔

''بہت احتیاط سے ذرا بھی آواز نکلی تو بس پھر دونوں کی ہی خیر نہیں۔'' صبا کے کان میں سرگوشی کی اور اس کا ہاتھ تھام کر ساتھ ساتھ لئے باہر نکل پڑی۔ کمرے سے گزر کر پچھلے صحن میں اسے لے گئی ادھر بھی ایک چھوٹا سا دروازہ باہر جانے کا تھا۔ اسے کھولتے ہوئے صبا کو اشارہ کیا۔

''یہاں سے چلی جاؤ۔''

''لیکن تم۔'' صبا کو سرداراں کا خیال آ گیا۔ ''سرداراں! تمہارا کیا بنے گا کیا مجھے کھولنے پر بابا تمہیں کچھ نہ کہے گا۔''

''کہے گا کیوں نہیں۔'' ایک تلخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ ''شاید اسی رسی میں میں بندھ جاؤں۔ وہ بڑا ظالم ہے۔''

''اوہ! پھر۔'' صبا پریشان ہوگئی۔

''کچھ نہیں، تو جا۔''

''سرداراں! تم بھی میرے چلو بھیک مانگنا اچھی بات نہیں۔ چھوڑو یہ دھندا اور دونوں مل کر کوئی باعزت کام کریں گی۔''

''نہیں میں تیرے ساتھ نہیں جا سکتی۔''

''کیوں؟''

''میں شیرے کو نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اس سے پیار ہے۔'' اس کے سانولے چہرے پر محبت کا ایسا رنگ دوڑ گیا جس نے اسے بے حد حسین بنا دیا۔

''پھر میں بھی نہیں جاؤں گی یہ کیسے ہو سکتا ہے اپنی آزادی کی خاطر تمہیں مصیبت میں پھنسا دوں۔''

''تو نے تو نہیں کہا تھا نا میں نے اپنی مرضی سے ہی تجھے کھولا ہے۔''

''لیکن سرداراں! یہ ایثار آخر کس لئے؟''

''یاد نہیں تجھے میں نے پہلے دن ہی اپنی سہیلی بنا لیا تھا اور کیا میں اپنی سہیلی کے لئے اتنا بھی نہیں کرسکتی۔''

''نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گی۔''

''تجھے جانا ہوگا یہ دیکھ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' اور سرداراں نے سچ مچ صبا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

یہ کیچڑ میں پلنے والی لڑکی کتنی پاک اور بلند تھی! صبا نے بڑی عقیدت سے اس

کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ چوم لئے۔

''سرداراں! میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکوں گی۔''

''اور میں بھی نہیں۔'' اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ''تو میری سہیلی جو ہے!''

اور پھر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں صبا نے دیکھا اس کی آنکھوں سے دو چمکتے ہوئے ستارے نکل کر اس کے سانولے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

''اب تو جا ایسا نہ ہو کوئی جاگ پڑے۔''

اس نے صبا کو کندھوں سے پکڑ کر اس کا رخ موڑ دیا اور خود جلدی سے پلٹ کر بغیر دروازہ بند کئے کمرے کی جانب تیز تیز چل دی۔

22

اس کے پاؤں بڑے سخت دکھنے لگے تھے۔ ٹانگیں شل ہو گئی تھیں اور جسم کا ایک ایک جوڑ جیسے اپنی جگہ سے ہل گیا تھا اب اس میں مزید ایک قدم چلنے کی سکت نہ رہی تھی۔ کتنے ہی گھنٹے وہ لگاتار چلتی رہی تھی اندھیرے میں اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ وہ کہاں جا رہی تھی اور اس وقت جبکہ وہ تھکن کے مارے گرنے ہی والی تھی تو سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھ سکا کہ وہ وہیں کہیں بیٹھ جائے۔

وہ کسی عمارت کی سیڑھیاں تھیں، کسی کا گھر تھا یا کوئی اور جگہ تھی یہ معلوم کرنے کا وقت نہ تھا وہ بیٹھ گئی چند منٹ گزرے سانس میں سانس آیا تو دماغ بھی بیدار ہو گیا۔

گزرنے والے سارے واقعات اس کی نگاہوں میں ایک ایک کر کے گھومنے لگے اب کہاں جائے؟ پھر وہی بے سروسامانی کا عالم تھا سوائے تن کے کپڑوں کے اور کوئی اثاثہ پاس نہ تھا ایک دن بھی تو گزارنا مشکل تھا۔

سوچتے سوچتے جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا تو دماغی رو پھر اس طرف بہہ نکلی۔

اس کی دانست میں اب تو ماں سے انتقام لینا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ صرف اور صرف اسی کی وجہ سے وہ یوں گھر بے گھر ہوئی تھی اور در در کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔ انتقام کی وہ آگ، جو فوزیہ کے ہاں عافیت بھرا ماحول اور پیٹ بھر روٹی ملنے کی وجہ سے سرد ہو چکی تھی، پھر بھڑک اٹھی۔ اب تو خواہ کچھ بھی ہو وہ اپنا ارادہ ترک نہیں کرے گی اور ہر صورت ماں کو ڈھونڈ کر رہے گی۔

پھر وہ سوچنے لگی کہ ماں کو تلاش کرنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کرے وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی مگر اسے کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔

''یہاں سیڑھیوں میں کیوں بیٹھی ہو؟'' ایک نسوانی آواز نے اسے چونکا دیا جھکا ہوا سر اٹھا کر اس نے سامنے دیکھا۔

پو پھٹ رہی تھی اور رات کی تاریکی آہستہ آہستہ دن کے اجالے میں تحلیل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اسے مخاطب کرنے والی نجانے کون تھی؟ اس نے کچھ اس طرح چہرہ برقع میں لپیٹا ہوا تھا کہ صبا کو اس کی شکل پوری طرح دکھائی نہ دی۔ اس لئے وہ اس کے متعلق کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔

''کیا تمہیں بھی تعویز کرانا ہے۔''

''دن چڑھ رہا ہے ابھی لوگ آنا جانا شروع ہو جائیں گے اور ایک جوان عورت کا یوں سرعام بیٹھنا اچھا نہیں لگتا۔ شاہ جی کا انتظار کرنا ہے تو آؤ اندر بیٹھ کر کرو۔'' اسے بڑی نرمی سے یہ کہتے ہوئے وہ عورت خود بھی وہی سیڑھیاں چڑھنے لگی جہاں صبا بیٹھی ہوئی تھی۔

صبا نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ کافی آباد علاقہ تھا۔ واقعی وہ عورت ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی ابھی لوگوں کی آمدورفت شروع ہو جانا تھی اور وہ یوں بے تکلفی سے سیڑھیوں میں تشریف فرما تھی جیسے اپنے ہی گھر بیٹھی ہو۔ اپنے آپ ہی میں شرمندہ سی ہو کر وہ اٹھی اور اس عورت کی تقلید میں جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ گئی۔

''پہلے بھی کبھی یہاں آئی ہو؟'' اس نے پلٹ کر پوچھا۔

"نہیں۔"

"تبھی۔" جیسے وہ بہت کچھ سمجھ گئی ہو۔ بڑے زور زور سے سر ہلانے لگی۔ پھر بڑے فخریہ انداز میں بولی۔ "میں تو اکثر آتی رہتی ہوں ذرا بھی کوئی مشکل ہو دولت سائیں کے مزار پر دعا مانگتی ہوں اور شاہ جی سے تعویذ کراتی ہوں جھٹ بات پوری ہو جاتی ہے۔"

سیڑھیوں کے بعد ایک بڑی فراخ ڈیوڑھی تھی وہاں پہنچ کر وہ رک گئی اور برقع اتار کر بغل میں دبا لیا۔

"آؤ تم بھی پہلے دعا مانگ لو۔" بائیں ہاتھ ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا۔ ایک دم تیز روشنی آنکھوں میں پڑی۔ صبا کچھ خوف زدہ سی ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس کمرے کا ماحول ہی کچھ ایسا تھا اس کے بالکل درمیان میں ایک بہت بڑی پختہ قبر بنی ہوئی تھی اور چاروں طرف بے شمار دیئے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

وہ عورت بڑی نڈر تھی۔ جلدی سے جوتی اتارتے ہوئی دلیری سے آگے بڑھی اور قبر سے ذرا ہی فاصلے پر عین اس کی طرف رُخ کر کے دوزانو بیٹھ گئی اور بڑے خشوع و خضوع سے دعا مانگنے لگی۔

نجانے کیوں صبا کو اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ باہر ہی کھڑی ہو کر اس عورت کی حرکات دیکھتی رہی۔ آنکھیں بند کئے ہل ہل کر وہ بڑی دیر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی رہی۔ دعا ختم ہوئی تو جھک کر قبر پر دونوں ہاتھ پھیرے اور انہیں چومتے ہوئے بڑی عقیدت کے ساتھ آنکھوں سے لگا لیا۔

صبا کھڑی بڑی حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی وہاں سے اٹھی تو قبر کی پائنتی ایک صندوقچی گڑی ہوئی تھی دوپٹے کے پلو میں سے جلدی جلدی کچھ نکال کر اس میں ڈال دیا۔ اور پھر رخ اسی طرح مزار کی جانب کئے الٹے پاؤں چلتے ہوئے دروازے سے باہر نکل آئی۔

"تمہیں دعا نہیں مانگنا تھی؟" وہ جوتی پہنتے ہوئے صبا سے پوچھنے لگی۔

"بڑے کرنی والے بزرگ ہیں بہت جلد خواہش پوری ہوتی ہے۔ میری شادی

کو چھ سال ہو گئے تھے مگر اولاد کوئی نہیں تھی۔ کسی کے بتانے پر چند ہی دن میں نے یہاں دعا مانگی اور شاہ جی سے تعویذ کرایا۔ بس پھر کیا تھا بچے ہونے شروع ہو گئے اب خیر سے میرے سات بچے ہیں۔"

صبا خاموش کھڑی اس کی باتیں سن رہی تھی۔

"صبح صبح بھیڑ نہیں ہوتی اس لئے میں ہمیشہ اسی وقت آتی ہوں۔ ذرا دیر کو دیکھنا تل دھرنے کو جگہ نہیں ہو گی۔ روزانہ سینکڑوں لوگ چڑھاوے چڑھانے آتے ہیں۔ آؤ اب وہاں بیٹھ کر شاہ جی کا انتظار کریں۔"

اس ڈیوڑھی میں داہنی سمت ایک کمرے میں وہ اسے لے گئی وہاں دو عورتیں اور بیٹھی ہوئی تھیں وہ صبا کو لئے ایک سمت ہو بیٹھی۔

"بہن! آپ دونوں کس لئے آئی ہیں؟" وہ عورت بہت ہی باتونی تھی بیٹھتے ہی ان دونوں سے پوچھنے لگی۔

"تعویذ کرانا ہے۔" ان دونوں میں سے ایک بولی۔

"کس لئے؟"

"یہ میری لڑکی ہے اور اس کے خاوند نے دوسری شادی کر لی ہے۔ شاہ جی سے کہوں گی کہ کوئی ایسا تعویذ دیں کہ وہ خود بخود ہی اس دوسری بیوی کو چھوڑ کر میری بیٹی کے پاس آ جائے۔"

"یہ تو شاہ جی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بس تعویذ ہونے کی دیر ہے تین چار دن بعد ہی دیکھنا کیسے اسے چھوڑ کر پھڑکتا ہوا اس کے قدموں میں آ گرے گا۔"

"بس ایک بار میری یہ تمنا پوری ہو جائے میں تو روپوں سے شاہ جی کی جھولی بھر دوں گی۔" اب ماں کی بجائے لڑکی بڑے رقت آمیز لہجے میں بولی اور ساتھ ہی گلے میں ڈالا ہوا سونے کا بڑا سا ہار درست کرنے لگی۔

"کوئی فکر ہی نہ کرو دیکھنا کیسے سب ٹھیک ہو جاتا ہے وہ نہ صرف اسے چھوڑ دے گا بلکہ آئندہ سے تمہارا غلام ہو کر رہے گا شاہ جی بڑے کرامات والے ہیں۔"

اور وہ یونہی باتیں کر رہی تھیں کہ دو چار عورتیں اور اندر داخل ہوئیں خوب زیور اور ریشمی کپڑے پہنے تھیں۔ اور بناؤ سنگھار کیا ہوا تھا جیسے کسی شادی کی تقریب میں آئی ہوں۔ انہیں دیکھتے ہی اس جوان عورت نے جو اپنے خاوند کے لئے تعویذ کرانے آئی تھی جلدی سے برقع اتار کر ماں کی گود میں رکھ دیا اور اپنی سنہری زری کی قمیض کی آستین اونچی چڑھا چڑھا کر خواہ مخواہ ہی کلائی کی گھڑی پر سے وقت دیکھنے لگی۔

صبا خاموش بیٹھی ایک ایک کی حرکات دیکھ رہی تھی۔

وہ عورتیں جو بعد میں داخل ہوئی تھیں وہ بھی ایسے ہی اپنی چیزوں کی نمائش کر کر کے ان کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہوگئیں۔

کوئی کچھ بتا رہی تھی اور کوئی کچھ تقریباً ہر ایک کو کسی نہ کسی مشکل کا حل شاہ جی کے تعویزوں سے ملا تھا غرض سب ہی ان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ سب کی باتیں صبا کے کانوں میں پڑ رہی تھیں اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اگر واقعی شاہ جی کوئی ایسے ہی اللہ والے بزرگ ہیں تو کیوں نہ وہ بھی ماں کو ڈھونڈنے کے لئے ان سے تعویذ کرائے۔

وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ ایک جتھہ اور خواتین کا کمرے میں داخل ہوا ان سب کی زبان پر شاہ جی اور ان کے تعویزوں کی کرامات کے قصے تھے بلکہ وہ تو یہاں تک کہہ رہی تھیں۔ ”اس دنیا میں شاہ جی مشکل کشا بن کر آئے ہیں جو کچھ مانگنا ہے ان سے مانگو۔“

لمحہ بہ لمحہ صبا کا ارادہ پختہ ہوتا جا رہا تھا کیسے آپ ہی آپ ماں کو تلاش کرنے کی راہ نظر آ گئی تھی وہ دل ہی دل میں خوش ہونے لگی۔

اس عورت کے کہنے کے مطابق تھوڑی دیر بعد واقعی وہاں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی تھی۔ کمرہ عورتوں سے کھچا کھچ بھر چکا تھا اور اب جو مزید آ رہی تھیں وہ باہر ڈیوڑھی میں ہی اپنی جوتیاں رکھ کر اوپر بیٹھتی جا رہی تھیں ساتھ ساتھ زبانیں بھی چل رہی تھیں کچھ اپنے دکھ درد بیان کئے جا رہے تھے کچھ دوسروں کے سنے جا رہے تھے۔

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ نجانے کیا وقت ہوگا۔ صبا کو بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی پچھلے تین چار دن سے اس نے پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ بابا سے چھپا کر جو بھی کچھ تھوڑا سا ہاتھ آتا تھا سرداراں اسے لا کر کھلا دیتی تھی۔ صبا سوچ رہی تھی کہ اس پیٹ کے تنور کی آگ کو کس طرح بجھائے جو اسے تڑپائے دے رہی تھی۔

”شاہ جی آ گئے۔ شاہ جی آ گئے۔“

ایک دم سب عورتوں میں کھلبلی مچ گئی۔ ہر کوئی دوسرے کو دھکے دے کر خود آگے بڑھنے کی کوشش میں تھی۔

صبا بھی اپنی بھوک کا مسئلہ بھول بھال کر اٹھ کھڑی ہوئی مگر دوسری عورتوں کی طرح دھینگا مشتی کر کے آگے بڑھنے کی جرات نہ کر سکی کچھ سہمی ہوئی سی اسی کونے میں کھڑی رہ گئی۔

جب سب عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو اس نے بھی اپنی جگہ سے جنبش کی۔ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس دروازے تک پہنچ گئی جس میں سب داخل ہوئی تھیں اور بہت ڈرتے ڈرتے ذرا سی گردن آگے کر کے اندر جھانکا۔

دروازے کے بالکل سامنے والی دیوار کے آگے سرخ ساٹن کے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ایک موٹی موٹی سرمہ بھری آنکھوں اور سیاہ گھنی داڑھی والا شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ خوب سرخ و سپید تھا۔ یقیناً یہی شاہ جی ہوں گے۔ صبا نے اندازہ لگایا کیونکہ ان کی شکل ہی بڑی بارعب تھی۔ اور پھر غور سے باقی سارے کمرے میں نگاہیں دوڑانے لگی۔

پورے فرش پر صاف ستھری دری بچھی تھی اور جس جگہ شاہ جی تشریف فرما تھے ایک بہت خوشنما چھوٹا سا قالین بچھا تھا۔ چاروں طرف دیواروں پر آیات کے قطعے آویزاں تھے نجانے کس چیز کی خوشبو تھی سارا کمرہ مہک رہا تھا۔

سب عورتیں سروں پر دوپٹے لئے مودبانہ سر جھکائے بیٹھی تھیں اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے کانوں میں باقاعدہ گفتگو بھی ہو رہی تھی۔

باری باری ایک ایک عورت آگے بڑھتی اور شاہ جی کے سامنے بیٹھ جاتی پھر دھیرے دھیرے کچھ کہتی وہ سر ہلا ہلا کر سنتے جاتے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے جاتے جب وہ اپنی ساری مشکلات بیان کر لیتی تو شاہ جی اسے تین بار پھونک مارتے اور قریب ہی پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے ایک ہی سائز کے بہت سارے کاغذوں میں سے ایک اٹھا کر اس پر کچھ لکھتے۔ پھر اسے اچھی طرح تہہ کر کے اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔

''اسے کھول کر نہیں دیکھنا ورنہ سارا اثر جاتا رہے گا۔'' وہ ہر ایک کو یہ تاکید ضرور کرتے۔

''جی بہت اچھا۔'' تعویذ لینے والی کے چہرے پر مسرت بھری سرخی ہوتی اور وہ شاہ جی کو دعائیں دیتے ہوئے الٹے پاؤں چل کر دوسرے دروازے تک پہنچ جاتی۔

اس دروازے میں ایک جوان شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز تھا اور وہ بڑا مسکرا مسکرا کر سب کو دیکھ رہا تھا۔

''تعویذ کا ہدیہ۔'' وہ ہر تعویذ لے کر جانے والی کے آگے صندوقچی دیتا اور ہر کوئی بڑی خوشی سے کچھ نہ کچھ اس میں ڈال دیتی۔ وہ کیا ڈالتی تھیں یہ صبا کو دکھائی نہ دے سکا۔ بہر حال خواہ کچھ بھی ہو مگر خود اس کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ پھر وہ کس طرح تعویذ کرا سکتی تھی۔ وہ فکرمند سی ہو کر سوچنے لگی اب کیا کرے؟ یہ راستہ بھی گم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسی پریشانی میں کھوئی تھی کہ شاہ جی کی بارعب بلند آواز اس کے کان میں پڑی۔

''اے لڑکی! تو وہاں کیوں کھڑی ہے؟''

صبا نے چونکتے ہوئے نگاہ اٹھا کر ارد گرد دیکھا۔ سوچوں میں کھوئی نجانے کب وہ اوٹ سے نکل کر دروازے کے بیچوں بیچ آ کھڑی ہوئی تھی یہ خود اسے معلوم نہ ہوا تھا۔ شاہ جی کے علاوہ سب عورتیں بھی اسے گردنیں موڑ موڑ کر دیکھ رہی تھیں۔ شرمندہ سی ہو کر وہ جلدی سے گرنے کے انداز میں وہیں چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔

''ادھر آؤ۔'' شاہ جی کی گرجدار آواز پھر کمرے میں گونجی۔

شرمندگی اور گھبراہٹ کے مارے صبا پسینہ پسینہ ہو رہی تھی اور خوف سے اس کا

سارا وجود لرز رہا تھا۔ نجانے شاہ جی نے اسے کیا کہنا تھا شاید اس کی گستاخی پر اسے کوئی سزا دینا تھی۔ وہ وہیں بیٹھی رہی اور کانپتی رہی۔

''جاؤ۔ جاؤ ورنہ اگر شاہ جی جلال میں آ گئے تو تمہارا کچھ باقی نہیں رہے گا۔'' قریب ہی بیٹھی ہوئی ایک عورت نے دھیرے دھیرے کہا۔

''مجھے ڈر آ رہا ہے۔'' اور اس کے آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔

''نہیں نہیں۔'' دوسری عورت نے اسے یوں لرزتے ہوئے اور روتے ہوئے دیکھا تو اسے صبا پر بڑا ترس آیا۔ جھٹ تسلی آمیز لہجہ میں بولی۔ ''ڈرنے کی کوئی بات نہیں شاہ جی بڑے رحم والے ہیں۔''

''سنا نہیں۔'' شاہ جی اپنے سب کام چھوڑے بیٹھے ہنوز اسی کی جانب دیکھ رہے تھے اور باقی سارے کمرے میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔

''ہاں ہاں آگے بڑھو نا۔ کچھ نہیں کہتے۔'' اس عورت کا لہجہ ہی کچھ ایسی ہمدردی لئے تھا کہ صبا کا خوف کافی حد تک کم ہو گیا مگر تذبذب پھر بھی باقی تھی۔ بیٹھی بیٹھی کھسک کھسک کر آگے بڑھنے لگی عورتوں نے جلدی جلدی پیچھے ہٹ کر اسے راستہ دے دیا۔

وہ قریب پہنچی تو شاہ جی بولے۔ ''وہاں کیوں کھڑی تھی؟''

''میں میں جی۔ مجھے بھی تعویذ کرانا تھا۔'' شاہ جی کا انداز گفتگو ہی ایسا تھا کہ وہ پھر ڈر کے مارے کانپنے لگی۔

''کیوں۔ کیا مشکل ہے؟''

رندھی ہوئی آواز میں ہکلائی مگر کچھ کہہ نہ سکی بے اختیار سسکیاں بھر بھر کر رونے لگی۔ اس کی اس ادا میں نجانے کیا تھا کہ اکثر عورتوں کا دل بھر آیا اور وہ بھی اس کے ساتھ آنسو بہانے لگیں۔ ''چچ چچ ہائے بیچاری! کوئی بہت ہی دکھی لگتی ہے۔''

ارد گرد کھسر پھسر ہونے لگی۔ صبا کی سسکیوں نے اور تیز ہو کر ہچکیوں کا روپ دھار لیا۔

''صبر کر لڑکی! صبر۔'' شاہ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑی نرمی

سے کہا۔ ''ہمیں بتا تجھے کیا دکھ ہے تو فکر نہ کر ابھی اس کا مداوا ہو جاتا ہے۔''

شاہ جی کے الفاظ میں ایسی تسلی تھی کہ صبا نے ہچکیوں اور آہوں کے درمیان اپنی ساری آپ بیتی سنا دی۔ سبھی گم سم سی بیٹھی اس کی درد بھری داستان سن رہی تھیں۔

''اور اب تو کیا چاہتی ہے؟'' اس کی کہانی سننے کے بعد شاہ جی نے بڑی شفقت سے پوچھا۔

''بس یہی کہ ایک بار میری ماں مجھے مل جائے۔''

''مل جائے گی۔'' وہ بڑی رعب دار آواز میں پورے وثوق سے بولے۔

''سچ؟'' صبا کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

''ہاں۔''

''تو پھر جلدی سے تعویذ دے دیجئے۔''

اس نے بڑی سرعت سے اپنا گورا گورا کانپتا ہوا ہاتھ شاہ جی کے سامنے پھیلا دیا۔ اس کی اس حرکت پر عورتیں تو عورتیں خود شاہ جی بھی بے اختیار مسکرا دیئے۔

''یہاں تعویذ سے کام نہیں بنے گا۔ خود ہمیں پورے اکیس دن وظیفہ کرنا پڑے گا۔ دیکھ لینا ان اکیس دنوں کے اندر اندر تمہاری ماں آپ ہی آپ ہمارے حضور میں آ حاضر ہو گی۔''

''لیکن لیکن۔''

''ہاں بولو۔''

''میرے پاس ہدیہ دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے بلکہ۔'' وہ پھر بے اختیار رو دی۔ ''میرے پاس تو اتنا بھی نہیں کہ کچھ لے کر کھا سکوں میں دو تین دن سے بھوکی ہوں۔''

''لڑکی! ہم اتنے گئے گزرے بھی نہیں کہ کسی کو دو دن کھانا بھی نہ کھلا سکیں۔ جاؤ ہمارا حکم ہے جب تک تمہاری ماں نہیں ملتی تم ہمارے گھر میں مہمانوں کی طرح رہو گی۔''

شاہ جی کی اس فیاضی پر سب ہی عورتیں عش عش کر اٹھیں اور ان کی نگاہوں میں ان کے لئے

عقیدت سما گئی۔

مزار سے ملحقہ شاہ جی کا گھر تھا۔ وہ گھر کیا تھا پورا محل کا محل تھا۔ بیسیوں تو اس میں کمرے ہوں گے۔ سب بڑے ہی خوبصورت فرنیچر سے آراستہ تھے ان میں سے ایک کمرہ اسے بھی دے دیا گیا تھا۔

شاہ جی کی تین بیویاں تھیں۔ تینوں ہی ایک سے ایک بڑھ کر حسین مگر خوب دوہرے دوہرے بدن کی۔ سارا دن انہیں کام جو کوئی نہیں ہوتا تھا۔ ایک ایک کے لئے دو دو ملازمائیں خدمت کو مقرر تھیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ خوراک کھانے کو ملتی تھی پھر کیسے نہ موٹی ہوتیں؟''

صبح ہوتے ہی شاہ جی خانقاہ پر چلے جاتے تو سب اپنے اپنے کمروں سے نکل کر صحن میں آ بیٹھتیں۔ شاہ جی کی کئی مریدنیاں بھی آ جاتیں۔ تو کتنی کتنی دیر بیٹھی ان کے پاؤں اور ٹانگیں دباتی رہتیں۔ شاہ جی جیسی بزرگ ہستی کی بیویاں بھی ان کے لئے ویسے ہی قابل احترام تھیں ان کی خدمت کرنا بھی ان کے خیال میں اپنے لئے بہشت خریدنا تھا۔

ساتھ ساتھ کھانے کو کچھ نہ کچھ حاضر ہوتا رہتا۔ وہ کھاتی رہتیں' پاؤں دبواتی رہتیں اور گپ شپ ہوتی رہتی۔ منہ بھی چلتے رہتے اور زبانیں بھی۔ شاید سب کے ہی بچے تھے نجانے کتنے کتنے ہوں گے۔ صبا کبھی بھی یہ اندازہ نہ لگا سکی وہ سب زیادہ تر اکٹھے ہی رہتے تھے اور ماؤں سے الگ اپنی دنیا بسائے رکھتے تھے۔

صبا کا جی چاہتا تو شاہ جی کی بیویوں کے پاس جا بیٹھتی اور ان کی گپ شپ سنتی رہتی۔ ان کی گفتگو کا موضوع کوئی خاص نہیں ہوتا تھا۔ کوئی مریدنی کوئی خبر سنا دیتی تو اسی کے متعلق بحث چل نکلتی۔ کوئی اپنی زندگی کے دلچسپ واقعات سنانے لگتی۔

کبھی ہمسایوں پڑوسیوں کا ذکر شروع ہو جاتا۔ کسی کی صورت شکل کا مذاق اڑایا جاتا تو کسی کی عادات و اطوار پر نکتہ چینی کی جاتی جب محفل خوب گرم ہوتی تو بعض اوقات باقاعدہ سوانگ بھر بھر کر نقلیں اتاری جاتیں پھر بے فکری کے قہقہوں سے سارا گھر گونج اٹھتا۔

ان کی محفل سے دل بھر جاتا تو بچوں میں جا شامل ہوتی جن میں پندرہ سال سے لے کر دو سال کی عمر تک کے بچے تھے۔ کچھ محلے کے آ جاتے چند دن کے اندر ہی اندر صبا نے ان سب سے ایسے تعلقات استوار کر لئے تھے کہ سب ہی اس پر اعتبار کرنے لگے تھے اور اسے ایک افسر کی حیثیت دے دی تھی۔

کتنی کتنی دیر ان سے کھیلتی رہتی۔ آنکھ مچولی اور دوسری بہت سے کھیلوں کے علاوہ وہ بھی سوانگ بھر بھر کر ڈرامے کیا کرتے اور ان کے ڈراموں میں اکثر اپنی ماؤں اور باپ کی نقل اتاری جاتی۔

ایک لڑکا جو ان سب میں بے حد شریر تھا۔ بالکل اپنے باپ جیسی داڑھی نجانے کہاں سے لے آیا تھا وہ لگا لیتا۔ باقی لڑکیاں لڑکے مریدنیاں بنتے وہ سب اپنی اپنی ماؤں کے دوپٹے چپکے سے نکال لاتے اور لڑکیوں کے علاوہ لڑکے بھی اسی طرح اوڑھ لپیٹ کر بڑے مودبانہ انداز میں سر جھکا کر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ جاتے البتہ جو شاہ جی بنتا تھا اس کے نیچے بڑی اماں کا جانماز لا کر بچھا دیا جاتا اور بالکل باپ کی طرح کاغذ کے چھوٹے چھوٹے پرزے پنسل پاس رکھی جاتی۔ پھر ایک ایک آگے بڑھتا اور بالکل مریدنیوں کی سی رونی آواز میں اپنی مشکل بیان کرتا پھر ننھا شاہ جی سب کچھ بڑی سنجیدگی سے سننے کے بعد تعویذ لکھنے بیٹھ جاتا۔

''جا بی بی! ہمیں غیب سے آواز آئی ہے کہ تیرا کام ہو گیا۔ لے یہ تعویذ کھول کر نہ دیکھنا ورنہ سارا اثر جاتا رہے گا یہ اپنی لڑکی کے گلے میں ڈال دے۔''

نجانے وہ کیسے اپنی آواز بھاری بنا لیتا ان کی حرکات دیکھ دیکھ کر صبا کو بے اختیار ہنسی آ جاتی مگر وہ ضبط کر جاتی کیونکہ اس محفل میں داخلے کی پہلی شرط ہی سنجیدگی تھی اگر ذرا بھی کسی کی ہنسی نکل جاتی تو اسے فوراً نکال دیا جاتا تھا۔ پھر وہ اپنی ماؤں کی نقلیں بھی بڑے مزیدار انداز میں اتارتے۔ تین سب سے بڑی لڑکیاں اپنی اپنی قمیضوں کے اندر کپڑے ٹھونس ٹھونس کر خوب موٹی بن جاتیں اور پھر اسی طرح چارپائیوں پر پھسکڑے مار کر بیٹھ جاتیں جیسے اکثر ان کی مائیں بیٹھا کرتی تھیں۔

کبھی کبھی کسی کے سر درد یا بخار کی شکایت بھی ہو جایا کرتی تھی کوئی ایک بالکل اسی انداز میں ماتھے پر پٹی باندھ لیتی اور باتوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً ہائے ہائے بھی کرتی جاتی اور باقی سب ان کے اردگرد ہو بیٹھتے۔ کوئی ان کے گھٹنے دباتی تو کوئی کندھے اور پھر ویسے ہی ہمسایوں پر نکتہ چینی کی جاتی۔ ویسے ہی بات بے بات زور زور سے قہقہے لگائے جاتے بالکل وہی انداز!

اور صبا بے حد محظوظ ہوتی اس کے حلق میں قہقہے نکلنے کو بے تاب ہو ہو جاتے۔ مگر وہ آئندہ سے ایسے مزیدار کھیلوں سے محروم ہونا نہیں چاہتی تھی۔ مشکل سے ہی لیکن ضبط کر جاتی۔ اس کا دل تو وہاں اتنا لگ گیا تھا کہ وقت گزرا جا رہا تھا اور اسے کوئی ہوش کوئی احساس نہ تھا۔

''تمہیں شاہ جی بلا رہے ہیں۔''

وہ بڑی بے فکری سے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی کہ ملازمہ نے آ کر اس سے کہا۔ تقریباً روز ہی شاہ جی اپنے دربار سے واپس آ کر اسے اپنے حضور طلب کیا کرتے تھے۔ اتنے دن اسے یہاں آئے ہو گئے تھے شاہ جی وظیفہ بھی بڑی باقاعدگی سے کر رہے تھے مگر ابھی تک اس کی ماں کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔

''شاید آج ماں کی کوئی خبر مل جائے۔''

دل میں یہی آس لئے وہ ان کے حضور میں جا حاضر ہوئی۔

''جی فرمایئے۔'' بالکل دوسری مریدنیوں کی طرح اس نے بھی دوپٹہ اچھی طرح لپیٹ کر سر جھکایا ہوا تھا۔

''آج وظیفے کے اکیس دن پورے ہو گئے ہیں اور ہمیں غیب سے معلوم ہوا ہے کہ تمہاری ماں بیمار ہے اس لئے ہمارے حضور حاضر نہیں ہو سکتی۔ تمہیں کچھ دن اور انتظار کرنا پڑے گا۔''

''جی بہت اچھا۔''

''تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں؟''

''جی بالکل نہیں۔''

''دل لگ گیا ہے۔''

''جی ہاں بہت۔'' وہ اسی سادگی سے بولی۔

''تو بس پھر ٹھیک ہے۔'' اور وہ بڑی معنی خیز انداز میں مسکرا دیئے۔

صبا دوسری عورتوں کی طرح اُلٹے اُلٹے پاؤں باہر نکل آئی۔ آج بچے کوئی نیا کھیل کھیلنے والے تھے۔ کمرے سے نکلتے ہی وہ اندھا دھند دوسرے آنگن کی سمت بھاگی۔

دن یونہی بڑے آرام اور سکون سے گزرے جا رہے تھے مگر اس کی زندگی جو شاید ایک آتش فشاں پہاڑ تھی وقتاً فوقتاً لاوا اگلتی رہتی تھی ایک بار پھر زلزلے سے دوچار ہو بیٹھی۔

دو تین دن سے گھر میں بہت گہما گہمی تھی۔ سارے گھر کی صفائیاں ہو رہی تھیں خوب رنگ برنگی جھنڈیوں سے اسے سجایا جا رہا تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کے نئے کپڑے سل رہے تھے۔ صبح ہوتے ہی صحن میں چاولوں کا ڈھیر لگ جاتا۔ عورتیں ارد گرد بیٹھتیں انہیں صاف کرتی رہتیں۔ چاول صاف کر کے گندم لے بیٹھتیں اس کا آٹا پسا پسا کر بڑے بڑے برتنوں میں بھرا جا رہا تھا۔ غرض خوب بھاگ دوڑ مچی ہوئی تھی۔ صبا بہت کم کسی بات میں دخل دیا کرتی تھی مگر یہ سب کچھ دیکھ کر وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''ارے! تمہیں نہیں معلوم!'' اس لاعلمی پر شاہ جی کی لڑکی بے اختیار قہقہہ لگا اٹھی۔ ''دولت سائیں کا عرس ہے پورے تین دن رہتا ہے اور یہ تین دن تو ہمارے عید سے بھی زیادہ خوشی کے گزرتے ہیں۔'' پھر وہ آپ ہی اسے تفصیل بتانے لگی۔ ''ہم گوٹہ کناری والے بڑے خوبصورت کپڑے پہنتے ہیں بڑی بڑی شاندار چیزیں پکتی ہیں۔ خانقاہ پر بے شمار چڑھاوے چڑھتے ہیں وہ ہمارے گھر کے سامنے جو کھلا سا میدان ہے نا وہاں باقاعدہ میلہ لگتا ہے۔ مختلف قسم کے کھیل تماشے ہوتے ہیں جھولے پڑتے ہیں دکانیں لگتی ہیں۔ دور دراز سے لوگ ٹولیاں بنا بنا کر ناچتے گاتے آتے ہیں۔ دو تین دن مسلسل قوالیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کیا تم نے پہلے کبھی کوئی عرس نہیں دیکھا؟''

''نہیں۔'' اور اس وقت صبا نے خود کو بہت کمتر محسوس کیا۔

''حد ہو گئی۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''نجانے تم نے کون سے جنگل میں اتنی زندگی گزاری ہے بالکل ہی کچھ نہیں جانتیں۔'' صبا اپنی کم علمی پر کھسیانی سی ہو کر رہ گئی۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جس کے لئے اتنی تیاریاں ہو رہی تھیں سب نے خوب قیمتی قیمتی کپڑے پہنے تھے دیگیں چڑھی ہوئی تھیں سامنے میدان میں دور دور تک لوگوں کے سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔

جھولوں کی چیں چیں کی آواز کانوں کو بڑی ناگوار سی لگ رہی تھی ساتھ ہی ساتھ طبلے کی تھاپ اور قوالوں کی آواز بھی آ رہی تھی غرض شور وغل سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔

سوائے شاہ جی کی بڑی دو لڑکیوں کے باقی سب بچے صبح سے غائب تھے۔ شاید باہر میلہ دیکھ رہے تھے۔ کسی ایک کو دوسرے کی خبر نہ تھی۔ کوئی کام بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی سب ہی مصروف نظر آ رہے تھے۔

اور وہ طوفان میں بہتے تنکے کی طرح ادھر اُدھر تنہا پھر رہی تھی نجانے کیوں اتنی گہما گہمی کے باوجود اندر ہی اندر اس کا دل اداس ہوا جا رہا تھا۔

بلامقصد ہی صحن کا ایک چکر لگا کر وہ پھر اپنے کمرے میں آ گئی کہیں بھی دل نہیں لگ رہا تھا اوندھے منہ بستر پر لیٹ کر اپنے ماضی حال اور مستقبل کے متعلق سوچنے لگی۔

''میں اندر آ جاؤں؟''

دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد بڑی بی اور اس کے پیچھے دو ملازمائیں اندر داخل ہوئیں۔ صبا جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بڑی بی اس گھر کی منتظم اعلیٰ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ سارا لین دین، حساب کتاب، باورچی خانے کا انتظام غرض سب کچھ انہیں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ بڑی تیز طرار اور ہوشیار عورت تھی۔ شاہ جی کی بیویاں تو بس کھانا اور باتیں کرنا ہی جانتی تھیں۔ گھر کے انتظام میں انہوں نے کبھی دخل نہیں دیا تھا۔

''ارے! تم انہیں روز والے کپڑوں میں ہی ہو آج تو کوئی اچھے پہننا تھے۔''

بڑی بی اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ اور پھر ملازمہ کے ہاتھ سے سرخ سرخ چمکیلے سے کپڑے لے کر گھٹنوں پر رکھ لئے۔ ''اٹھو نہاؤ دھوؤ آج کے دن یوں پرانے کپڑے یہاں کوئی نہیں پہنتا۔''

''جی اچھا۔''

''نہانے کے بعد یہ کپڑے پہن لینا۔'' اس نے وہ سرخ سرخ کپڑے وہاں پلنگ پر پھیلا دیئے۔

''یہ!'' صبا بڑی حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔ ایک تو ان کا رنگ بڑا شوخ سا سرخ تھا۔ دوسرے اوپر سے بہت سارے سلمہ ستارے ٹکے ہوئے تھے۔ ''لیکن یہ تو بہت بھڑکیلے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں تم پہن لو۔''

''مگر۔ مگر۔'' پھر وہ ان تینوں کو سر سے لے کر پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولی۔

''اور تو کسی نے ایسے نہیں پہنے ہوئے۔''

''ہماری کوئی شادی ہو رہی ہے؟'' ایک ملازمہ بڑی تیزی سے بولی اور پھر دونوں منہ کے آگے دوپٹے رکھتے ہوئے کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

''کیا؟'' صبا کی سمجھ میں اس کی بات نہ آئی تو آنکھیں پھاڑے بڑی حیرت سے ایک ایک کو دیکھنے لگی۔

''کیا دانت نکوس رہی ہو بیہودہ!'' بڑی بی نے دونوں کو ڈانٹا مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا دونوں پھر بھی اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنستی ہی رہیں۔ صبا بڑی سخت پریشان ہوگئی۔ آخر معاملہ کیا تھا؟ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی۔

''تو پھر پہن لینا یہ کپڑے!'' بڑی بی نے اسے سوچوں میں کھوئے دیکھ کر دوبارہ تاکید کی۔

نہیں میں یہ نہیں پہنوں گی۔ صبا بڑا سہم سہم کر ان تینوں کو دیکھ رہی تھی۔

''شاہ جی کا حکم ہے تمہیں ماننا ہی پڑے گا۔'' اور اب بڑی بی کے لہجے میں سختی تھی

صبا کانپ کر رہ گئی۔

''لیکن۔ لیکن۔'' وہ پھر ڈرتے ڈرتے بولی۔ ''ایسے شوخ اور بھڑکیلے کپڑے میں نے کبھی نہیں پہنے۔''

''پہلے بے شک کبھی نہ پہنے ہوں لیکن اپنی شادی پر تو سب ہی پہنتے ہیں۔'' دوسری ملازمہ اسے بڑے سمجھانے والے انداز میں کہنے لگی۔

''کس کی شادی؟'' صباسٹ پٹاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''تمہاری اور کس کی؟''

''نہیں نہیں!''

بڑی بی نے بہت گھور کر اسے دیکھا اور پھر سنگین لہجے میں بولی۔ ''کیا یونہی ساری عمر آوارہ پھر کر گزارنی ہے وہ اس کی بھلائی کر رہے ہیں اور اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔'' اور پھر اس نے صبا کو کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ ''چلو رشیدہ، شریفہ! چلو باہر نکلو اور تم نہا کر یہ کپڑے پہنو۔''

وہ صبا کو حکم دے کر دونوں کو بھیڑوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے آگے آگے باہر لے گئی۔ صبا جامد و ساکت کھڑی تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا معاملہ تھا۔ آخر اس کی شادی کرنے کا حق انہیں کس نے دیا تھا؟

بہت سوچنے کے بعد اسے خیال آیا کہ شاید شاہ جی نے اس کے لئے یہی مناسب سمجھا ہو۔ اللہ کے خاص بندے تھے۔ اپنی بزرگی کی وجہ سے انہیں ہر قسم کا حق حاصل ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ سب کے لئے بہتری سوچا کرتے تھے۔ شاید ان کے علم میں اس کے لئے یہی سب سے بہتر راستہ تھا۔

شاہ جی جو کہتے وہی کیا کرتے تھے ان کے حکم کو سب ہی خدائی حکم سمجھتے تھے پھر صبا جیسی سیدھی سادی لڑکی کیسے نافرمانی کر سکتی تھی وہ بھی شاہ جی کے فرمان کو خدا کا حکم سمجھتے ہوئے مطمئن ہوگئی۔ وہیں ایک ہی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر بستر کے قریب جا پہنچی۔ وہاں وہی سرخ جوڑا پھیلا ہوا تھا۔ پاس ہی فرش پر بیٹھ گئی اور بڑے غور

سے اسے دیکھنے لگی۔ کتنے خوبصورت نمونے میں سلمہ ستارے لگے ہوئے تھے۔ وہ ہاتھ بڑھا کر آہستہ آہستہ اس پر پھیرنے لگی۔

اس کی شادی ہو رہی تھی۔ وہ جوان تھی اور ہر جوان لڑکی کی طرح دل میں جذبات بھی رکھتی تھی۔ اس سوچ نے اس کے رخساروں پر حیا بھری سرخی پھیلا دی۔ وہیں گھٹنوں میں چہرہ چھپا کر بیٹھ گئی اور تصور ہی تصور میں خود کو وہ لال جوڑا پہنے دلہن بنی دیکھنے لگی۔

دلہن کے ساتھ ساتھ دولھا کا تصور لازم وملزوم تھا۔ اس نے دیکھا جیسے وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد بھاری بھاری قدموں کی چاپ ہوئی۔ پھر کسی نے قریب آ کر بڑی آہستگی سے اس کا کندھا ہلایا۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے اس نے اپنے دولھا کو دیکھنے کی کوشش کی۔

وہ عدنان تھا۔

''نہیں نہیں۔'' وہ جلدی سے چونکی یہ کیسے ہو سکتا تھا وہ بے وفا تو جفا کر گیا اور اب وہ اس کا نہیں تھا بلکہ غزالہ کا تھا اس کا دولھا تو کوئی اور تھا۔

وہ پھر تصورات میں ڈوب گئی۔

وہ چھپر کھٹ کتنا خوبصورت تھا جس پر وہ بیٹھی تھی! کتنی ساری لڑکیوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور ہنسی مذاق میں مصروف تھیں۔ وہ شرمائے جا رہی تھی' لجائے جا رہی تھی کہ ایک دم ''دولھا آ گیا دولھا آ گیا۔'' کہتی ہوئی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی ہوئی سب کمرے سے باہر بھاگ کر نکل گئیں۔

سمٹ کر اس نے گھونگھٹ کچھ اور بھی کھینچ لیا اور چپکے چپکے اس میں سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دولھا کو دیکھا۔

''اوہ!''

اور اب اسے بے شمار پھولوں اور طلائی ہاروں کے درمیان سہیل کا مشفق اور پرخلوص چہرہ دکھائی دیا۔ وہ کتنی پیار بھری نگاہوں سے اس سرخ گٹھری کو دیکھ رہا تھا۔ مگر

دوسرے ہی لمحے وہ کانپ کر رہ گئی پھپھو کی غضبناک آنکھیں اسے کھا جانے والے انداز میں گھور رہی تھیں۔

''اوہ! پھپھو مجھے معاف کر دیجئے۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' وہ بے اختیار بڑبڑائی۔

چند لمحوں بعد وہ پھر خیالات کی دنیا میں گھوم رہی تھی۔

سرخ عروسی جوڑے نے اس کے انگ انگ میں ایک آگ سی بھر دی تھی۔ اور اس آگ کی تپش اس کے رخساروں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس نے دونوں گھٹنوں میں تپتے ہوئے رخساروں کو زور سے دبا لیا۔ دولھا نے قریب بیٹھتے ہوئے بہت دھیرے سے دلھن کا گھونگھٹ سرکایا۔

''ارے! یہ تم ہو۔'' دلھن نے دولھا کی آواز سن کر چونکتے ہوئے حیا سے لرزتی پلکیں اٹھائیں کتنی ہی دیر وہ اس کو پہچاننے کی کوشش کرتی رہی۔ ''پہچانا نہیں؟''

وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ''میں وہی موٹر سائیکل والا ہوں جسے چھوڑ کر تم نجانے کہاں چلی گئی تھیں۔'' اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''یوں چپ چاپ اب تو مجھے چھوڑ کر نہ چل دو گی؟''

شرمندہ ہوتے ہوئے اس کی نظریں جھک گئیں۔

''نہیں۔''

اور اپنی بڑبڑاہٹ سے وہ آپ ہی چونک اٹھی۔

یہ وہ کیا سوچ رہی تھی؟ وہ اپنے آپ ہی کھسیانی سی ہو گئی بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ نجانے وہ اس وقت کہاں ہوگا اور پھر اس کے ساتھ تو ایسی زیادتی کر بیٹھی تھی کہ اب وہ خود ہی اسے منہ دکھانے کے قابل نہ رہی تھی۔

پھر؟ پھر اس کا دولھا کون ہوگا کیسا ہوگا؟

اور ہر جوان لڑکی کے تصورات کی طرح اس کا دولھا شہزادوں جیسا حسین اور بہادر تھا۔ وہ جاگتی آنکھوں اس کا سپنا دیکھنے لگی۔

دروازے پر بڑی ہلکی ہلکی دستک ہوئی وہ چونک اٹھی اور پھر بھاگ کر اس نے

دروازہ کھول دیا۔

پگلی اماں لاٹھی ٹیکتے ہوئے اندر داخل ہوئی یہ آج تک اسے علم نہیں ہو سکا تھا کہ اس کا اس گھر سے کیا تعلق واسطہ تھا۔ سب اسے پگلی اماں کہتے تھے۔ کیوں کہتے تھے یہ اسے معلوم نہ تھا۔ وہ زیادہ تر الگ تھلگ ہی رہتی تھی اور اس وقت صبا اسے اپنے کمرے میں پا کر حیران اور خوفزدہ سی ہوگئی۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی اس کے کمرے میں آنا تو کجا رہا اس نے کبھی صبا سے بات تک نہ کی تھی بس جانماز پر بیٹھی تسبیح پھیرتی رہتی۔

''کیا کر رہی ہو؟'' پگلی اماں نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''

اور ساتھ ہی غیر ارادی طور پر صبا کی نگاہیں اس پھیلے ہوئے سرخ جوڑے کی سمت اُٹھ گئیں۔ اس کی نظروں کے ساتھ ساتھ پگلی اماں نے بھی ادھر دیکھا۔ ''اچھا! تو آج تمہاری شادی ہے مجھے ابھی ابھی رشیدہ سے معلوم ہوا ہے۔''

وہ اسی طرح بہت آہستہ سے بولی۔ ''ذرا دروازہ بند کر کے میری بات سنو۔''

اس کے کہنے سے صبا نے دروازہ تو بند کر دیا لیکن دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی کہ نجانے وہ پاگل اس کے ساتھ کیا کرنے والی تھی؟

''ادھر آؤ۔'' اس نے صبا کا ہاتھ پکڑا اور کمرے کے دوسرے کونے میں اسے کھینچ لے گئی اس کی اس حرکت نے صبا کو اور بھی خوف زدہ کر دیا۔

''یہاں میرے قریب بیٹھ جاؤ۔'' وہ بڑی بے تکلفی سے فرش پر ہی بیٹھتے ہوئے بولی۔ صبا ڈرتے ڈرتے اس سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

''تم اپنی شادی سے خوش ہو۔'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''شاہ جی بزرگ ہیں ان کی دانست میں یہی بہتر ہوگا میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''

''لعنت پڑے اس کی بزرگی پر تم مجھے اپنی مرضی بتاؤ۔'' اس نے بڑی تلخی سے کہا۔

اور شاہ جی جیسے خدا کے بزرگ بندے کی شان میں اس کی یہ گستاخی دیکھ کر صبا تو کانپ ہی اٹھی انہیں ہر بات کا علم ہو جایا کرتا تھا کیا اس بڑھیا کو ان کے عتاب کا ڈر نہیں تھا؟

''میری بات کا تم نے جواب نہیں دیا۔''

''میں نے کہا نا کہ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔'' صبا نے اسی سادگی سے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے تمہاری شادی کس کے ساتھ ہو رہی ہے؟''

''نہیں۔''

''وہ اپنے ساتھ تمہاری شادی کر رہا ہے۔''

''کیا؟'' صبا اس پگلی کی بات پر بے اختیار مسکرا دی۔ ''ان کی تو پہلے ہی تین بیویاں موجود ہیں۔''

''تین!'' وہ پگلی طنزیہ ہنسی۔ ''صرف تین ہی نہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''تین سے چار تو اکثر ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن صرف چند دن کے لئے پھر ایک کو اچانک اجل اپنا لقمہ بنا لیتی ہے اور باقی پھر تین ہی رہ جاتی ہیں تاکہ شرع کی رو سے چوتھی کی جگہ خالی رہے۔ نجانے کب کوئی خوبصورت چڑیا جال میں آ پھنسے۔ ویسے چار سے پانچ کبھی نہیں ہوئیں۔ مگر پھر بھی بیسیوں سے بیاہ رچا چکا ہے۔''

سارا زمانہ جس کی نیکی اور بزرگی کے گن گاتا ہے اس کے متعلق وہ ایسے کلمات زبان سے نکال رہی تھی سب ٹھیک ہی تو اسے پگلی کہتے تھے صبا سوچ رہی تھی۔

''مجھے ایسے لگتا ہے جیسے تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا۔'' اس نے بڑی مایوسی سے صبا کی جانب دیکھا۔

''مجھے تمہاری کم عمری اور معصومیت پر ترس آ رہا ہے میں کہتی ہوں یہاں سے چلی جاؤ رات ہونے سے پہلے پہلے بھاگ جاؤ ورنہ پھنس گئیں تو کہیں کی نہ رہو گی۔'' پھر وہ جھنجھلاتے ہوئے بولی۔ ''لڑکی! میری بات کا یقین کر مجھے پاگل نہ سمجھ میں پاگل نہیں ہوں تو کیا جانے مجھے پاگل بھی اسی نے جان بوجھ کر مشہور کر رکھا ہے۔''

''کیوں؟''

صبا بڑے غور سے اس کی جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''میں اسے ان بداعمال سے منع جو کرتی رہتی ہوں۔''

''آپ کون ہیں اور شاہ جی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''یہ نہ پوچھو بس میرا کہا مانو اور یہاں سے چلی جاؤ ورنہ ایک خون اور اس کی گردن پر چڑھ جائے گا۔''

''نجانے آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟''

''اوہ! اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ یہ سب فریب اور دھوکا ہے۔ یہ مزار اور یہ پیری فقیری! نہ یہاں کوئی دولت سائیں دفن ہے اور نہ خود اس میں کوئی ہے۔ یہ سارا چکر تو پولیس کو اندھیرے میں رکھنے کے لئے ہے۔''

''خانقاہ تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔''

صبا ابھی تک اس کی باتوں کا یقین کرنے سے قاصر تھی۔

''باہر سے ہی دیکھی ہے نا اب اندر کا حال تم کیا جانو۔ وہ تو صرف دکھاوے کی ہے۔ ویسے اصل میں تو وہ تہہ خانے کا دروازہ ہے جہاں افیم' چرس اور کوکین وغیرہ رکھی جاتی ہے۔''

''نجانے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟'' صبا ہونقوں کی طرح اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ سب میں پاگل مشہور تھی لیکن پھر بھی اس کی باتوں پر یقین کرنے کو اب اس کا دل چاہنے لگا تھا بھلا دیوانہ ایسے پتے کی باتیں کر سکتا تھا؟

''لے میں تجھے یہ بھی بتا دوں کہ میں کون ہوں؟'' اس کی چندھی چندھی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ ''میں اس کی سگی ماں ہوں۔ وہ مجھے کچھ کہہ تو سکتا نہیں۔ میں اسے اس ناجائز کاروبار اور بدکرداریوں سے ٹوکتی رہتی ہوں اس لئے اس نے مجھے پاگل مشہور کر رکھا ہے۔ میں شروع سے ہی اسے کہتی آئی ہوں کہ جو روکھی سوکھی میں مزہ ہے وہ اس دغا اور فریب کے ترمال میں نہیں مگر اس نے میری ایک نہیں سنی۔ پہلے اسی قسم کے کسی پیر کا خود چیلا بنا رہا اور ایسے کام کرتا رہا اس کے مرنے کے بعد اب اس کی گدی سنبھال بیٹھا ہے۔ بڈھا ہو چلا ہے مگر شرم نہیں آتی خضاب لگا لگا کر جوان بنا رہتا ہے اور نت نئی شادیاں رچاتا

رہتا ہے۔'' پھر وہ ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے بڑے دکھ سے بولی۔ ''اب تم پھنس گئی ہو۔ تین چار سال بعد تمہارا وہی حشر ہوگا۔''

''کیا؟'' صبا نے سہم کر پوچھا۔

''جو پہلے اتنی عورتوں کا ہو چکا ہے ایک دن تجھے کھانے میں کچھ نہ کچھ دے دیا جائے گا اور مشہور کر دیا جائے گا کہ دل کا دورہ پڑا اور مرگئی یا پھر ہیضہ ہوگیا' یا سانپ کاٹ گیا ہے۔ بے شمار بہانے ہیں۔''

''نہیں نہیں۔'' صبا کی چیخ سی نکل گئی۔ ''مجھے تو ابھی اپنی ماں کو تلاش کرنا ہے۔''

''جب میں اپنے بیٹے کو ان حرکتوں سے باز نہ رکھ سکی تو اب میں پھنسنے والی لڑکیوں کو سمجھاتی ہوں مگر چونکہ سب مجھے پاگل سمجھتے ہیں اس لئے کوئی میرا یقین نہیں کرتی اور پھر بعد میں۔'' اس کے لہجے میں کرب تھا۔ ''پھر کچھ کر ہی نہیں سکتیں رو دھو کر بیٹھ جاتی ہیں اس کا شکنجہ اتنا سخت ہوتا ہے کہ کوئی اُف تک نہیں کر سکتی۔''

''تو پھر بتائیں میں کیا کروں؟''

''یہ میں نہیں جانتی بس میری اتنی نصیحت ہے کہ خود کو بچا کر یہاں سے چلی جاؤ لیکن......'' وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر بڑے ملتجی انداز میں بولی۔ ''ایک وعدہ کرو۔''

''کیا؟''

''اب تم ہر راز سے واقف ہوگئی ہو پولیس میں رپورٹ نہ دینا۔ میرا بس یہی ایک بیٹا ہے اسے کچھ ہو گیا تو میں کیسے جی سکوں گی۔'' آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے چہرے کی جھریوں میں سمائے جا رہے تھے۔

مامتا بھی کیسا عجیب جذبہ ہے! بیٹے کی بدکرداری سے تنگ بھی آئی ہوئی تھی لیکن اس کا برا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ ہر حال میں اسے زندہ سلامت اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھنا چاہتی تھی۔ صبا سوچ رہی تھی اور پھر بے اختیار اسے اپنی ماں یاد آ گئی۔ وہ اتنی بری نہ تھی کہ اس کی ماں اسے یوں پھینک گئی تھی۔

''امی جی!'' صبا نے بڑی عقیدت سے اس کی سوکھی ہوئی کھال والے ہاتھ تھام

لئے۔ ''آپ فکر نہ کریں میں آپ کے بیٹے کی رپورٹ نہیں کروں گی۔'' پھر اس نے مشکور انداز میں اسے دیکھا۔ ''آپ نے میرے ساتھ جو بھلائی کی ہے اس کا بدلہ تو میں نہیں دے سکتی لیکن آپ کے لئے یہ دعا کرتی رہوں گی کہ خدا آپ کے بیٹے کو نیکی کی راہ دکھائے۔''

''ہاں بیٹی اللہ تجھے سلامت رکھے۔ بس میرے لئے تو تیری یہی دعا سب سے بڑا بدلہ ہے۔'' اور وہ اٹھ کر لاٹھی ٹیکتے ہوئے دروازے کی جانب چلی۔ ''سنو!'' وہ پلٹتے ہوئے بڑی آہستہ آواز میں بولی۔ ''اس وقت دن کی روشنی میں تم کہیں نہیں جا سکو گی ایسی کوشش کرنا بھی نہ۔ اگر پکڑی گئیں تو اس سے بھی زیادہ مصیبت میں پھنس جاؤ گی شام کو البتہ تمہیں موقع مل سکتا ہے۔''

''لیکن لیکن پھر۔'' اور وہ ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

''نہیں نہیں۔'' وہ صبا کی ہچکچاہٹ سے ہی بات سمجھ گئی۔ ''شادی رات کے دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوگی تمہیں کافی وقت مل جائے گا۔''

اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی صبا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا کسی نے بھی پگلی اماں کی طرف دھیان نہ دیا تھا وہ مطمئن سی ہو گئی۔

23

وہ گھر ہی ایسا تھا کہ وہاں سے چوری چوری نکل بھاگنا تقریباً ناممکن تھا۔ اس کی چہار دیواری اتنی بلند تھی کہ وہ تو عورت تھی کوئی دراز قد مرد بھی اس پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ اور اب اسے احساس ہوا کہ یہ گھر تو واقعی قید خانہ تھا۔ پگلی اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی کہ ایک بار جو اس میں پھنس جائے پھر ساری عمر کے لئے قید ہو کر رہ جاتا تھا۔ کچھ بھی ہو بہرحال رات ہونے سے پہلے پہلے اسے وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا۔

اس اتنی بڑی عمارت کا باہر نکلنے والا بس ایک ہی پھاٹک تھا اور اس کے

سامنے اس وقت میلہ لگا ہوا تھا۔ نہ لگا ہوتا تو پھر بھی وہاں سے نہیں جا سکتی تھی۔ ہر وقت شاہ جی کا کوئی نہ کوئی آدمی پھاٹک پر ضرور موجود رہتا تھا اور ہر آنے جانے والے پر خوب کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ یہ تو اب اسے معلوم ہوا تھا کہ ایسا کیوں تھا ورنہ پہلے تو اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔

پھر وہ کیا کرے؟ کس طرح وہاں سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو؟ وہ پلنگ پر پھیلے اس سرخ جوڑے کے پاس بیٹھی پریشان ہو ہو کر سوچ رہی تھی اور اب یہ عروسی جوڑا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی سانپ پھن پھیلائے بیٹھا تھا اور ذرا بھی اس سے چوک ہو جانے پر اس نے اسے ڈس لینا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی نجانے کون تھا؟ ڈرتے ڈرتے اٹھ کر اس نے دروازہ کھول دیا بڑی بی کھڑی مسکرا رہی تھی اور اس کی یہ مسکراہٹ اس وقت اس کو بڑی مکروہ لگی۔ گھر میں اس کی حیثیت سے اب صبا کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ بھی شاہ جی کی کارندہ تھی۔

''تم نے ابھی تک نہا دھو کر کپڑے نہیں بدلے۔'' وہ صبا کے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے بولی۔

''نیند بہت آ رہی تھی تھوڑی دیر کے لئے سو گئی تھی۔'' صبا نے جلدی جلدی آنکھیں ملتے ہوئے بہانہ بنایا۔

''چلو کوئی بات نہیں بے شک تھوڑا سا اور سو لو اچھا ہے۔'' اور وہ صبا کو دیکھتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ ''یہ دیکھو دلھن کا زیور!''

اس نے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ایک صندوقچی کا ڈھکنا کھول کر اسے دکھایا کتنے ہی سارے سونے کے زیور جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔

''میں ان زیورات کے لالچ میں آنے والی نہیں۔'' صبا نے سوچا۔

''میرا خیال تھا تم کپڑے پہن چکی ہوگی اور اب یہ پہنانے آئی تھی اچھا! فی الحال میں یہ واپس لئے جاتی ہوں۔'' وہ صندوقچی کو بغل میں داب کر واپس مڑی چند قدم چلنے کے بعد جیسے کچھ یاد آ گیا تھا رک کر پھر صبا سے مخاطب ہوئی۔ ''دوپہر کو تم نے کھانا کھایا تھا؟''

"نہیں۔"

"یہ رشیدہ اور شریفہ تو بہت ہی کام چور ہوتی جا رہی ہیں۔ آج ہی شاہ جی سے ان کی شکایت کروں گی۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے اور انہیں کوستے ہوئے مڑ کر چل دی۔ صبا پھر کمرے میں آ کر انہیں خیالات میں غرق ہوگئی اور اسے یوں کہنی گھٹنے پر اور ٹھوڑی ہتھیلی پر رکھے بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ رشیدہ ایک سینی اٹھائے اندر داخل ہوئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" صبا پر جھنجلاہٹ سی طاری ہوگئی۔ اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا اور وقت گزرا جا رہا تھا۔ پھر ایسے وقت میں بھلا بھوک لگ سکتی تھی جب جان پر بنی ہو۔

"بھوک کیوں نہیں تھوڑا سا کھا لو ورنہ بڑی بی مجھے کھا جائے گی۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسی التجا تھی کہ صبا کو ترس آ گیا۔

"اچھا یہاں رکھ دو ابھی کھا لوں گی۔"

رشیدہ نے سینی وہیں رکھی اور صبا کو اور اس سرخ جوڑے کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر باہر نکل گئی۔ صبا پھر سوچوں میں کھو گئی۔ سامنے کھانا پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا مگر اسے کوئی ہوش نہ تھا۔ سوچ سوچ کر دماغ خراب ہوا جا رہا تھا لیکن کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

دھڑام سے دروازہ کھلا۔ اتنے زور سے کہ اس کے دونوں کواڑ اردگرد ٹکرا گئے صبا نے چونکتے ہوئے پلٹ کر اس آنے والے طوفان کو دیکھا۔

وہ شاہ جی کا وہی سب سے شریر لڑکا فرید تھا۔ گیارہ بارہ سال کے قریب اس کی عمر ہوگی مگر قد ابھی سے اتنا لمبا تھا کہ چودہ پندرہ سال کا لگتا تھا۔ صبا کی اس کے ساتھ بڑی دوستی تھی وہ باتیں ہی کچھ ایسی بھولی بھالی اور مزیدار سی کرتا تھا کہ صبا کو خواہ مخواہ ہی اس پر پیار آ جایا کرتا تھا اور پھر وہ گھنٹوں بیٹھی اس سے باتوں میں مصروف رہتی اس طرح ان دونوں کی دوستی دوسروں کی نسبت زیادہ گہری ہوگئی تھی۔

"یہ لو میں تمہارے لئے میلے کا قلمہ لایا ہوں۔ ہائے جلدی پکڑو بڑا سخت گرم

ہے۔" نیچے نہ کوئی رکابی تھی نہ کاغذ۔ تیل میں دونوں ہاتھ لتھڑے ہوئے تھے اور وہ جلدی جلدی اسے ہاتھوں میں بدل رہا تھا کبھی اس ہاتھ میں رکھ لیتا اور کبھی دوسرے میں۔ اپنے سب تفکرات بھول کر صبا بے اختیار مسکرا دی۔ جلدی سے سینی میں سے رکابی اٹھا کر اس کے آگے کر دی۔

"یہاں اس میں رکھ دو۔" اور پھر رکابی میں رکھنے کے بعد صبا نے اس کے ہاتھوں کو دیکھا تو وہ بڑے سرخ ہو رہے تھے۔

"پگلا!" وہ بڑے پیار سے بولی۔ "کسی برتن میں کیوں نہیں لائے دیکھو تو ہاتھ کیسے جل کر سرخ ہو رہے ہیں!"

اس کے ہاتھوں کی جلن نے صبا کو بے قرار کر دیا جلدی سے اس کے تیل میں لتھڑے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلانے لگی۔

"وہاں میلے میں کوئی برتن کہاں سے آتا؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو لانے کی اتنی ضرورت کیا تھی۔"

"بڑے مزیدار ہیں میں نے سوچا شاید تم نے پہلے کبھی نہ کھائے ہوں۔"

"میلہ کیسا ہے؟" صبا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بڑا ہی شاندار!"

"جھولا جھول کر مجھے تو چکر آ رہے ہیں مگر میرا دل ابھی تک نہیں بھرا۔"

"اچھا! اتنا مزہ آتا ہے۔"

"ہاں تم نے کبھی نہیں جھولا؟"

"نہیں۔"

"ارے! سچ؟"

"ہاں۔"

"یہ تو پھر بڑی خراب بات ہے۔"

"کیا خراب بات ہے؟" صبا ہنس دی اس کی ایسی ہی دلچسپ باتوں سے تو وہ

محظوظ ہوا کرتی تھی۔

''کہ تم نے کبھی جھولا نہیں جھولا۔'' پھر وہ اور بھی متحیر ہوتے ہوئے بولا۔ ''کسی بھی قسم کا نہیں؟''

''کیا مطلب؟''

''جھولا کئی قسم کا ہوتا ہے نا۔ گول دائرے میں چکر لگانے والا، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر کی طرف گھومنے والا۔''

''اچھا!''

''آؤ تمہیں بھی میلہ دکھا لاؤں؟''

''پاگل!'' اور صبا کو اس کی معصومیت پر بے اختیار پیار آ گیا۔ ''بھلا میں کیسے باہر اتنے سارے لوگوں میں جا سکتی ہوں۔''

''کیوں تمہیں کیا ہے؟''

''میں کوئی لڑکا تو نہیں ہوں۔''

''تو کیا لڑکیاں میلہ نہیں دیکھا کرتیں؟ بلی، رانی، گوگی سبھی میلے میں گھوم رہی ہیں۔''

''لیکن وہ چھوٹی چھوٹی ہیں نا اور میں تو بڑی ہوں۔''

''پھر تم نے پہلے جو کبھی نہیں دیکھا۔''

''تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے۔''

''لیکن میرا جی چاہتا ہے تم بھی دیکھ لو پھر کیا کیا جائے؟'' اسے میلہ دکھانے کے متعلق وہ بڑے خلوص سے پریشان ہو رہا تھا۔ ''ارے! یہ ٹھیک ہے۔'' وہ بڑے زور سے تالی بجا کر اچھلا۔ ''تم ایسے کرو میرے کپڑے پہن لو پھر تم لڑکا بن جاؤ گی نا میلہ دیکھ کر آ کے اتار دینا۔''

''نجانے تمہیں عقل کب آئے گی بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم جب ڈرامہ کرتے ہیں تو لڑکیاں لڑکے نہیں بنتیں؟''

''وہ اور بات ہے فرید!''

''نہیں، چلو تمہیں جھولا بھی جھلاؤں گا۔ بڑا مزہ آتا ہے۔'' وہ ضد کرنے لگا اور یہ اس کی عادت تھی وہ اکثر انہونی سی باتوں پر ضد کر بیٹھتا اور اور پھر منوا کر رہتا۔

''لاؤں اپنے کپڑے؟''

اس کی ضد نے صبا کو سوچنے پر مجبور کر دیا مگر پھر فوراً اسے خیال آیا کہ اسے تو رات سے پہلے پہلے اس گھر سے جانا تھا وہ ایک دم فکرمند ہو گئی۔

کیسے سب کچھ بھلائے بیٹھی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ پھر جانا ہے نا میلہ دیکھنے؟''

اور اب اچانک ہی اس کے دماغ میں جیسے روشنیاں سی بھر گئیں۔ فرید کا بتایا ہوا طریقہ تو ایسا لاجواب تھا کہ وہ اس طرح اس قفس سے رہائی بھی حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے ہر طرح سوچا۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ تھا بھی نہیں۔ ''شکریہ! میرے ننھے رہنما!'' صبا نے بڑے مشکور انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

''چلو گی نا میلہ دیکھنے؟''

''ہاں لیکن......''

''بس! صرف دو منٹ میں ابھی آیا۔''

اس نے صبا کی پوری بات بھی نہیں سنی اور چٹکی بجاتا ہوا بھاگ گیا۔

صبا نے دیکھا وہ جو یوں اپنے ہاتھوں کو جلاتا ہوا اتنے خلوص سے قتلمہ لایا تھا۔ پڑا پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ کھانے لگی ابھی اس نے دو تین نوالے ہی لئے تھے کہ فرید پھر ویسے ہی آندھی کی طرح در و دیوار سے ٹکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''اس وقت جلدی میں یہی ملے ہیں باقی بڑی بی نے پتہ نہیں کہاں رکھ چھوڑے ہیں۔'' اپنی بغل میں سے دبے کپڑے نکال کر اس نے صبا کو پکڑا دیئے۔ ''جلدی جلدی پہن لو۔''

صبا نے کھول کر دیکھا ایک شکن آلود سفید لٹھے کی شلوار تھی اور نیلی مردانہ قمیض۔

اس پر تو سلوٹوں کے علاوہ کئی قسم کے داغ دھبے بھی پڑے ہوئے تھے۔ جو کچھ بھی تھا بہرحال غنیمت تھا۔

''لیکن فرید!'' پھر اسے ایک دم کچھ خیال آیا تو پریشانی سے بولی۔ ''میرے تو بال اتنے لمبے ہیں ان کا کیا کروں گی؟''

''حد ہو گئی۔'' وہ زور سے ہنسا ''یاد نہیں رہا اس دن زہرہ کو کیسے لڑکا بنایا تھا۔ سارے بال اس نے سر کے اوپر لپیٹ لئے تھے اور میں جو شاہ جی کے ایک مرید کی ٹوپی چپکے سے اتار لایا تھا' وہ اس نے پہن لی تھی کیسا اصلی لڑکا لگ رہی تھی!''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر اب ٹوپی کہاں سے آئے؟''

''وہ میں نے سنبھال کر رکھی ہوئی ہے۔'' فرید ہنستے ہوئے بڑے رازدارانہ بولا۔ ''اس سے منو کو ڈرایا کرتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''سارے جسم پر بگلی اماں والا کالا کمبل لپیٹ کر منہ کے آگے وہ ٹوپی رکھ لیتا ہوں پھر اس میں بولتا ہوں۔ شکل اور آواز دونوں بڑی ڈراؤنی ہو جاتی ہیں وہ خوب چیخیں مارتا ہے۔''

''بہت شریر ہو۔'' صبا مسکرا دی۔

''تو پھر لاؤں وہ ٹوپی بھی۔''

''نہیں یہاں نہیں۔ وہ جو بڑی ڈیوڑھی کے پاس کاٹھ کباڑ والا کمرہ ہے نا وہاں لے کر آنا۔''

''یہاں سے باہر نکلیں گے تو کوئی دیکھ لے گا۔ پھر شاید مجھے اس طرح نہ جانے دیں۔''

''نہیں۔ کچھ بھی ہو تمہیں تو میں آج ضرور میلہ دکھانے لے کے جاؤں گا۔''

''اسی لئے کہہ رہی ہوں نا ڈیوڑھی میں سے باہر نکلتے ہوئے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

''چلو پھر تم کپڑے بدلو اور میں ٹوپی لاتا ہوں۔'' لیکن پھر کوئی خیال آنے سے وہ ٹھٹک گیا۔ ''یہ کپڑے تو تمہیں چھوٹے ہوں گے میں تم سے ذرا کم لمبا ہوں نا۔''

''ہاں پھر۔'' صبا بھی اس کے ساتھ پریشان ہونے لگی۔

''چلو کوئی بات نہیں پھر کیا ہے زیادہ چھوٹے نہیں ہوں گے۔'' بہت سوچنے کے بعد جب اور کچھ نہ سوجھ سکا تو اس نے اپنے آپ کو صبا کو تسلی دینے کے لئے کہا۔ ''میں نے دیکھا ہے وہ جو اس طرف یتیم خانہ ہے نا اس کے لڑکے اکثر ایسی ہی خراب اور چھوٹی چھوٹی قمیصیں پہنتے ہیں۔''

اس کی اس بات پر صبا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''چلو اچھا ٹھیک ہے۔'' مجبوری کا نام صبر اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ''لو تم یہ کپڑے اس کمرے میں رکھ کر ٹوپی لینے جانا میں پیچھے پیچھے آتی ہوں۔''

مزید کچھ کہے بغیر وہ اسی طرح کپڑوں کو گیند کی شکل میں لپیٹ کر بغل میں داب تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا صبا کچھ دیر وہیں بیٹھی رہی کہ کسی کو شک نہ پڑ جائے۔ جب فرید کے قدموں کی آواز سنائی دینا بالکل بند ہو گئی تو دھیرے سے اٹھ کر دروازے تک آئی اور گردن نکال کر جھانکا۔ پرے باورچی خانے کے دروازے میں رشیدہ بیٹھی تھی مگر ادھر اس کی پشت تھی۔ بغیر آواز پیدا کئے دبے دبے قدموں سے برآمدہ طے کر گئی۔ اب اسے اس کمرے سے گزرنا تھا جہاں اکثر بڑی بی اپنے مختلف قسم کے کاموں سے فارغ ہو کر چارپائی پر استراحت فرمایا کرتی تھی۔

''خدا کرے اس وقت وہ یہاں نہ ہو۔'' صبا دعا مانگتے ہوئے آگے بڑھی۔

''کون ہے؟'' قدموں کی بڑی ہلکی چاپ تھی مگر اس نے پھر بھی سن لی تھی نیند میں ڈوبی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ ''کہاں جا رہی ہو؟''

لمحہ بھر کے لئے صبا کا رنگ زرد پڑ گیا۔ پھر جلد ہی عقل آڑے آ گئی۔ ''غسل خانے میں نہانے جا رہی ہوں۔'' اور وہ جھپاک سے کمرے سے نکل گئی غسل خانے کے آگے سے گزرتے ہوئے بلاضرورت ہی اس کا دروازہ کھول کر بند کیا اور آگے بڑھ گئی۔

صحن میں بڑے زور شور سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ روز کی نسبت کچھ زیادہ ہی گہما گہمی معلوم ہوئی۔ آپ ہی آپ قدم اس طرف اٹھ گئے۔

''شی شی۔'' اس آواز نے اسے چونکا دیا جلدی سے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ فرید ہاتھ میں ٹوپی لئے کھڑا اشاروں سے اسے بلا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے شرمندہ سی ہوگئی تھی کیسی عجیب عجیب حرکتیں کرتی تھی۔ اب بھلا ادھر جانے کا یہ وقت تھا۔ وہ خود کو کوستی ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کے قریب چلی گئی۔ ''جلدی کرو نا شام ہوگئی تو ابا ماریں گے۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔

''اچھا تم یہیں رہنا میں ابھی بس دو منٹ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔''

وہ بڑی عجلت سے اس کاٹھ کباڑ والے کمرے میں گھس گئی فرید باہر کھڑے ہو کر ''ہے جمالو۔'' گا گا کر اس کا انتظار کرنے لگا۔

صبا نے اتنی جلدی سے سب کچھ کیا تھا کہ پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے ہوں گے۔ جب وہ باہر نکلی تو فرید اسے دیکھ کر مارے ہنسی کے دوہرا ہونے لگا۔

''کیا ہے؟'' صبا اس کی ہنسی سے پریشان ہو ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔

''بالکل یتیم لڑکا لگ رہی ہو۔'' اور پھر آگے بڑھ کر فرید نے اس کی ٹوپی کانوں تک کھینچ دی۔ ''تھوڑے تھوڑے بال نظر آرہے تھے۔'' اس نے بالکل صبا کے کان کے اندر ہونٹ گھسیڑتے ہوئے کہا۔ ''چل آ یار!''

بڑی شریر سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر لہرائی اور بے تکلفی سے صبا کا ہاتھ تھام کر ڈیوڑھی کی جانب چلا۔ اندر ہی اندر صبا کا دل دھک دھک کر رہا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

''تمہارے پاس کوئی پیسے ہیں؟'' وہ چلتا چلتا رک کر پوچھنے لگا۔

''نہیں۔''

''حد ہوگئی۔'' اس نے ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے سر ہلایا۔ ''بھلا پیسوں کے بغیر میلہ دیکھا جاتا ہے۔''

''چلو کوئی بات نہیں میں ایسے ہی دیکھ لوں گی۔'' صبا کا اصل مقصد میلہ دیکھنا تو نہیں تھا نا۔

''نہیں۔ تم ٹھہرو یہاں۔ میں ابھی لے کر آتا ہوں۔''

''سنو۔ فرید سنو۔'' مگر اس نے صبا کی ایک نہ سنی واپس اندر بھاگ گیا صبا وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''یہ فرید بھی بالکل ہی پاگل ہے۔'' وہ جھنجھلانے لگی اور سہم سہم کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کوئی آ نہ جائے۔ دور سے قدموں کی آواز آئی تو وہ بھاگ کر پھر اسی کمرے میں پناہ گزین ہوگئی۔

''کہاں ہو؟'' فرید کی دبی دبی آواز سن کر وہ باہر نکل گئی۔

''چپکے سے بڑی بی کے بٹوے سے نکال لایا ہوں۔'' وہ گہرے گہرے سانس لیتا ہوا ہنس کر بولا۔ ''اسے معلوم ہی نہیں ہوا بے سدھ سو رہی ہے اور.....'' اور وہ ہنسی سے دوہرا ہو کر جھکتا چلا جا رہا تھا۔

''اور کیا؟'' صبا الجھی الجھی سی بولی خواہ مخواہ ہی دیر کئے جا رہا تھا موقع کی نزاکت کا اسے ذرا خیال نہ تھا۔

''اس کی چوٹی اس کی چوٹی۔'' ہنسی کی زیادتی کی وجہ سے اس سے بات نہیں ہو رہی تھی۔

''بتاؤ بھی دیر ہو رہی ہے۔''

''اس کی چوٹی مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ بال ہیں نہیں اور اتنا لمبا سا پراندہ ڈال لیتی ہے۔'' وہ بڑی مشکل سے ہنسی پر قابو پا رہا تھا۔ ''وہ میں چارپائی کے پائے سے باندھ آیا ہوں آہا جی! جب اٹھے گی تو گردن ٹوٹے گی۔''

اور ایک بار پھر اس پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس کی اس حرکت پر صبا کو بھی ہنسی آگئی تھی مگر وہ ضبط کر گئی۔

''اونہوں! بُری بات وہ تم سے اتنی بڑی ہیں۔''

''ہوا کرے بُری۔'' فرید نے ناک بھوں چڑھائی۔ ''مجھے تو وہ ذرا اچھی نہیں لگتی۔ ہر وقت رعب ڈالتی رہتی ہے۔''

آہستہ آہستہ کانوں میں باتیں کرتے ہوئے وہ ڈیوڑھی میں پہنچ گئے باہر والے پھاٹک میں سٹول رکھے ایک بڑی بڑی مونچھوں والا شاہ جی کا آدمی اس پر براجمان تھا اور اس کا رخ میدان کی طرف تھا جہاں میلہ لگا ہوا تھا۔

قدموں کی آواز آئی تو اس نے جھٹ مڑ کر دیکھا۔ دل کے چور نے صبا کو پھر سہما دیا۔ فرید کے پیچھے پیچھے ہو کر اس کی نگاہوں کی زد سے بچنے کی کوشش کرنے لگی۔ مبادا اس کی عقابی نگاہیں یہ جان لیں کہ مردانہ کپڑوں میں وہ کوئی لڑکی تھی۔

مگر اس نے توجہ ہی نہیں دی سرسری نگاہ ڈال کر پھر رخ پھیر لیا۔

''یہ میرا دوست ہے۔''

عین اس کے پاس سے گزرتے ہوئے فرید خواہ مخواہ ہی اسے کہنے لگا۔ حالانکہ قریب ہی ہونے والے ایک مداری کے تماشے میں وہ بالکل مگن تھا۔ وہ دونوں چپکے سے گزر سکتے تھے۔

''بیچارا یتیم ہے نا اور یتیم خانے والے ایسے ہی کپڑے دیتے ہیں۔''

اس نے کچھ پوچھا بھی نہیں تھا اور فرید صفائی پیش کیے جا رہا تھا۔ نجانے اس نے فرید کی بات سنی یا نہیں۔ اچٹتی سی نگاہ ڈال کر پھر محو ہو گیا۔ مداری والا منہ میں سے بڑے بڑے گولے نکالے جا رہا تھا اور سبھی حیران و ششدر تھے۔

''ہونہہ! پہریدار بنا پھرتا ہے۔''

فرید بڑبڑاتے ہوئے ناک چڑھا کر اسے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد وہ لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں تھے۔

فرید، صبا کو ایک ایک دکان، ایک ایک چیز دکھانے لگا اور ساتھ ساتھ باقاعدہ کومنٹری نشر کرنے لگا۔

اتنے لوگ آ جا رہے تھے کوئی ایسے ہی بے خیالی میں ان کی طرف دیکھ لیتا تو

فرید جھٹ بول اٹھتا۔ ''بیچارا یتیم ہے اس لئے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔''

اور ہر بار صبا کر کہنی سے ٹھوکا دینا پڑتا ''چپ بھی رہو تم سے کسی نے پوچھا ہے جب کوئی پوچھے پھر جواب دینا۔''

''اچھا!'' وہ بڑی فرمانبرداری سے سر ہلا دیتا۔

اور یونہی گھوم پھر رہے تھے کہ فرید کی ایک دم چیخ سی نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' صبا نے گھبرا کر پوچھا۔

''تمہاری جوتی!''

اس کے اشارے پر صبا نے جلدی سے جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا۔ وہ وہیں ٹھٹک گئی۔ مردانہ لباس کے نیچے زنانہ کالے سینڈل پہنے وہ گھوم رہی تھی۔

''اب!'' اس نے مشورہ طلب نگاہوں سے فرید کی جانب دیکھا۔

''یتیم لڑکے کبھی کبھی پاؤں سے ننگے بھی ہوتے ہیں۔''

بہت دھیرے سے یہ کہتے ہوئے اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ جھک کر صبا کی جوتی اتار لی۔ لوگوں نے چیز کھا کھا کر کاغذ پھینکے ہوئے تھے بھاگ کر ایک اٹھایا۔ نہ جانے کس چیز والا تھا انگلیوں سے چپک رہا تھا مگر اس نے کچھ نہیں سوچا۔ جلدی جلدی اس میں جوتی لپیٹ صبا کی بغل میں دبا دی۔

''کسی کو کیا پتہ اس میں کیا ہے؟'' اور اپنی عقل پر نازاں اکڑ اکڑ کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ''اگر کسی نے پوچھا تو کہہ دیں گے کتابیں ہیں۔''

''بھلا کسی کو پوچھنے کی کیا ضرورت پڑی ہے۔'' صبا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''پھر بھی سوچ کر رکھنا چاہیے نا شاید کوئی پوچھ ہی لے۔'' اور وہ گھومتے گھماتے اسے اس طرف لے گیا جدھر جھولے پڑے ہوئے تھے۔ صبا ''نہ۔ نہ۔'' کرتی رہی مگر اس نے ایک نہ سنی جھولے والے کو کہہ کر اگلی باری میں سیٹ ریزرو کروالی۔

وہاں سے تو نکل آئی تھی اور اب صبا کسی نہ کسی طرح فرید سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی۔ مگر وہ تھا کہ سائے کی طرح ساتھ ساتھ تھا۔

"فرید! مجھے تو بڑی سخت پیاس لگی ہے اور میں تھک بھی گئی ہوں یہاں کہیں بیٹھتی ہوں تم مجھے پانی لا کر پلا دو۔"

اس نے اس لئے کہا تھا کہ پھر وہ اس کی نظر بچا کر اِدھر اُدھر کھسک جائے گی۔ بھیڑ اتنی تھی کہ چند منٹ بھی مل جاتے تو پھر وہ اس میں گم ہو سکتی تھی۔

"یہاں پانی کہاں ملے گا آؤ وہاں بیٹھ کر کوکا کولا پیتے ہیں تمہاری تھکن بھی دور ہو جائے گی۔" وہ اسے کوکا کولا کے ایک سٹال پر لے آیا۔

صبا کوکا کولا پیتی رہی اور سوچتی رہی اب فرید سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھی تو جب سے گھر کے دروازے سے باہر قدم رکھا تھا ایسے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا جیسے صبا کوئی ننھا سا بچہ تھی اور اسے خدشہ تھا کہ میلے میں گم ہو جائے گی۔ سوچتے سوچتے اچانک اسے ایک تدبیر سوجھ ہی گئی۔

"سنو! اس طرح جوتی بغل میں دبائے کب تک پھریں گے۔ تم ایسے کرو بھاگ کر اسے گھر چھوڑ آؤ۔"

"لاؤ میں اٹھا لیتا ہوں۔"

"نہیں پاگل! میں کہتی ہوں کہیں گم نہ ہو جائے۔"

"اچھا!" وہ صبا کی بات ہمیشہ بڑی جلدی مانا کرتا تھا۔ "لیکن ذرا ٹھہر جاؤ جھولے کی ہماری باری آ گئی ہے پہلے وہ لے لیں۔" وہ پھر صبا کو بادل نخواستہ اس کے ساتھ جھولا جھولنا پڑا وہ جھولے پر بیٹھی تو بے دلی سے تھی مگر پھر بھی مزہ آ گیا۔

کتنی ہی دیر وہاں لگ گئی۔ شام ہونے کو تھی ایسا نہ ہو گھر میں کسی کو خبر ہو جائے اور پھر بات شاہ جی تک جا پہنچے۔ ان کے مرید اتنے تھے کہ با قاعدہ ایک فوج تیار ہو سکتی تھی اور اگر سب اسے ڈھونڈنے نکل پڑتے تو پانچ منٹ کے اندر اندر وہ واپس اسی قید خانے میں ہو سکتی تھی اور پھر شاہ جی کی بیوی کی حیثیت سے۔

"اوہ نہیں۔" اس خیال نے ہی اسے لرزا دیا۔ جتنی جلد ہو سکے اب میلے کی حدود سے باہر نکل جانا چاہیے تھا۔

"فرید! میرے اچھے بھائی! لے ذرا یہ گھر چھوڑ آ۔ بھاگا بھاگا جائے گا تو دو منٹ میں واپس بھی آ جائے گا مجھے ڈر ہے کہ کہیں رکھ کر ہم اسے بھول نہ جائیں۔"

"اچھا لاؤ۔" جوتی پکڑ کر وہ بڑی عجلت سے بولا۔ "یہیں اسی جگہ کھڑی رہنا ذرا بھی ہلی تو گم ہو جاؤ گی پھر ابھی تمہیں موت کا کنواں بھی دکھانا ہے۔"

"اچھا!" صبا نے بڑی سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

فرید تیزی سے بھاگا اس کے نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی صبا نے اردگرد نظر دوڑائی۔ ہر کوئی اپنے میں مصروف تھا۔ ایک کو دوسرے کا ہوش نہ تھا چند لمحے کھڑے رہ کر اس نے سمت کا تعین کیا اور پھر ہجوم میں گم ہو گئی۔

24

اس کے دیکھتے دیکھتے شام ہوئی اور پھر ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ گو وہ میلے کی حدود سے بہت دور نکل آئی تھی مگر پھر بھی وہ ابھی تک بھاگنے کے انداز میں ہی تیز تیز چل رہی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں تھا۔

ذرا بھی کسی اور راہگیرے کے قدموں کی آواز سنتی جھٹ ٹھٹک کر' آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی جاتی کہ کہیں وہ شاہ جی کا آدمی نہ ہو۔ یونہی ڈرتے' چونکتے' ٹھٹکتے' گھبراتے وہ چلی جا رہی تھی کہ دفعتاً رک گئی۔ جوتی بھی نہیں پہنے ہوئے تھی۔ ننگے پاؤں میں نجانے کیا چبھ گیا تھا۔ تکلیف کے مارے وہ بے اختیار کراہ اٹھی۔ قریب ہی ایک مکان کی سیڑھیاں تھیں جلدی سے وہیں بیٹھ گئی اور روشنی کے رخ پاؤں اٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگی۔

پاؤں کے پنجے کے قریب کچھ چبھا ہوا تھا اور خون کی دھاریں ایڑی تک جا رہی تھیں۔ خون دیکھ کر تو تکلیف ایک دم کئی گنا بڑھ گئی۔ چنانچہ کچھ اور نہ ہو سکا تو بے چارگی

نے رونے پر مجبور کر دیا۔

ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی اس لئے آمدورفت کافی تھی۔ کوئی پاس سے گزرتا تو جلدی سے چپ ہو جاتی۔ اس کے ذرا دور جاتے ہی پھر پاؤں کا بہتا ہوا خون دیکھ کر رونے لگتی۔ درد اتنا تھا کہ زمین پر پاؤں رکھا ہی نہیں جا رہا تھا کیسے اٹھ کر کہیں جاتی۔ بے بسی نے وہیں کسی کی سیڑھیوں میں ہی ڈیرے ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا جب رو رو کر کافی تھک گئی تو قمیض کے دامن سے چہرہ صاف کر کے سڑک پر سے گزرنے والوں کو دیکھنے لگی۔

جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی فٹ پاتھ کا فاصلہ چھوڑ کر عین اس کے سامنے سڑک پر ایک رکشا آ کر رک گیا۔ وہ کچھ سٹ پٹائی سوچا جلدی سے وہاں سے اٹھ جائے۔ کھڑی ہوئی مگر پاؤں کی تکلیف نے ایک قدم نہ چلنے دیا پھر وہیں بیٹھ گئی۔

''ایک روپیہ اور کتنے پیسے؟''

رکشا میں سے ایک شخص نکل کر بڑے غور سے اس کے میٹر کو دیکھ رہا تھا۔

''ساٹھ پیسے۔''

رکشا والے نے جواب دیا۔

''ساٹھ پیسے!''

وہ گھور کر رکشا والے کو دیکھنے لگا۔

''اپنے رکشا کو انجن لگایا ہوا ہے یا اس کے میٹر کو؟''

''جناب لکشمی چوک سے آ رہا ہوں۔''

پھر وہ جھک کر اس کا نمبر دیکھنے لگا۔ ''میں تمہاری رپٹ لکھواؤں گا میٹروں کو نجانے کیا کر دیتے ہیں کہ رکشا سے زیادہ تیز ان کی رفتار ہوتی ہے۔''

''چلو بابو! تم نے جو دینا ہے نکالو اور جھگڑا ختم کرو۔'' شاید وہ مجرم تھا تبھی گھگھیانے لگا۔

''جاؤ جاؤ تم جیسے دغا باز کو تو میں ایک پیسہ بھی نہ دوں۔ تمہاری یہی سزا ہے۔'' یہ

کہتے ہوئے بڑی لاپروائی سے وہ پلٹا۔

''یہ کیا بات ہوئی۔ میں تو کرایہ لئے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' رکشا والا بولا۔

''میں تمہیں کرایہ دیتا ہوں۔'' اس نے پھر رکشا کی طرف رخ موڑ لیا اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے رکشا والے کے گریبان کو پکڑ کر کھینچا۔ ''پہلے میرے ساتھ چل کر تھانے میں اس بات کا جواب دے کہ تو نے میٹر کو کیا کیا ہے۔ لکشمی کا چوک یہاں سے صرف تین میل ہے ایک روپیہ سے دس بارہ پیسے زیادہ بن جاتے۔''

''میرا گریبان تو چھوڑ۔ بات کرتا ہوں۔''

''تو کیا بات کرے گا تجھ سے بات میں کروں گا۔ میں! جانتے ہو میں کون ہوں؟ میں فخرو ہوں فخرو! جسے لوگ اس شہر کا سب سے بڑا غنڈہ کہتے ہیں۔''

اور اس نے رکشا والے کا گریبان چھوڑ دیا گریبان چھٹنے کی دیر تھی رکشا والے نے جلدی سے انجن سٹارٹ کیا اب اس نے کرائے کا بھی مطالبہ نہیں کیا اور پوری رفتار سے رکشا بھگا لے گیا۔ فخرو نے اسے یوں بھاگتے دیکھ کر بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ ''سور کے بچے! بے ایمانی کرتے ہیں۔''

پھر وہ بڑبڑاتے ہوئے مڑا صبا اپنی تکلیف بھولی بیٹھی بڑے مزے سے سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ وہ سفید تہمد پر سفید بے داغ کرتا پہنے تھا اور اس کے گلے میں سیاہ دھاگے والا ایک لمبا سا تعویذ جھول رہا تھا۔

''ابے تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے؟'' وہ سیدھا ان سیڑھیوں کی طرف چلا آیا جہاں صبا بیٹھی تھی اور اس کے قریب رک کر بڑے رعب سے بولا۔ ''چل اٹھ یہاں سے۔''

اس کا ڈیل ڈول ہی ایسا تھا کہ زبان سے کچھ نہ بھی کہتا تو صبا نے آپ ہی آپ ڈر جانا تھا۔ سہمتے ہوئے بغیر منہ سے کچھ بولے جلدی سے وہاں سے اٹھی پاؤں کی تکلیف یاد ہی نہیں تھی بھولے سے زمین پر رکھ دیا پھر بے اختیار کراہ اٹھی مگر اب وہاں رکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو رہا تھا۔ وہ جن کا جن سر پر کھڑا تھا اور صبا کو اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ جلدی جلدی ایک ہی پاؤں سے اچک اچک کر پرے ہٹنے لگی۔

"کیا ہوا؟" وہ وہیں کھڑا اسے اُچک اُچک کر چلتے دیکھ رہا تھا۔

صبا نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح جلدی جلدی پرے ہٹتی گئی۔ وہ اس سے بڑی خوفزدہ تھی۔ ایک تو اس لئے کہ اس نے خود اپنے منہ سے کہا تھا کہ وہ غنڈہ تھا اور دوسرے اس نے رکشا والے سے کیا سلوک کیا تھا۔

وہ لمبے لمبے دو ڈگ بھر کر صبا کے قریب آ گیا اور اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولا۔ "کیا گونگا بھی ہے؟"

صبا نے ڈرتے ڈرتے سر کو نفی میں ہلا دیا اس وقت اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی طرح بھاگ سکے مگر پاؤں کا درد لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"پھر بتاتا کیوں نہیں کہ پاؤں کو کیا ہوا ہے؟"

"کچھ چبھ گیا ہے۔" بہت دھیرے سے بولی۔

"تو جوتی پہننا تھی نا۔ دیکھتا نہیں ادھر کی سڑکیں کتنی خراب ہیں۔ حکومت کوئی دھیان ہی نہیں دے رہی اور ٹیکس دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔" پھر ذرا نرم لہجے میں بولا۔ "کتنی دور جانا ہے؟"

صبا خاموش کھڑی رہی۔ اس کی بات کا جواب کیا دیتی۔ البتہ اس کے آنسو پھر اپنی پوری روانی سے بہہ نکلے۔ ایک مصیبت سے جان چھٹی تھی تو دوسری آدبوچی تھی۔ اب اس غنڈے سے کس طرح پیچھا چھڑائے۔

"بتاتا نہیں؟ ہمدردی کے مارے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

صبا پھر بھی نہیں بولی تو وہ سر جھٹک کر واپس مڑ گیا۔ "نہیں تو نہ سہی۔"

پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ اسی طرح کھڑا رہ گیا۔ اس کے کان میں صبا کی سسکیوں کی مدھم سی آواز آئی تھی۔ چند لمحے کھڑا رہنے کے بعد پھر مڑا اور صبا کے قریب آتے ہوئے جھک کر بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ مگر کچھ نظر نہ آیا وہ تو صبا نے دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"یہ کیا تم تو لڑکیوں کی طرح رو رہے ہو!" مذاق کے انداز میں قہقہہ لگاتے

ہوئے وہ اس کے چہرے سے دونوں ہاتھ ہٹانے لگا۔ مگر پھر وہ وہیں ٹھٹک گیا اس کے ہاتھوں میں جو ہاتھ آئے تھے وہ بڑے نرم اور ملائم تھے۔ پہلے اس کی آواز سے چونکا تھا پھر فوراً خیال آیا کہ کئی مردوں کی آواز عورتوں جیسی بھی ہوتی ہے۔ اس لئے کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا اور اب یہ ہاتھ یہ بھی عورتوں کی سی نرمی اور نزاکت لئے تھے اور اس کا رونے کا انداز بھی بالکل لڑکیوں جیسا تھا۔ پھر پھر......

"سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" وہ صبا کے نزدیک ہو کر سرگوشی کے لہجہ میں بڑی نرمی سے بولا۔

"میں۔ میں۔ کوئی نہیں۔" صبا کپکپاتی آواز میں ہکلانے لگی۔ "میں تو۔ میں تو ایک یتیم لڑکا ہوں۔"

صبا کا انداز ایسا تھا کہ فخرو صاف سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھی۔ مگر تجسس انسانی فطرت ہے! وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے یہ بہروپ کیوں بھرا ہوا تھا۔

"جھوٹ نہ بولو۔" اور پھر ساتھ ہی اس نے صبا کے سر سے وہ ٹوپی اتار لی۔

"نہیں نہیں۔" مدافعتی انداز میں صبا نے جلدی سے دونوں ہاتھ سر پر بندھے ہوئے بالوں پر پھیلا لئے۔

"لڑکی ہو کر لڑکا کیوں بنی ہوئی ہو؟" فخرو نے واپس اس کے سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے پوچھا۔

صبا نے کوئی جواب نہ دیا اسی طرح سہمی سہمی کھڑی روتی رہی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

صبا پھر خاموش تھی مگر فخرو کے اس سوال نے اس کی سسکیوں میں اضافہ ضرور کر دیا تھا۔

"ادھر آؤ۔" وہ صبا کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کی جانب مڑا۔ "یہاں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔"

نجانے اب یہ غنڈہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والا تھا۔ وہ تو خوف کے

مارے تھر تھر کانپتی ہی جا رہی تھی۔

''چلو بھی۔'' مگر صبا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ''اچھا! سمجھ گیا پاؤں دکھ رہا ہے۔ چلا نہیں جاتا'' اور اس نے بغیر اس کا جواب سنے بڑی سہولت سے اسے دونوں بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

''نہیں نہیں۔ مجھے چھوڑ دو۔'' صبا ایک دم چلائی۔

''چلاؤ نہیں۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بڑی آسانی سے وہ تین چار سیڑھیاں چڑھ گیا۔ آخری پر اسے کھڑا کرتے ہوئے خود جیبوں میں کچھ ٹٹولنے لگا۔

''مجھے تم سے ڈر لگتا ہے مجھے جانے دو۔'' صبا سمجھ گئی تھی کہ وہ اس کا گھر تھا۔

''کیوں ڈر کیوں لگتا ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے تالا کھولنے لگا۔

''تم غنڈے جو ہو۔'' صبا نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

تالا کھل گیا تھا۔ دروازہ کھولتے ہوئے اس نے صبا کی بات پر بڑے زور کا قہقہہ لگایا اور اسے پھر اسی طرح بازوؤں میں اٹھا کر اندر لے گیا۔

''تو یہاں آرام سے بیٹھ جاؤ۔'' اس نے اسے ایک چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کمرے کی بجلی جلا دی۔ ''تم لڑکا کیوں بنی ہو؟'' اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''کیا کسی سے چھپتی پھر رہی ہو؟ مجھے اس کا نام پتہ بتاؤ۔''

''میں کسی سے چھپ نہیں رہی مجھے جانے دو۔''

صبا کے چہرے کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا اور وہ سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ ملک الموت تھا اور ابھی ابھی اس نے اس کی جان نکال لینا تھی۔

اس نے صبا کی یہ حالت دیکھی تو بڑے تسلی بھرے لہجے میں بولا۔

''بے شک میں ایک غنڈہ ہوں لیکن اتنا بے غیرت نہیں کہ کسی کو گھر میں پناہ دینے کے بعد نقصان پہنچاؤں گا۔ تو مجھے بتا تو نے یہ روپ کس لئے بدلا ہے؟ کیا کسی سے تمہیں خطرہ ہے مجھے بتاؤ تو سہی میں اس کا خون پی جاؤں گا۔''

''کس کس کا خون پیو گے بھائی!'' صبا نے بڑے کرب سے اس ہمدردی کرنے والے کی جانب دیکھا۔

''بھائی! تو نے مجھے بھائی کہا ہے۔'' وہ بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔ ''تو سن! تو آج سے میری بہن ہے۔ دس بیس نہیں سینکڑوں بھی ہوئے تو میں ایک ایک کو مزہ چکھا دوں گا کوئی ہوتا کون ہے تیری طرف ٹیڑھی آنکھ کر کے دیکھنے والا۔''

اس کے انداز میں ایسا جوش ایسا خلوص تھا کہ صبا آپ ہی آپ اپنے اوپر ہونے والے سب ظلم و ستم اس غنڈے کو بتانے پر مجبور ہو گئی۔ وہ بڑے غور سے اس کا ایک ایک حرف سن رہا تھا۔ ''بہن! یہ تو نے اچھا نہیں کیا جو گھر سے نکل آئی زمانہ بڑا خراب ہے۔''

''بھیا! بتاؤ پھر میں اور کیا کرتی۔ دکھوں کی کوئی حد بھی ہوتی ہے۔'' وہ بڑے دکھی لہجے میں بولی۔ ''میں ٹھہری جاہل اور بیوقوف سی لڑکی کسی اور پر بس نہ چلا تو ماں سے ہی انتقام لینے کے جوش میں کچھ اور سوچ ہی نہ سکی۔''

''اچھا پھر؟ پھر کیا ہوا؟''

صبا آگے سنانے لگی اور وہ ہمہ تن گوش ہو بیٹھا۔

''وہ کمبخت ہاشمی! اس کے تو پیٹ میں ضرور چاقو ماروں گا۔''

اور ساتھ ہی فخرو نے اپنے تہمد میں سے ایک بڑا سا چاقو نکال کر ہاتھ میں گھمایا۔

''کیا اس کا پورا نام تو جانتی ہے؟ اور اس سٹوڈیو کا کیا نام ہے؟''

''نہیں مجھے ہاشمی کا پورا نام نہیں معلوم۔ سب ہی اسے بس ہاشمی صاحب ہی کہتے تھے۔'' وہ بہت سہم کر اس چمکتی ہوئی دھار والے چاقو کو دیکھ رہی تھی اور پھر وہ جلدی جلدی اپنی کہانی کا بقیہ حصہ سنانے لگی تاکہ بدلے کی طرف سے اس کا دھیان ہٹ جائے۔

''اوہ!'' فخرو پھر بے قرار ہو کر درمیان میں بول پڑا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ''تو اس بڈھے پاپی نے چار دن تجھے باندھے رکھا تو اس ڈیرے کا راستہ تو جانتی ہو گی؟''

''بالکل نہیں رات کو پہنچی تھی اور پھر رات ہی کو وہاں سے نکل آئی۔ اندھیرے کی

وجہ سے راستے کا پتہ ہی نہیں چل سکا۔"

"پھر؟" وہ پوری دلچسپی سے سن رہا تھا۔ صبا پھر بولنے لگی۔

"شاہ جی!" مزار اور شاہ جی کا ذکر آیا تو فخرو ایک دم بڑی عقیدت سے کہہ اٹھا۔

"پھران سے تعویذ کرایا؟" کیا نتیجہ نکلا؟ میرے پیر و مرشد بھی تو وہی ہیں۔"

بے اختیار صبا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس کے گلے میں جھولتے ہوئے کالے دھاگے والے تعویذ کو دیکھتے ہوئے اپنا قصہ آگے بیان کرنے لگی۔

"کیا؟" فخرو کو جیسے بجلی کا تار چھو گیا تھا ایک جھٹکے سے بولا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میرا خیال ہے تو کسی اور کا ذکر کر رہی ہے لیکن لیکن......" وہ بڑبڑانے لگا۔" وہاں بھی آج ہی عرس ہے پھر......"

کچھ عجیب بے چینی کے عالم میں وہ صبا کو دیکھنے لگا۔ سارا کچھ جلدی جلدی بتانے کے بعد وہ آخر میں بولی۔" اور یوں وہاں سے میں نے چھٹکارا حاصل کیا پھر میرے پاؤں میں کچھ چبھ گیا تو میں یہاں سیڑھیوں میں آبیٹھی۔"

"شاہ جی اور شاہ جی کا لڑکا فرید۔" فخرو سوچوں میں کھویا ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ پھر ایک دم اس پر جنون سوار ہو گیا۔ اس نے گلے سے کھینچ کر وہ تعویذ اتارا اور دھاگا توڑنے کے بعد وہ چاندی کا چھوٹا سا کیس کھولا۔ کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ اس میں سے نکل کر فرش پر گر پڑا۔ بڑے غصہ سے اسے اٹھا کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا پھر بھی غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو پاؤں سے مسلنے لگا۔

"ایسا فریب! ایسا دھوکا! اور کیسے اتنے سارے لوگوں کو اس نے الو بنا رکھا ہے۔ اسے تو ضرور پکڑواؤں گا۔"

"نہ نہ ایسا نہ کرنا میں اس کی ماں سے وعدہ کر چکی ہوں۔"

"اس معاملے میں تُو نہ بول۔ اس کا کوئی انتظام ہونا ہی چاہیے۔"

"لیکن اس کی بوڑھی ماں وہ تو سچ مچ مر جائے گی۔"

"ایک اس بڑھیا کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ باقی اور کئی جانیں تو بچ

جائیں گی اور پھر اتنے لوگوں کا پیسہ جو ضائع ہو رہا ہے۔ نجانے بیچارے کہاں کہاں سے لاکر اس کے ان جھوٹے تعویذوں کا دام چکاتے ہیں۔ اور۔ اور پھر۔" اور اب فخرو کی آنکھوں میں وطن کی محبت کی چمک تھی۔ "سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ افیم اور چرس وغیرہ کا ناجائز کاروبار کرتا ہے۔ اپنے ملک کے ساتھ دغا بازی۔ اس جرم کی سزا تو اسے ملنا ہی چاہیے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں ابھی جاتا ہوں۔"

سیڑھیوں کی جانب جاتے جاتے اسے کچھ خیال آیا وہ جلدی سے پلٹ پڑا۔

"میں بھی کتنا پاگل ہوں۔ دکھا تو ذرا اپنا پاؤں۔"

وہ صبا کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے اس کا پاؤں اٹھا کر نیچے سے دیکھنے لگا انچ انچ بھر تو مٹی کیچڑ لگا تھا۔ اسے نظر کیا آتا! جلدی سے جا کر صابن اور پانی کا لوٹا لے آیا صبا نہ نہ کرتی رہی مگر اس نے ایک نہ سنی اور خود اپنے ہاتھوں سے اس کا پاؤں دھونے لگا۔ خوب اچھی طرح کیچڑ وغیرہ صاف کر کے دیکھا۔

"اوئے ہوئے! یہ تو سوج کر کپا ہو رہا ہے نہ جانے کیا چبھ گیا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے۔" اس نے اپنے ہاتھوں سے صبا کو وہاں لٹا کر چادر اوڑھا دی۔ "ڈرنا نہیں۔ یہیں قریب ہی ایک ڈاکٹر رہتا ہے میں ابھی پانچ منٹ میں اسے لے کر آتا ہوں۔" اور وہ جلدی جلدی ڈیوڑھی کی طرف چلا گیا۔ نجانے اب کیا سوجھی تھی۔ پھر واپس آ رہا تھا۔ "یہ ٹوپی اتار کر اب بال ٹھیک کر لو ورنہ ڈاکٹر کیا سوچے گا۔" اسے یہ ہدایت کر کے پھر چلا گیا۔

صبا خاموش لیٹی چھت کو گھور رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا معلوم اور کہاں کہاں کا دانہ پانی اس کی قسمت میں لکھا تھا۔ ہو سکتا تھا اگلے دن ہی اسے وہاں سے بھی بھاگنا پڑتا ابھی تک تو جس جس پر اعتبار کیا تھا دھوکا ہی کھایا تھا اور یہ فخرو۔ یہ تو اپنے منہ سے آپ ہی کہہ رہا تھا کہ وہ اس شہر کا مشہور غنڈہ ہے۔ اس سے تو خطرہ ہی خطرہ تھا موقع اچھا تھا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اس وقت وہ یہاں سے جا سکتی تھی اس نے پاؤں زمین پر رکھے اور کھڑی ہو گئی مگر جب اس پاؤں پر ذرا سا بوجھ پڑا تو بے اختیار اس کی چیخ نکل گئی۔

جب تک چوٹ گرم تھی وہ چند ایک قدم مشکل سے ہی سہی اٹھا سکتی تھی مگر اب۔

اب تو پاؤں نیچے لٹکانے سے بھی درد ہوتا تھا بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ درد سے کراہتے ہوئے وہ پھر لیٹ گئی۔

25

نجانے اس کے ماں باپ کون تھے؟ وہ تو جیسے فٹ پاتھ ہی کی پیداوار تھا۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو یونہی اپنے آپ کو بے گھر اور لاوارث ہی پایا۔ کبھی کسی کے پاس برتن مانجھنے اور سودا سلف لانے پر ملازم ہو جاتا اور کبھی کسی کے پاس۔ پیٹ کا جہنم بھی تو کسی طرح پُر کرنا تھا۔

زبان کا چسکا بری بلا ہے بازار میں اتنی چیزیں بکتی تھیں کسی نہ کسی کو دیکھ کر دل للچا ہی جاتا۔ بچہ تو تھا ہی صبر نہ کر سکتا۔ سودا لانے والے پیسوں میں سے چار چھ کی ہیرا پھیری کر لیتا تو کسی کو کیا پتہ نہ چلتا۔ پل بھر کے لئے زبان کا چسکا تو پورا ہو ہی جاتا تھا نا اور پھر کبھی نہ کبھی راز کھل ہی جاتا۔ گھر کا کوئی بچہ ہی اسے منہ چلاتے دیکھ لیتا۔ یا کبھی رخسار پر داغ دھبہ لگا رہ جاتا تو دو چار تھپڑوں کے بعد کان سے پکڑ کر نکال دیا جاتا۔

اسی طرح کتنے ہی گھروں کی خاک چھانی۔ پھر کسی نے چائے کے ایک سٹال پر ملازم رکھوا دیا۔ ایک دن ایک گاہک نے پیسے دیئے۔ مالک کی نظر بچا کر اس نے جیب میں رکھ لئے۔ ساتھ والی گلی میں کوئی چھوٹا سا دفتر تھا۔ اکثر وہاں چائے دینے جایا کرتا تھا۔ اس دفتر کے سامنے ایک دہی بھلے والا بیٹھتا تھا اس کے دہی بھلے بہت مشہور تھے۔ دور دور سے لوگ کھانے آیا کرتے تھے۔ وہاں سے گزرتے ہوئے وہ جب بھی لوگوں کو کھاتے دیکھتا تو اس کے منہ میں پانی بھر بھر آتا۔ مہینہ ختم ہونے کا انتظار کون کرتا۔ اور پھر کئی ایسے ہوتے تھے جو مہینے کی تنخواہ اپنے پاس ضمانت کے طور پر رکھا کرتے تھے۔ اف! اتنا طویل انتظار......! اس چھوٹی سی عمر میں اتنا بڑا حوصلہ کہاں سے لاتا؟ اور وہ پیسے اس نے صرف

دہی بھلے کھانے کے لئے ہی چھپائے تھے۔

آہا! کیسے مزیدار تھے وہ دہی بھلے خوب مصالحہ دار چٹ پٹے سے۔ ایک بار منہ سے جو لگے تو روز ہی کھانے کو اس کا دل مچل اٹھتا اور دل کی اس خواہش کو وہ زیادہ دیر ٹال نہ سکتا۔ دن میں کئی کئی بار دفتر جانا پڑتا۔ اور ہر بار ہی مصالحہ دار دہی میں تر تراتے ہوئے کمبخت بھلے دکھائی دے جاتے۔ پھر تو ہر دوسرے تیسرے کسی نہ کسی گاہک کے دیئے ہوئے پیسوں پر ہاتھ صاف ہونے لگا آخر کب تک۔ یوم حشر وہاں بھی آ گیا۔ چپکے سے پیسے جیب میں ڈال رہا تھا کہ مالک نے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا بے آبرو کر کے وہاں سے بھی نکال دیا گیا۔

اسی طرح بیسیوں جگہ نوکری کی مگر کسی ایک پر بھی ٹک نہ سکا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر کو پہنچا تو یہ گھروں، چائے خانوں اور ہوٹلوں کی نوکری سے آپ ہی آپ دل اکتا سا گیا۔ پھر ایک لوہے کا سامان بنانے والے کارخانے میں ملازمت کر لی۔ دن وہاں گزارتا تو شام یونہی اپنے جیسے آوارہ پھرنے والے لڑکوں کے ساتھ کبھی کسی دکان کے تھڑے پر اور کبھی کسی فٹ پاتھ پر گپیں ہانک کر راہ جاتی عورتوں لڑکیوں پر آوازے کس کر۔ کبھی سارے مل کر کسی خوانچہ والے کو گھیر لیتے۔ ایک دو اسے باتوں میں لگائے رکھتے باقی کچھ نظر بچا کر کچھ سامنے ہی اس کی چیزیں اٹھا لے جاتے۔ خوانچے والا چیختا اور دہائی مچاتا رہ جاتا اور وہ سب اسے لوٹ لٹا کر بھاگ جاتے۔

اپنے انہیں ساتھیوں میں رہ کر اس نے ہر وقت ایک چاقو اپنے پاس رکھنا سیکھا تھا۔ وہ بھی تو ذرا سی بات ہوتی جھٹ چاقو نکال لیتے تھے۔ پھر وہ کیسے نہتا رہ سکتا تھا۔ تنخواہ ملی تو سب سے پہلا کام یہی کیا ایک سستا سا چاقو خرید لیا۔ اب وہ بھی اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح ہر دوسرے تیسرے خواہ مخواہ ہی بات بے بات کسی نہ کسی سے جھگڑ پڑتا۔ جھگڑے کا اصل مقصد تو یہی ہوتا تھا فوراً چاقو نکلتا اور ہوا میں لہرانے لگ جاتا۔

یونہی وقت گزرتا رہا۔ بزدل تو وہ بالکل چھوٹی عمر میں بھی نہیں تھا۔ دن بدن نڈر سے نڈر ہوتا گیا۔ نہ کسی کا رعب نہ دبدبہ نہ ٹوک۔ عمر کے ساتھ ڈیل ڈول بھی خوب بڑھا

اور جسامت بڑھتی گئی تو ساتھ ساتھ اسی لحاظ سے چاقو بھی بڑا ہوتا گیا اور پھر ایک دن ایسا آیا کہ وہ شہر بھر میں سب سے بڑا غنڈہ کہلانے لگا۔ اس کے سب ساتھی' جن میں سے کافی اس سے عمر میں بڑے بھی تھے، وہ بھی اس سے دب کر رہنے لگے۔ وہ طاقتور اتنا تھا کہ ایک ہاتھ سے کسی کی گردن دبوچ لیتا تو اگلا چھڑا نہ سکتا۔ اس کی طاقت نے ہی اس کا درجہ سب میں بلند کر دیا تھا۔

طاقتور ہونے کی وجہ سے کارخانے کا بھاری سے بھاری کام اس کے ذمہ ڈال دیا جاتا اسی لئے تنخواہ بھی اچھی ملنے لگی تھی۔ پہلے وہیں کارخانے میں ہی ایک کوٹھری میں پڑ رہتا تھا مگر اب کچھ عرصہ سے اس نے دو کمروں اور ایک چھوٹے سے صحن والا مکان بھی کرائے پر لے لیا تھا۔ کھانا پکانا تھوڑا بہت آتا تو تھا لیکن مرد ہو کر یہ عورتوں والے والا کام کرنا اسے بالکل پسند نہ تھا۔ اس لئے بازار سے ہی کھا لیا کرتا تھا۔

پہلے کی نسبت رہن سہن ذرا اچھا ہو گیا تھا مگر معمول میں فرق نہیں آیا تھا۔ کارخانے سے آتے ہی نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنتا اور تہمد میں ہمیشہ کی طرح چاقو اڑس کر اکڑ اکڑ کر چلتا ہوا اپنے ساتھیوں میں پہنچ جاتا پھر وہی گپ بازی' جوا بازی' فرضی لڑکیاں اور ان کے وہ فرضی قصے، لڑائیاں جھگڑے۔ چمکتی ہوئی دھار والے چاقو' پولیس اور ضمانتیں یہ تو اس کی زندگی تھی!

اور پھر اچانک ہی اس کی زندگی میں ایک تبدیلی سی آ گئی جس کا خود اسے بھی احساس نہیں ہوا۔ اس نے کبھی کارخانے سے چھٹی نہیں کی تھی مگر دس بارہ دن ہو گئے تھے وہ مسلسل چھٹیاں لے رہا تھا۔

سوائے رات کے چند گھنٹوں کے' اس کا باقی وقت گھر سے باہر ہی گزرا کرتا تھا۔ مگر اب وہ کچھ دنوں سے بہت کم باہر گیا تھا اور جو گیا تھا وہ بھی صرف سودا وغیرہ لانے کے لئے۔ وہ اپنی محفلیں' اپنے ساتھی اپنے شغل سب کچھ بھول چکا تھا۔

اور اس کی تبدیلی کا باعث بنا تھا صبا کا وجود!

اس کا پاؤں ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ ڈاکٹر روزانہ اس کی پٹی کرنے کے لئے

آ رہا تھا۔ پاؤں کی تکلیف کے ساتھ ساتھ اسے حرارت بھی ہونے لگی تھی۔ فخرو اس کے لئے ناشتہ تیار کرتا' کھانا پکاتا' گھر کی صفائی وغیرہ کرتا اور باقی جو وقت بچتا اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے میں گزار دیتا۔ وہ' جسے ان سب کاموں سے نفرت تھی اب بڑے شوق سے دلچسپی سے کرتا تھا۔ صبا چارپائی پر لیٹی اسے دیکھتی رہتی اور وہ مصروف رہتا۔ اور یوں اسے اپنی یہ مصروفیت بڑی بھلی معلوم ہونے لگی تھی۔

اب تو گھر سے قدم نکالنے کو اس کا جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ سودا وغیرہ لانے کے لئے بازار جاتا تو جلد سے جلد گھر واپس آنے کی کوشش کرتا۔ اس کے لئے تو صبا کی ہستی اس گھر میں گویا دنیا بھر کی رونقیں سمیٹ لائی تھی۔

وہ جس نے آنکھ ہی فٹ پاتھ پر کھولی تھی وہ کیا جانے گھر کیا ہوتا ہے اور والدین اور بہن بھائی کس نعمت کا نام ہیں۔ اور اب اچانک ہی اسے یہ نعمت مل گئی تھی۔ اس کا مزہ ہی نرالا تھا۔ زندگی نے ایسا انوکھا سا رخ بدلا تھا کہ فخرو خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اور صبا کی تیمارداری میں وہ اپنا تن من ہی بھلا بیٹھا تھا۔

اور صبا' جس نے جس جس پر بھی اعتبار کیا تھا دھوکا ہی کھایا تھا اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی رہتی تھی اور سوچتی رہتی۔ پہلے ہر ایک نے اس سے اپنا مطلب نکالنا چاہا تھا اور اب کیا فخرو کے خلوص کا اسے اعتبار کر لینا چاہیے تھا۔ ہو سکتا تھا اس کا یہ خلوص صرف ظاہر تھا اور باطن میں کوئی اور ہی جذبہ کارفرما تھا وہ اتنے دنوں میں کوئی فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ اگر کوئی فیصلہ بھی کر لیتی تو فی الحال اس پر عمل نہیں کر سکتی تھی ابھی اس کا پاؤں چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوا تھا بس لیٹے لیٹے صرف سوچ ہی سکتی تھی۔

اور آخر فیصلہ کا دن بھی آ پہنچا۔ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے کی اجازت دے دی تھی اور تین چار دن سے بخار بھی نہیں ہوا تھا۔ صبح اس نے کمرے میں اِدھر اُدھر کئی چکر لگائے تھے پاؤں بالکل ٹھیک تھا۔ درد یا سوجن نہیں تھی۔

بہت سوچ بچار کے بعد اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ فخرو کے گھر ہرگز نہیں رہے گی۔ اب تک ایسی بات تو کوئی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے تو اس کی تیمارداری میں

رات دن ایک کر رکھا تھا لیکن پھر بھی وہ یہی سوچ پائی تھی۔ کیونکہ اب تک اس کا تجربہ اسے یہی سکھاتا تھا۔ وہ جو بظاہر شریف تھے‘ نیک تھے‘ فوزیہ اور اس کا خاوند‘ ہاشمی صاحب‘ بابا جی اور شاہ جی جیسی متبرک شخصیت‘ جب وہ سب خودغرض اور مطلب پرست ثابت ہوئے تھے تو پھر فخرو تو تھا ہی غنڈہ! اس پر تو کسی صورت بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اس نے تو کبھی اللہ کا نام نہیں لیا تھا۔ نہ نماز روزے کا پابند تھا اور پھر ہر وقت ایک لمبا سا چاقو بھی اپنے پاس رکھتا تھا کیا علم اس کے بھی دل میں کھوٹ ہو۔ بالکل ممکن تھا!

آدھی رات گزر چکی تھی وہ انہیں سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی یوں لیٹ کر کروٹیں بدلنے اور سوچتے رہنے سے تو بہتر تھا کہ جو کچھ کرنا تھا کر گزرتی......!

یہ خیال آتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ فخرو دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا اس کے چھوٹے چھوٹے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اندھیرے ہی اندھیرے میں اس نے ٹٹول ٹٹول کر جوتی پہنی۔

یہ وہی جوتی تھی جو اس کے یہاں آنے کے تیسرے چوتھے دن فخرو اس کے لئے لے کر آیا تھا۔ بہت خوبصورت اونچی ایڑی والی تھی۔ نجانے کتنے کی آئی تھی صبا قیمت پوچھتی ہی رہی تھی مگر اس نے نہیں بتائی تھی۔

”تجھے قیمت سے کیا مطلب تو پہن۔ ٹھیک ہو لے پھر اور بھی لا کر دوں گا۔“ اس نے کتنی اپنائیت اور محبت سے کہا تھا۔ لیکن۔ لیکن۔

اور صبا کا ذہن پھر بہک گیا۔ کیا معلوم اس کے دل میں کیا تھا۔ اب وہ ہر ایک پر اعتبار کر کے مزید دھوکے نہیں کھائے گی۔ اس نے اٹھ کر دوپٹہ لیا۔ پہنے ہوئے سوٹ جیسا ہلکے آسمانی رنگ کا کتنا خوبصورت تھا۔ بڑے ہی چاؤ سے فخرو اس کے لئے یہ سب کچھ خرید کر لایا تھا اور پھر جب اس نے پہنا تھا تو کتنا خوش ہو ہو کر اسے دیکھتا تھا...... نجانے کیوں......؟

”نہیں نہیں!“ وہ جلدی سے دبے دبے قدم اٹھاتے ہوئے دروازے تک جا

پہنچی۔ اس نے بجلی بھی نہیں جلائی مبادا فخرو جاگ نہ پڑے۔ پھر بہت احتیاط سے چٹخنی گرا کر آہستہ سے دروازہ کھولا۔

اندھیرے میں وہ اندازہ نہ لگا سکی غلطی سے شاید پہلے ہی کھلا چھوڑ دیا تھا۔ دونوں کواڑ پچھلی دیوار سے ٹکرا گئے۔ صبا کا دل دھک کر کے بج اٹھا...... وہ ایک دم سانس روکتے ہوئے خود بھی وہیں رک گئی۔

”کیا بات ہے کون ہے؟“ اندر سے فخرو کی نیند میں ڈوبی آواز آئی۔

وہ جلدی سے وہیں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑی ہو گئی۔ ساتھ ہی بجلی جلی۔ مدھم سی روشنی اس کمرے میں بھی پھیل گئی جہاں وہ خود کھڑی تھی۔ فخرو کے اس کمرے میں آنے سے پہلے اسے جلدی سے واپس بستر پر لیٹ جانا چاہیے تھا۔

یہ خیال آتے ہی وہ اپنی چارپائی کی طرف لپکی لیکن ابھی دو قدم ہی اٹھائے تھے کہ اس کمرے میں بھی پوری روشنی پھیل گئی۔ فخرو بجلی جلائے کھڑا حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صبا وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”کیا ہوا؟“ اس نے بڑی پریشانی سے صبا کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھنے کے بعد کھلے دروازے کی جانب دیکھا۔ ”یہ کس نے کھولا ہے؟“

پھر بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر اس نے ڈیوڑھی والا دروازہ دیکھا۔ وہ بند تھا۔ یعنی کہ کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے وہ واپس صبا کی طرف مڑا۔ اس کے پاؤں میں جوتی تھی اور دوپٹہ اس نے ایسے لپیٹ رکھا تھا جیسے کہیں جا رہی تھی۔ فخرو بیوقوف نہیں تھا کہ سمجھ نہ سکتا۔ صبا کا تو یوں مجرمانہ انداز میں جھکا ہوا سر ہی جرم کا اعتراف کر رہا تھا۔

”اوہ! تو تُو جا رہی ہے۔“ وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ”شاید تجھے مجھ پر اعتبار نہیں۔ ٹھیک بھی تو ہے۔ ایک غنڈے کا اعتبار کر لینا کہاں کی عقلمندی ہے!“ پھر وہ لٹے لٹے سے انداز میں وہیں دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ ”میں نے سوچا تھا مجھے سچ مچ بہن مل گئی ہے۔ رات دن محنت کر کے خوب ڈھیر ڈھیر سارا کماؤں گا۔ اپنی بہن کے لئے

بڑا شاندار جہیز بناؤں گا۔ پھر کسی بڑے اچھے اور نیک آدمی کے ساتھ تیری شادی کروں گا۔ تیرے بچے ہوں گے۔ وہ مجھے ماموں کہیں گے۔ میرے گھر میں رونق ہی رونق ہو گی تو...... کیا یہ سب کچھ میں نے غلط ہی سوچا تھا۔ میں یہ بھول ہی گیا تھا کہ میں ایک غنڈہ ہوں۔ میں کسی بہن کا بھائی نہیں بن سکتا میں صرف غنڈہ ہوں۔''

اور صبا نے دیکھا اتنے ڈیل ڈول والا شخص جو بڑا دلیر تھا' اس وقت اس کی آنکھوں سے کسی معصوم بچے کی طرح آنسو بہہ رہے تھے۔ جو یقیناً اس کے خلوص کے سچے شاہد تھے۔ وہ بے قرار ہو کر آگے بڑھی اپنے نئے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔

''بھیا! مجھے معاف کر دے۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی ہمیشہ تمہارے پاس رہوں گی۔ غنڈہ چھوڑ زمانہ تمہیں کچھ بھی کہے لیکن تم میرے بھائی ہو۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنا بھائی ہی سمجھوں گی بالکل سگا بھائی!''

''سچ؟'' ایک دم فخرو کے چہرے پر مسرت بھری سرخی پھیل گئی۔

''ہاں بالکل سچ!'' اور وہ دروازہ جو اس نے خود ہی کھولا تھا آگے بڑھ کر آپ ہی بند کر کے واپس اپنے بستر پر آ بیٹھی۔

''تو نے مجھ پر اتنا بڑا بھروسہ کیا ہے لے پھر میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ آج کے بعد تو میرے پاس چاقو نہیں دیکھے گی۔ اب میں شریفوں جیسی زندگی گزاروں گا ایک بہن کا بھائی بن کر!'' اس کے چہرے سے ہی اس کے عزم کی پختگی عیاں تھی۔

''خدا تمہارے ارادے پورے کرے میرے بھائی!''

صبا نے صدقِ دل سے اس کے لئے دعا کی۔

26

''آج تو بھیا تم نے بڑی ہی دیر کر دی۔''

''میں نے اوور ٹائم لگانا شروع کر دیا ہے۔'' چارپائی پر بیٹھتے ہوئے فخرو نے تھکا تھکا سا سانس لیا۔

''کیوں اوور ٹائم کی کیا ضرورت تھی بھلا ہمارے گزارے کے لئے اتنا ہی بہت ہے۔''

''یہ تو نہیں سمجھ سکتی صبا!'' وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

''صرف کھانا اور پہننا ہی ضروری نہیں ہے۔ تیرے بھائی کو دوسرے بھی تو فرض ادا کرنا ہیں۔'' وہ وہاں سے اٹھ کر اس کے سامنے چولھے کے پاس جا بیٹھا۔

''یہیں کھانا کھاؤ گے؟''

''ہاں اب کہاں سینی میں رکھ کر ادھر لاتی پھرو گی یہیں کھا لیتے ہیں۔''

اس نے خود ہی چھوٹی تپائی درمیان میں کھینچ لی۔ صبا نے چولھا جلا کر اوپر دیگچی چڑھا دی۔

''سارا دن اکیلے رہ کر اداس تو نہیں ہو جاتیں۔''

''نہیں اداس کیوں ہوں گی گھر کے کاموں میں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔'' وہ سالن گرم کر کے رکابیوں میں نکالنے لگی۔

''ارے واہ! یہ اتنا خوبصورت گلدستہ کہاں سے آیا؟'' سامنے کمرے میں میز پر اچانک فخرو کی نگاہ جا پڑی تو وہیں ٹکی کی ٹکی رہ گئی۔

''یہ میں نے بنایا ہے۔'' صبا بڑے فخر سے بولی۔

''تو نے!'' فخرو نے حیرت سے اس کی جانب دیکھا۔ ''پھول کہاں سے لئے تھے؟''

''یہ ساتھ والوں کے صحن میں سے۔ ہائے بھیا! ہم بھی اپنے صحن میں ایسے ہی پھولوں والے گملے رکھیں گے...... دیکھو تو ان کا صحن کتنا خوبصورت لگتا ہے۔''

''ان سے مانگے تھے تو نے؟''

''نہیں تو۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا میں دیوار پھلانگ کر چپکے سے جا کر اتار لائی ہائے! کتنے پیارے ہیں۔''

''اوہ! یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔''

''کیوں؟''

''ان سے پوچھے بنا ہی اتار لئے یہ تو پھر چوری ہوئی نا۔''

''لو پھولوں کی بھی کوئی چوری ہوتی ہے۔''

''جو چیز کسی کے گھر سے یوں چپکے سے لی جائے خواہ کوئی روڑا پتھر ہی کیوں نہ ہو، چوری ہی سمجھی جائے گی۔''

''نہیں نہیں۔'' صبا جلدی سے بولی۔ ''میرا مقصد چوری کرنا نہیں تھا مجھے تو بس اچھے لگے میں اتار لائی۔''

اسے ایک دم وہ کہانی یاد آ گئی جو سہیل اپنی کتاب سے پڑھ کر سنایا کرتا تھا کہ کیسے ایک شخص نے چوری کی تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے چوری کرنا اتنی بری چیز ہے!

''میں نے چوری نہیں کی۔''

''ان سے پوچھ لینا تھا نا۔''

''کس سے؟ وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔''

''آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا وہ بھی کیا سوچیں گے کہ یہاں کون چور اچکے بستے ہیں۔ میری ہوا پہلے ہی خراب ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اب عزت سے زندگی گزرے۔''

فخرو نے بڑے پیار سے اسے سمجھایا۔ وہ سر جھکا کر خاموش ہو بیٹھی اور دل ہی دل میں اپنی اس حرکت پر پشیمان سی ہونے لگی۔

''کیا بات ہے تم کھانا نہیں کھا رہیں؟'' فخرو نے اسے یوں چپ چپ دیکھا تو پریشان ہوتے ہوئے بولا۔

''بس پیٹ بھر گیا۔ اور بھوک نہیں ہے۔'' اور وہ گلاس پکڑ کر گھڑے میں سے پانی انڈیلنے لگی۔

''تم نے کچھ بھی نہیں کھایا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں......''

پانی پی کر وہ اٹھی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ فخرو بڑی حیرت سے اسے

جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ وہ بھوکی ہی اُٹھ گئی تھی۔ فخرو کا بھی اب کچھ اور کھانے کو دل نہ چاہا۔ سب کچھ اسی طرح وہاں پڑا رہنے دیا اور خود بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ وہ گھٹنوں میں چہرہ دیئے بیٹھی تھی فخرو اس کے پاس جا بیٹھا۔

''کیا ہوا...... کچھ بتا بھی تو......؟''

''کچھ نہیں بس ایسے ہی پریشانی سی ہے۔''

''کاہے کی؟''

''یوں چپکے سے ان کے گھر جا کر مجھے ان کے پھول نہیں توڑنا چاہییں تھے۔''

''پھر اب کیا ہو سکتا ہے جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا یوں پریشان ہونے سے فائدہ؟''

فخرو اس کی پریشانی ہٹانے کے لئے اسے دلاسا دینے لگا۔ ''کل کوئی ان میں سے نظر آ گیا تو معافی مانگ لینا۔''

بات تو اس نے ٹھیک کہی تھی۔ صبا کے بھی جی کو لگی لیکن بوجھ سا پھر بھی رہ گیا اور وہ جب تک معافی نہ مانگ لیتی کیسے اترتا! وہ لوگ کیا سوچتے ہوں گے...... یقیناً انہیں کوئی چور ہی سمجھتے ہوں گے۔ نجانے اس وقت اس کی عقل پر کیوں پتھر پڑ گئے تھے جو کچھ بھی سوچے سمجھے بنا یوں کسی غیر کے گھر چلی گئی۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ سو گئی...... صبح اٹھی تو ابھی تک ذہن میں وہی خیال موجود تھا...... نماز سے فارغ ہو کر سب سے پہلا کام یہی کیا کہ جا کر اس صحن میں جھانکا تاکہ کوئی دکھائی دے تو معافی مانگ کر جلد از جلد دل کا بوجھ ہلکا کرے۔ مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ اتوار کا دن تھا فخرو کو چھٹی تھی چنانچہ اس کے لئے روٹی آج نہیں پکانا تھی۔ چولھے پر چائے کا پانی کھولنے کے لئے رکھ دیا۔ جب تک پانی کھولتا وہ کئی چکر باہر کے لگا آئی۔ نجانے کیسے لوگ تھے جو اندر ہی گھسے ہوئے تھے۔ کوئی ایک بھی تو دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اب اس گھر میں رہنے والوں پر غصہ آنے لگا۔

پانی بھی کھول گیا تھا۔ وہ اسی طرح انہیں کوستی' بڑبڑاتی آ کر چائے بنانے لگی۔ ان کا یہی دستور تھا۔ چائے پیتے جاتے اور باتیں کرتے جاتے فخرو اسے اپنے کارخانے

کے مزدوروں کے اور دوسرے ساتھیوں اور ملنے جلنے والوں کے متعلق بڑے ہنسنے ہنسانے والے لطیفے اور قصے کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ وہ سنتی رہتی اور ہنستی رہتی اور کبھی بات میں سے بات نکل آتی تو بھی اپنی دادی یا پھپھو کا بیان کردہ قصہ کہانی سنانے لگ جاتی۔ یونہی ہنستے باتیں کرتے ان کا ناشتہ ہو جاتا مگر آج کچھ بدمزگی ہی رہی۔

فخرو نے دو چار باتیں سنائیں مگر وہ نہ دلجمعی سے سن سکی نہ کھلے دل سے ہنس سکی......اس لئے جلدی ہی دونوں اٹھ گئے۔

اتوار کو دوپہر کے کھانے کا کوئی خاص پروگرام بنا کرتا تھا جو کچھ پکنا ہوتا فخرو ناشتہ کر کے فوراً لینے چلا جاتا...... آج صبا نے اس میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی تو وہ خود ہی رومال کندھے پر ڈال چلتا بنا۔

برتن دھوتے دھوتے اسے پھر کچھ خیال آیا۔ پھولوں کا گلدستہ' جواب کافی مرجھا چکا تھا۔ گلاس میں سے نکالا اور صحن کی طرف چل دی۔ دیوار پھلانگنے کے لئے کل اس نے وہاں ایک کرسی رکھی تھی۔ وہ ابھی تک وہیں پڑی ہوئی تھی۔

اس پر چڑھ کر گلدستہ ادھر پھینکنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کی نگاہ برآمدے میں جا پڑی۔ ایک دم ٹھٹکتے ہوئے اس نے جلدی سے ہاتھ نیچے کھینچ لیا۔

وہاں آرام کرسی پر ادھر پشت کئے کوئی نیم دراز تھا۔ اور پاؤں سامنے پڑی ایک میز پر پھیلائے ہوئے تھے۔ ایک ہاتھ میں کھلی کتاب پڑی ہوئی تھی جو شاید پڑھ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ میں اپنی پہنی قمیض کا کالر مروڑے جا رہا تھا۔

''عجیب شخص ہے سہیل بھائی سے قمیض کے کالر پر کوئی ذرا سی بھی سلوٹ ہوتی تھی تو وہ نہیں پہنتے تھے اور ایک یہ ہے جو اچھے بھلے کالر کو خود ہی مروڑ مروڑ کر خراب کر رہا ہے خیر مجھے کیا!''

کندھے جھٹک کر وہ اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لئے کوئی مناسب طریقہ سوچنے لگی جب کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح اسے مخاطب کرے تو بے معنی سی آواز نکالی۔

''شی! شی!!''

وہ اس طرح کتاب پڑھنے اور کالر مروڑنے میں مگن رہا۔

سہیل بھائی ایسی آواز نکالا کرتے تھے تو وہ فوراً متوجہ ہو جایا کرتی تھی ''یہ کہیں بہرہ ہی نہ ہو۔''

یہ خیال آتے ہی بے ساختہ کھی کھی کر کے اس کی ہنسی نکل گئی۔ شاید صبا کی ہنسی کی آواز اس نے سن لی تھی۔ چونک کر گردن گھمائی اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ متوجہ ہوا تو آپ ہی آپ صبا کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ جلدی سے گھبرا کر بولی۔ ''آپ کی بیوی کہاں ہے؟''

''میری بیوی......!'' نجانے کیوں وہ بڑی حیرت بھری نگاہوں سے صبا کو دیکھ رہا تھا اور صبا مزید گھبرائی جا رہی تھی۔

''ہاں ہاں آپ کی بیوی ذرا باہر بلا دیں ان سے کچھ کہنا ہے۔''

''ہو تو بلاؤں نا!''

''کیوں کہیں گئی ہوئی ہیں؟''

''ہائے بیچاری!'' اس نے بڑا لمبا سا ٹھنڈا سانس بھرا۔

''کیا مر گئی؟'' بے ساختہ صبا کے چہرے پر افسوس بھرے تاثرات پھیل گئے۔ اس نے اسی انداز میں تو آہ بھری تھی۔

''خدا نہ کرے۔'' اس نے برا منا لینے والے انداز میں صبا کو گھورا۔

''پھر کیا بیمار ہیں؟'' صبا گڑبڑا کر پھر جلدی سے بولی۔

''دیکھو میری بیوی کے متعلق ایسے کلمات منہ سے نہ نکالو۔''

''پھر مجھے ان سے ایک بات کرنا تھی۔''

''اب اسے کہاں سے لاؤں؟''

''کیوں؟ ہوا کیا آخر؟ آپ تو پہیلیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔''

''وہ ابھی تک آئی ہی نہیں۔''

''کہاں سے؟''

''میرے سسرال سے۔''

''کب کی گئی ہوئی ہیں؟''

''جب سے پیدا ہوئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس کی منطق صبا کی سمجھ میں بالکل نہ آ رہی تھی۔ آنکھیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔

''مطلب یہ کہ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔'' وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔ ''خاصی بیوقوف ہو!''

''اوہ!'' اور صبا بڑی ہمدردی سے اسے دیکھنے لگی۔ ''کیا اکیلے ہی یہاں رہتے ہیں؟''

''نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ تم نے میرا دماغ چاٹ لیا۔ آخر ہو کون اور کیا چاہتی ہو؟''

''یہ لے لیں۔'' صبا نے مرجھایا ہوا گلدستہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا؟'' وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے چلتا دیوار کے قریب آ گیا۔

''کل میں نے یہاں سے پھول توڑے تھے اور......''

''اچھا!'' اس نے صبا کی بات پوری نہیں سنی سر ہلاتے ہوئے درمیان میں ہی بول پڑا۔ ''تو تم نے توڑے تھے میں بھی کہوں میرے سارے پودے کون اُجاڑ گیا۔'' وہ بڑی غصہ بھری نگاہ سے صبا کو دیکھنے لگا۔ ''اور اب ان مرجھائے ہوئے پھولوں کو واپس لے کر میں کیا کروں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''اسی لئے آپ کی بیوی کا پوچھ رہی تھی کہ ان سے معافی مانگ لوں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہو گا۔'' وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہی تھی اور وہ حیران کھڑا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

''مجھے علم نہیں تھا کہ چپکے سے کسی کے پھول توڑ لینا بھی چوری سمجھی جاتی ہے یقین کیجئے مجھے ساری رات اچھی طرح نیند نہیں آئی۔ صبح ہی صبح کتنی بار ادھر آئی کہ کوئی

دکھائی دے تو معافی مانگ لوں مگر یہاں کوئی نہیں تھا۔''

''میری امی سلائی والے سکول میں استانی ہیں۔''

''مگر آج تو اتوار ہے۔''

''نہیں جمعہ کی چھٹی ہوتی ہے۔''

''واپس کب آئیں گی؟''

''یہی کوئی ایک ڈیڑھ بجے کے قریب۔''

''پھر اس وقت ان سے بات کر لوں گی۔''

''کیا بات؟''

''یہی پھولوں کی۔''

''نہیں نہیں کوئی بات نہیں یہ گلدستہ بھی تم اپنے پاس ہی رکھ لو۔''

''شکریہ۔''

صبا کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اس پر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔ پھر وہ بڑی سادگی سے بولی۔ ''اب آپ یہ نہیں سمجھیں گے کہ میں نے چوری کی ہے۔''

''نہیں۔''

''بس پھر ٹھیک ہے۔''

اور اطمینان کا سانس لے کر ہاتھ میں پکڑے گلدستے کو دیکھتے ہوئے کرسی سے نیچے اُتر گئی۔

27

''صبا۔'' فخرو بڑے لاڈ سے اسے پکار رہا تھا۔ ''یہ دیکھ میں تیرے لئے کیا لایا ہوں!''

وہ چولہے میں آگ جلانے لگی تھی ماچس اور دیا سلائی وہیں پھینک بھاگی بھاگی کمرے میں آ گئی۔

"کیا ہے؟"

"تم بوجھو بھلا کیا ہو سکتا ہے؟"

فخرو نے جلدی سے ہاتھ پشت کے پیچھے کر لئے۔ صبا نے اِدھر سے اُدھر ہو کر جھانکنے کی کوشش کی۔

"نہیں بھئی نہیں یہ غلط ہے۔" فخرو نے احتجاج کیا۔

"مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔"

"اس کی اتنی لمبی کمر تھی۔ صبا اپنی کوشش میں ناکام ہی رہی۔"

"پھر بوجھو۔"

"جوتی ہوگی۔" بہت سوچ سوچ کر وہ بولی۔

"نہیں۔" فخرو مسکرایا۔

"کچھ تھوڑا سا اتہ پتہ تو بتاؤ۔"

"پہننے والی چیز ہے۔"

"پہننے والی چیز ہے پہننے والی چیز ہے اوڑھنے والی تو نہیں نا؟"

"تو اس طرح تم سب کچھ مجھ سے ہی پوچھ لوگی۔"

"دوپٹہ...... دوپٹہ!" اور یہ کہتے ہوئے وہ فخرو کے ہاتھ سے پیکٹ چھیننے کے لئے لپکی۔

"نہیں نہیں۔" فخرو نے جلدی سے ہاتھ اور بھی پرے کر دیا۔ "غلط بالکل غلط۔"

"پھر قمیض ہوگی یا شلوار ہوگی۔" وہ بڑی تیزی سے بولی اور ساتھ ہی پھر پیکٹ پکڑنے کے لئے بیتابی سے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں۔ نہ قمیض نہ شلوار۔ یہ تو کپڑا ہے جاؤ تم بوجھ ہی نہیں سکیں۔" اور اس نے صبا کے بڑھتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "تمہارے سوٹ کا کپڑا۔"

"میں نے قمیض اور شلوار کہا تو تھا۔"

"لیکن یہ قمیض اور شلوار تو نہیں نا۔ یہ تو کپڑا ہے۔"

"ہائے! کتنا پیارا!!" وہ بڑے مسرور انداز میں اسے اپنے کندھوں پر پھیلا پھیلا کر دیکھنے لگی۔ "ایسے ریشمی سوٹ کا مجھے بڑا شوق تھا۔ غزالہ کے پاس بھی ایک بالکل ایسے ہی پیازی رنگ کا تھا۔"

"پتہ ہے یہ کس لئے ہے؟"

فخرو جھک کر اس کے مسرور چہرے کو دیکھنے لگا۔

"کس لئے؟"

"تیرے جہیز کے لئے۔" وہ مسکرایا۔

"اوں جہیز کے لئے۔ میں نہیں تم نے کہا تھا کہ تمہارے ایک دوست کی بہن کی شادی ہے۔ وہاں مجھے بھی لے کر جاؤ گے اور یہ سوٹ میں وہاں پہن کر جاؤں گی۔ شادی پر پہننے کے لئے میرے پاس ایسا اچھا اور کوئی نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن اس بار مجھے اپنا صحیح ناپ دینا پہلے والے تم کہہ رہی تھیں ٹھیک نہیں سلے ہوئے۔ اب کسی بہت اچھے درزی سے سلوا کر دوں گا۔"

"سنو بھیا!" کچھ سوچتے وہ ایک دم بولی۔ "درزیوں پر پیسے ضائع کرنے سے فائدہ! مجھے سینا آتے ہیں میں خود سی لوں گی۔ سارا دن ایسے بھی بیکار بیٹھی رہتی ہوں دل بھی لگا رہے گا۔"

"مشین تو ہے نہیں۔"

"ہاں یہ خرابی ہے لیکن ٹھہرو۔" وہ کچھ سوچنے کے بعد کہنے لگی "یہ جو ساتھ والے ہیں نا ان کے پاس یقیناً ہوگی۔ ایک دو دن کے لئے لے لوں گی۔"

"اگر ان کے پاس بھی نہ ہوئی تو؟"

"ضرور ہوگی تمہیں اس دن ساری بات بتائی تو تھی کہ اس کی ماں سلائی والے سکول میں نوکری کرتی ہے...... پھر ضرور ان کے پاس ہوگی ابھی پوچھ کر آؤں؟"

''اس وقت!''

''ہاں کیا حرج ہے صبح صبح پھر وہ سکول چلی جاتی ہیں۔''

''لیکن وہ کہیں سو نہ گئے ہوں۔''

''لو اتنی جلدی ابھی تو شام ہوئی ہے۔''

''پھر پوچھ کر دیکھ لو۔''

وہ جلدی سے باہر کی جانب لپکی۔

''سنو صبا! پہلے دیکھ لینا اگر کوئی بجلی جل رہی ہو گی پھر آواز دینا۔''

''اچھا!'' وہ جلدی جلدی دیوار کے ساتھ کرسی رکھ کر اوپر چڑھ گئی۔ صحن میں کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی برآمدے میں تھا البتہ کمرے کے کھلے دروازے سے برآمدے میں پڑتی ہوئی روشنی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔

سوچنے لگی کہ کس طرح ان سے بات کرے۔ کوئی نظر بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس دن کی طرح ''شی شی۔'' کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

''بھیا!'' گردن موڑ کر وہیں سے فخرو کو مدد کے لئے پکارنے لگی۔

''کیا ہے؟''

''ذرا باہر آنا!''

''کیا ہوا؟'' وہ آ کر اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔

''کیسے بلاؤں؟ باہر کوئی نہیں ہے ویسے اندر روشنی ہے اور دروازے بھی کھلے ہیں۔''

''اب میں یہ تمہیں کیا بتاؤں؟'' اس کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آ رہا تھا۔

''خالہ کہہ کر آواز دوں؟''

''دے کر دیکھ لو۔''

''خالہ! خالہ!!'' اس نے کتنی ہی آوازیں دے ڈالیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔

''اب؟'' وہ سوالیہ انداز میں فخرو کی جانب دیکھنے لگی۔ پھر خود ہی بولی۔ ''وہ جو

خالہ کا بیٹا ہے اس کا نام تم نہیں جانتے؟''

''ایک دو بار محلے کے کسی شخص کے منہ سے سنا تو تھا مگر اب یاد نہیں رہا...... فیشنی سا ہے نا' اس لئے بھول گیا۔'' فخرو بڑی سادگی سے کہنے لگا پھر قدرے توقف کے بعد کچھ خیال آیا تو جلدی سے بولا۔ ''اگر معلوم بھی ہوتا تو کیا اس کا نام لے کر آواز دیتیں......''

''ہاں تو پھر کیا ہے نام ہوتا کس لئے ہے؟'' اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''نہ نہ ایسے برا لگتا ہے۔''

''پھر کیا کروں؟''

''چلو رہنے دو میں درزی سے سلوا دوں گا۔''

''میں نے سوچا تھا ایک تو پیسے بچیں گے دوسرے میرا دل بہلا رہے گا...... ایسا ملائم سا کپڑا ہے سینے میں اتنا مزہ آتا۔''

وہ وہیں کھڑی بڑبڑانے لگی اور فخرو بڑی پریشانی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ آخر کس طرح اس کی یہ معمولی سی خواہش پوری کرے......!

''دیوار پر سے ادھر اتر جاؤں......؟'' وہ پھر پوچھنے لگی۔

''اتر سکو گی؟''

''اس دن پھول لینے اتری تو تھی۔''

''لیکن بغیر پوچھے کسی کے گھر میں یوں جانا'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اچھا نہیں لگتا۔''

''دروازہ کھٹکھٹا کر اندر جاؤں گی۔''

فخرو چپ سا ہو گیا۔

''بھیا! میرا جی چاہتا ہے کل ہی سی لوں۔''

اس نے اتنے لاڈ بھرے انداز میں ضد کی تھی کہ وقت مناسب نہ سمجھتے ہوئے بھی فخرو اسے اجازت دینے پر مجبور ہو گیا اجازت ملتے ہی وہ جلدی جلدی دیوار پر چڑھنے لگی۔

''لو میں تمہیں چڑھا دیتا ہوں۔''

اور اس نے بڑی سہولت سے اس کو دیوار پر چڑھا دیا۔

''اتر جاؤ گی کہ میں اتار دوں۔''

''خود ہی اتر جاؤں گی ان کا برآمدہ کافی اونچا ہے۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''اور تم یہیں رہنا بھیا! مشین مل گئی تو مجھ سے ادھر نہیں لائی جائے گی۔''

''اچھا!''

دیوار سے اتر کر بڑے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے وہ آگے بڑھی۔ جس کمرے کی روشنی برآمدے میں آ رہی تھی اسی کی ایک کھڑکی بھی برآمدے میں کھلتی تھی مگر اس وقت اس کے کواڑ بند تھے ذرا سی انگلی لگائی تو ایک تھوڑا سا کھل گیا درز میں سے اندر جھانکنے لگی۔

بالکل سامنے والی دیوار کے ساتھ بچھے ایک پلنگ پر کوئی سر منہ لپیٹے پڑا تھا اور قریب ہی ایک کرسی پر وہی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ صبا نے دھیرے سے کواڑ کھٹکھٹا دیا۔

وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔ روشنی میں سے آیا تھا اور باہر اندھیرا تھا۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی اس ہیئت پر صبا کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ کھی کھی کی آواز سن کر وہ ٹھٹکا۔ ''کون ہے؟'' ساتھ ہی اس نے برآمدے کی بجلی جلا دی دونوں ایک دم روشنی میں نہلا گئے۔

صبا کی کھی کھی فوراً بند ہو گئی۔

''کیا ہے؟'' اس کی فراخ پیشانی پر شکن پڑ گئے۔

''آپ کے پاس مشین ہے؟'' صبا کو تو بس وہ ریشمی سوٹ سینے کی بے تابی تھی۔ اس کے ماتھے کی سلوٹیں نظر انداز کرتے ہوئے جلدی سے بولی۔

''کون سی مشین؟''

''کپڑے سینے والی۔''

''ہاں ہے۔''

''وہ ذرا ایک دن کے لئے دے سکیں گے؟''

''میری امی کو دو تین دن سے بخار ہے۔ انہیں علم ہے کہ کہاں رکھی ہوئی ہے۔''

''اوہ! لیکن مجھے تو بڑی ضرورت تھی۔'' اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ''وہ کب تک ٹھیک ہو جائیں گی؟''

''اب یہ میں کیا کہہ سکتا ہوں میں کوئی ولی تو ہوں نہیں۔'' وہ بڑے چڑچڑے پن سے بولا۔

''اسد! کون ہے......؟'' اندر سے اس کی ماں کی نحیف سی آواز آئی۔

''امی! یہ ساتھ والی لڑکی ہے ایک دن کے لئے مشین مانگ رہی ہے۔''

''کیا ابھی چاہیے؟''

''کہہ تو یہی رہی ہے۔''

''لیکن اس میں تو میرے کپڑے لگے ہوئے ہیں اس سے کہو صبح آ کر لے جائے۔''

''صبح کیسے دے سکیں گی۔ اتنا تو تیز آپ کو بخار ہے۔''

وہ دروازے میں سے اندر جھانکتے ہوئے ماں سے مخاطب ہوا۔

''شاید صبح تک کچھ کم ہو جائے۔''

''اگر اُتر بھی جائے پھر بھی آپ ایک دم چلنے پھرنے تو نہیں لگ جائیں گی نا۔''

''تو بیٹے! ان کو ضرورت ہو گی نا۔''

''پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

جتنا اس دن شریر ہو رہا تھا اتنا ہی آج بدمزاج دکھائی دے رہا تھا۔ شاید ماں کی بیماری نے اسے ایسا کر دیا تھا اور اب صبا کو احساس ہوا تو جلدی سے بولی۔

''چلو اچھا کوئی بات نہیں رہنے دیں دو تین دن بعد سہی۔''

''ابھی کہہ رہی تھی جلدی چاہیے اور اب ایک دم دو تین دن بعد!!'' وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔

''سنو! اسد!'' اندر سے پھر ماں نے پکارا۔ ''پچھلے چھوٹے کمرے میں صندوقوں کے پاس نچلی تپائی پر پڑی ہے لڑکی سے کہو میرے کپڑے نکال دے اور لے جائے۔''

''نہیں خالہ! آپ کی بہت بہت مہربانی پھر لے جاؤں گی۔'' وہ وہیں سے بولی۔ اس کا دل تو چاہا تھا آگے بڑھ کر اس کی ماں کو دیکھے اس کا حال پوچھے مگر دروازے میں وہ کھڑا تھا اور اس وقت اس کا موڈ بڑا سخت خراب ہو رہا تھا۔ اس لئے مزید کچھ کہے بغیر جلدی سے واپس مڑ گئی۔

28

سب کاموں سے فارغ ہو کر وہ نہانے چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو دوپہر ہو گئی۔ کام تو سارے کر چکی تھی۔ باہر صحن میں کافی دھوپ تھی۔ وہاں جا بیٹھی۔ آج کل دھوپ اچھی ہی لگ رہی تھی۔ اور اسے وہاں بیٹھے ابھی پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ فخرو کی بات یاد آ گئی۔

وہ جاتے جاتے تاکید کر گیا تھا کہ اسد کی ماں کا حال پوچھ آئے۔ ہمسائے ہونے کے ناطے بھی ان کا فرض تھا اور دوسرے اس کا خیال تھا کہ صبا گھر میں بالکل اکیلی ہوتی تھی اس طرح کچھ تھوڑی سی میل ملاقات ہو جاتی تو اس کا دل بہلا رہتا...... اور پھر جان پہچان ہو تو کبھی کبھار ضرورت پڑنے پر انسان ایک دوسرے کے کام بھی آ سکتا ہے۔

پہلے تو اسے نہ کوئی گھر سے تعلق تھا نہ پڑوسیوں سے واسطہ۔ صبح کا نکلا رات کو آتا اور سو جاتا۔ یہ تو اس کے لئے گھر کی بجائے کوئی ہوٹل یا سرائے تھی۔ جہاں وہ رات گزارا کرتا تھا اور کبھی وہ بھی غائب۔ اور اب! اب تو باقاعدہ اس کا گھر تھا۔ گھر میں اس کی بہن تھی۔ سو طرح کی ضرورت پڑ سکتی تھی اردگرد کے ہمسایوں سے میل ملاقات رکھنا ہی چاہیے تھی۔

فخرو کی تاکید کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اٹھنا پڑا۔ ورنہ اس وقت وہ اتنی کاہل ہو رہی تھی کہ جی چاہتا تھا بس یونہی چپ چاپ بیٹھی سوچوں میں کھوئی رہے۔ موڈ بالکل ہی کسی سے بات کرنے کا نہیں تھا۔ بڑی بے دلی سے اٹھی اور سوچوں میں کھوئی کھوئی دیوار

تک چلی گئی۔

کرسی ابھی تک وہیں پڑی ہوئی تھی۔ اس پر چڑھ کر ادھر جھانکنے لگی۔ ہمیشہ کی طرح ان کا صحن خالی پڑا تھا۔ مگر آج ویسا صاف ستھرا نہیں تھا۔ البتہ پودے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ چند دن پہلے جن پر سے سارے پھول توڑ کر اس نے انہیں اجاڑ دیا تھا اب پھر ان پر رنگ رنگ کے پھول کھل رہے تھے۔

پھول تو اس کی کمزوری تھی کتنی ہی دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ بھنبھناہٹ کی آواز نے اس کی محویت کو توڑ دیا۔ اس نے جھنجھلا کر مکھی کو پرے ہٹایا۔ ''یہ مکھیاں بھی خدا نے نجانے کس لئے پیدا کی ہیں ان کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ الٹا انسانوں کو تنگ ہی کرتی ہیں۔'' وہ بڑے غصے سے اس مکھی کو دیکھ کر بڑبڑانے لگی۔ جو کبھی اس کی ناک پر آ کر بیٹھ جاتی اور کبھی ماتھے پر تو کبھی رخساروں پر۔ یونہی جھنجھلاتے اور بڑبڑاتے ہوئے وہ دیوار چڑھ کر ان کے صحن میں اتر گئی۔

گھر میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ وہ معلوم کرنے کے لئے برآمدہ میں آئی تو دیکھا کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔

''خالہ! خالہ!!'' وہ وہیں رک کر آوازیں دینے لگی۔

''کون ہے؟'' اندر سے اسد کی ماں کی نقاہت بھری آواز آئی۔

''خالہ میں ہوں جو رات کو آئی تھی۔''

''آجاؤ اندر۔''

''السلام علیکم!'' وہ قدرے جھجکتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ رات والے اسی پلنگ پر وہ کمبل اوڑھے لیٹی تھیں۔

''وعلیکم السلام! مشین لینی ہے؟''

''نہیں خالہ! آپ کا حال پوچھنے آئی تھی میرا بھائی صبح کام پر جاتے جاتے کہہ گیا تھا۔''

''بڑی مہربانی بیٹی!'' وہ کراہتے ہوئے بولیں۔

مڑی ہی تھی کہ خیال آیا ''یوں گندے برتن رکھ دینا اچھا نہیں لگتا۔ دوسرے وہ بیچاری بیمار پڑی تھیں نجانے کب ٹھیک ہوں۔ ہمدردی کا مادہ تو اس کے ننھے سے دل میں خدا نے کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ارد گرد نظر دوڑائی اور بھی سارے برتن پڑے تھے۔ باقی چیزیں بھی ایسی ہی بے ترتیبی سے پڑی تھیں کہ طبیعت صفائی پسند ہونے کے باعث الجھن سی ہونے لگی۔ آستینیں چڑھا کام میں جت گئی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس نے باورچی خانہ آئینے کی طرح چمکا کر رکھ دیا۔ فارغ ہو کر واپس اسد کی ماں کے پاس آئی۔

''خالہ!'' وہ شاید سوگئی تھیں۔ اس کی آواز دینے پر چونک اٹھیں۔ ''کوئی اور ضرورت ہو تو مجھے بتائیں۔''

''نہیں بیٹی! پہلے ہی تم نے بہت تکلیف کی ہے خدا تمہارا بھلا کرے۔''

''کھانا وغیرہ کون پکاتا ہے؟''

''کوئی بھی نہیں مجھ سے اٹھا ہی نہیں جاتا پکائے گا کون؟''

''پھر کیا کرتی ہیں؟''

'اسد بازار سے کچھ نہ کچھ لے آتا ہے اور میں کھاتی ہی نہیں۔''

''جب تک آپ ٹھیک نہیں ہوتیں میں پکا دیا کروں گی۔''

''نہیں نہیں اتنی زیادہ تکلیف میں تمہیں نہیں دوں گی۔''

''تکلیف کیسی خالہ! آپ تو تکلف کرنے لگیں۔''

''نہیں بیٹی تکلف کی بات نہیں میں تو'' اور پھر قدموں کی چاپ پر بات ادھوری چھوڑ دروازے کی جانب دیکھنے لگیں۔

اسد ہاتھ میں دو تین دوا کی شیشیاں اور پھل کے لفافے اٹھائے اندر داخل ہوا۔

صبا جلدی سے کرسی سے اٹھتے ہوئے پرے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ ارد گرد دیکھے بنا چیزیں میز پر رکھ کر سیدھا ماں کے پلنگ کی طرف آیا۔

''امی! کیا حال ہے؟ جلد آنے کی بہت کوشش کی مگر یہ پرائی نوکری!'' اور وہ جھک کر بڑے ہی پیار سے ماں کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''آج سارے زمانے کی گالیاں میں نے اپنے افسروں کو دے ڈالیں۔''

''نہیں میرے لال! گالی نہیں دینا چاہیے۔''

وہ بڑے زور سے ہنسا۔ ''امی! کوئی سچ مچ تھوڑا دی تھیں ویسے انہیں بھی تو دوسرے کی مجبوری کا خیال کرنا چاہیے نا۔''

''چلو بیٹا کوئی بات نہیں۔ اللہ ہر ایک کا والی ہے اس نے مجھے بھی اکیلا نہیں رہنے دیا یہ بیچاری رحمت کا فرشتہ بن کر میرے پاس آ پہنچی۔''

''دوا پی ہے؟''

''ہاں اسی نے آ کر پلائی۔ پھر بیچاری نے چائے بنائی۔ زبردستی ایک توس بھی مجھے کھلا دیا۔ میں تو نہ نہ ہی کرتی رہی مگر اب مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے کچھ جان میں جان آ گئی ہے۔ اچھا ہی کیا اس نے کھلا دیا۔''

''میرا تو کہا آپ مانتی نہیں ہیں نا۔ اولاد ہونے کا یہی نقصان ہے۔''

''تو کیا تجھے میرا باپ ہونا چاہیے تھا۔'' وہ بڑی محبت سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ایسے حالات کے لئے یہی مناسب ہو سکتا ہے۔ خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اگلے جنم میں میری بیٹی ہوں پھر دیکھوں گا کیسے میری بات نہیں مانتیں۔''

''چل شریر کہیں کا!'' اور وہ بے اختیار ہنس دیں۔

''ہائے! یہ پیٹ!! چلیں اور اسے بھرنے کا کچھ بندوبست کریں...... کیا ہی اچھا ہوتا جو کھانے پینے کا دستور نہ ہوتا۔'' وہ ایک آہ بھرتا ہوا ماں کے پلنگ پر سے اٹھا۔

''آتے ہوئے کچھ لائے نہیں؟''

''یاد نہیں رہا۔ بڑھاپے نے حافظہ خراب کر دیا ہے۔''

وہ ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے دوسرے کمرے میں جاتے جاتے بالکل بوڑھوں کے سے انداز میں کھانس کھانس کر بولا۔ صبا اور اسد کی ماں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

''خالہ! سالن پکا رکھا ہے۔ جلدی جلدی ساتھ چپاتیاں بھی پکا کر لا دوں؟''

''نہیں بیٹی! ابھی اسد بازار سے کچھ لے آئے گا۔''

''نہیں۔ میں لا دیتی ہوں۔'' اور وہ بچوں کی طرح بڑی تیزی سے باہر بھاگ گئی۔ اسد کی ماں پکارتی ہی رہی مگر اس نے ایک نہ سنی۔

''بے چاری بڑی ہی اچھی ہے۔''

''جی ہاں! بُرے تو بس ایک ہم ہی ہیں۔'' وہ آ کر پلنگ کے پاس والی کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

''ارے! میں نے تمہیں کب کچھ کہا؟''

''اسے اچھا کہنے کا صاف مطلب ظاہر ہے کہ پھر میں برا ہوا۔''

''خواہ مخواہ ہی!'' وہ ہنس دیں۔

''امی! میں نے بڑی کوشش کی لیکن چھٹیاں نہیں مل رہیں۔''

''پھر۔''

''اسی بات نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔'' وہ بڑے فکرمند لہجے میں بولا۔

''آپ بالکل اکیلی ہوتی ہیں۔''

''نہ بیٹے! پریشان کیوں ہوتے ہو۔''

''امی! پریشان ہونے والی تو بات ہے...... آپ اتنی بیمار ہیں اور پاس کوئی پانی تک پوچھنے والا نہ ہو یہ تو ظلم ہے نا!''

''اللہ مالک ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے اللہ مالک ہے لیکن مجھے تو فکر رہتا ہے نا۔''

''یہ لڑکی اسد کیا نام ہے اس کا؟''

''مجھے کیا پتہ امی!''

''تم کہہ رہے تھے نہ کہ پھول توڑنے کی معافی مانگ رہی تھی۔''

''ہاں وہ تو میں نے بتایا تھا لیکن اس کا نام مجھے معلوم نہیں۔''

''میری بھی عقل دیکھو اتنی دیر میرے پاس رہی میں نے نام پوچھا ہی نہیں۔'' اور نقاہت سے تھکا تھکا سا سانس لیتے ہوئے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

''امی! نیند آ گئی؟''

''نہیں۔''

''یہ دیکھئے آپ کے لئے سیب لایا ہوں۔ ایک چھیل کر دوں؟''

''نہیں تم اپنے لئے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔''

''وہ لڑکی جو کہہ رہی تھی کہ لے کر آتی ہے۔''

''اسد! کچھ اچھا نہیں لگتا بیٹے!''

''پھر کیا ہے امی؟''

''نہ ان سے جان نہ پہچان!''

''تو امی! ہم کوئی اس کے گھر سے مانگنے گئے ہیں۔ خود ہی بار بار ہمارے گھر آتی ہے...... پھر نہ آئے۔''

''تُو تو پگلا ہے!''

''مجھ میں بازار جانے کی ہمت بالکل نہیں ہے۔''

''تو پھر ایسے کہو نا۔''

اسد زیرلب مسکرا کر چپ ہو گیا۔ ماں نے بوجھا تو بالکل ٹھیک تھا۔ دوسرے اتنے دنوں سے بازار کی چیزیں کھا کھا کر اس کا دل اکتا چکا تھا۔ وہ تو بلکہ دل ہی دل میں صبا کی پیش کش سے خوش ہی ہوا تھا۔ گھر کے پکے ہوئے سالن کا مزہ ہی نرالا ہوتا ہے وہ ہونٹوں پر زبان پھیر پھیر کر انتظار کرنے لگا۔

''خالہ! خالہ!!''

صبا دیوار پر سے پکار رہی تھی اسد نے آواز سنتے ہی جلدی سے ماں کی طرف دیکھا وہ شاید سو گئی تھیں...... چپ چاپ آنکھیں بند کئے لیٹی تھیں۔

''مجھ سے یہ اٹھا کر دیوار پر چڑھا نہیں جا رہا۔''

قدرے توقف بعد صبا کی آواز پھر آئی اسد جلدی سے اٹھ کر باہر نکلا وہ ہاتھوں میں ایک ٹرے اٹھائے کھڑی تھی۔ اسد کو دیکھ کر سادگی سے مسکرادی۔

"یہ ذرا پکڑ لیں۔"

"امی کہہ رہی تھیں تم نے بہت تکلیف کی۔" اور ساتھ ہی جلدی سے اس کے ہاتھوں سے ٹرے لے کر اس میں رکھی ہوئی چیزوں کو دیکھنے لگا۔

"بہت بھوک لگی ہوئی ہے؟" صبا اس کی نگاہوں کا انداز دیکھ کر ہنستے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں بہت۔"

"جب تک خالہ اچھی نہیں ہو جاتیں آپ کا کھانا میں پکا دیا کروں گی۔"

"نہیں نہیں۔تم کہاں اتنی تکلیف کرو گی!"

"تکلیف کی کیا بات ہے...... ہمسائے کا ہمسائے پر بہت حق ہوتا ہے..... کوئی اور بھی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دیجئے گا میں سارا دن بیکار ہی ہوتی ہوں۔" پھر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"سنو!" اسد کو ایک دم کچھ یاد آ گیا۔

"کیا ہے؟" وہ پھر ادھر جھانکی۔

"مشین لینی ہے تو لے لو میں یہاں سے پکڑا دیتا ہوں۔"

"نہیں پھر سہی۔" اور وہ بے اختیار مسکرادی۔

29

"خالہ! خالہ!!" وہ اندھا دھند بھاگتے ہوئے آ کر اسد کی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔ "ہائے مجھے بچائیے...... مجھے بچائیے۔"

اور پھر ساتھ ہی اسد بھی تیز تیز چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

"ہائیں ہائیں کیا ہوا؟" وہ اسد کو روکتی ہی رہ گئیں مگر اس نے ایک نہ سنی ماں کے پیچھے گھس کر صبا کو کان سے پکڑ لیا۔

"اب بتا باز آئے گی یا نہیں؟"

"اسد! کچھ ہوش کی دوا کر۔ مجھے بتا کیا ہوا؟"

"امی! ایک تو یہ ہر دوسرے تیسرے میرے گملوں پر سے پھول اتار لیتی ہے اور پھر جو پوچھوں تو اوپر سے منہ چڑا کر بھاگ جاتی ہے۔"

"پھول میں نے خالہ سے پوچھ کر لئے تھے۔" وہ اپنا کان چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"ہاں بیٹے! میری اجازت سے توڑے تھے۔" انہوں نے صبا کی طرف سے صفائی پیش کی۔

"تو امی! آپ کیوں اسے توڑنے دیتی ہیں آپ کو علم بھی ہے کہ یہ مجھے سخت ناپسند ہے کہ کوئی میرے پھول توڑے۔"

"تو بیٹے ہوا کیا بیچاری کو گلدستہ بنانے کا شوق تھا۔"

"اتنا ہی زیادہ شوق ہے تو اپنے گھر میں کیوں نہیں لگا لیتی۔"

"اسد! تم تو بچوں سے بھی گئے گزرے ہو گئے۔" ماں نے بیٹے کو بڑے زور سے گھور کر دیکھا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں بس اسے کہہ دیجئے یہاں سے پھول نہ توڑا کرے۔" وہ چہرہ پھلا کر پرے ہو بیٹھا "اتنے شوق سے میں نے پودے لگائے ہیں اور یہ چڑیل روز ان کا ستیاناس کر دیتی ہے۔"

وہ بڑے غصہ سے بڑبڑا رہا تھا اور صبا اس کی تیوریاں چڑھے چہرے کو دیکھ دیکھ کر ہنستی ہی جا رہی تھی۔ "میں کل ہی یہ بیچ والی دیوار اونچی کراتا ہوں جب دیکھو ہمارے ہی گھر میں گھسی رہتی ہے۔" صبا کی ہنسی اسد کو اور بھی آگ بگولا کر گئی۔

"اونہوں!" ماں نے پھر اسے گھورا۔

"آپ ہمیشہ مجھی کو جھوٹا کر دیتی ہیں۔ اسے کبھی کچھ نہیں کہا۔" وہ دونوں کی طرف سے رخ پھیر کر بیٹھ گیا۔ ماں جو اس کی طرف داری کئے جا رہی تھی وہ اس سے بھی ناراض ہو گیا۔

"خالہ! آپ نے وہ مداری والا تماشہ دیکھا ہوا ہے نا جس کا بندر روٹھ جاتا ہے۔" وہ اسد کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے ہنس ہنس کر دوہری ہوئی جا رہی تھی...... اس کی اس بات پر بیٹے کی طرف دیکھ کر ماں بھی بے اختیار مسکرا دیں اسد آنکھوں کے گوشوں سے چوری چوری انہیں کو دیکھ رہا تھا۔ صبا کے اس فقرے اور ماں کی مسکراہٹ نے اسے بالکل ہی آپے سے باہر کر دیا۔

"وہ مداری کا تماشہ میں تمہیں دکھاتا ہوں۔" وہ اٹھ کر پھر اس کے پیچھے بھاگا ماں نے بہتیرا بیٹے کو پکڑنے کی کوشش کی زبانی بھی اسے منع کرتی رہیں مگر اب کون سنتا تھا اس نے پھر صبا کا کان پکڑا اور کھینچتا ہوا باہر صحن کی طرف لے گیا۔

"جا چلی جا اپنے گھر اب اگر یہاں پر آئی تو پھر دیکھنا۔"

"خالہ۔ خالہ جی!!" وہ چلاتی ہوئی اس کے ساتھ گھسٹتی جا رہی تھی۔

"اسد! اسد!! نہ کرو۔"

ابھی ان کی کمزوری اچھی طرح رفع نہیں ہوئی تھی اس لئے وہ اٹھ کر اس کے پیچھے نہ جا سکیں وہیں سے بیٹے کو پکارتی رہ گئیں۔

"میں تو اب کسی کی نہیں سنوں گا۔" اور اس نے اسے دیوار کے قریب لے جا کر کھڑا کر دیا۔ "چلو جاؤ اپنے گھر!"

"نہیں جاؤں گی۔"

"اسد! بیٹے کچھ عقل کر۔" اندر سے پھر ماں نے پکارا۔

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں جاتی۔" ماں کی سنی ان سنی کرتے ہوئے اس نے صبا پر رعب ڈالا۔

"میں اپنی خالہ کے گھر آتی ہوں آپ کے پاس تھوڑا آتی ہوں۔"

"ہونہہ! خالہ کے گھر ماں تو وہ میری ہی ہے نا۔" وہ پھر بڑبڑانے لگا۔ "جب سے ہمارے گھر آنا شروع کیا مجھ سے میری ماں کو ہی چھینتی جا رہی ہے۔" بالکل بچوں کی طرح ان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ "تیری اپنی ماں کہاں ہے؟"

"اسد! اسد ادھر آ میری بات تو سن۔" ماں نے پھر اسے آواز دی۔

"بتا۔ تیری ماں کہاں ہے؟"

اور اب نہ صبا کے چہرے پر وہ شرارت تھی نہ شرارت بھری مسکراہٹ! وہ سر جھکائے چپ چاپ کھڑی تھی۔ یہ موضوع ہی ایسا تھا کہ جوں ہی چھڑ جاتا آپ ہی آپ اس کی گردن جھک جاتی۔ اور زبان گنگ ہو کر رہ جاتی جیسے وہ مجرم تھی!

چند لمحے یونہی بت کی طرح بے جان سی کھڑی رہی پھر خاموشی سے دیوار پر چڑھنے لگی۔ ان میں تو اکثر لڑائی جھگڑا ہوتا ہی رہتا تھا اور پہلے بھی کئی بار یونہی اسد اسے اپنے گھر سے نکالنے کی دھمکی دے چکا تھا مگر انجام کبھی یہ نہ ہوا تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اس سے بچ کر پھر اس کی ماں کے پاس جا پہنچتی اور تھوڑی دیر بعد لڑائی جھگڑا بھول کر تینوں بڑے مزے سے گفتگو کر رہے ہوتے تھے مگر آج یہ کیا ہو گیا تھا۔ اسد نے دیکھا وہ چپ چاپ دیوار پر چڑھ گئی تھی۔

"ارے! کیا ہوا؟" اس نے صبا کے دوپٹے کا پلو تھام لیا۔

"کچھ نہیں۔"

اسد کو اس کی آواز کچھ بدلی بدلی لگی تھی۔ مضطرب سا ہو کر جلدی سے بولا۔

"ادھر تو دیکھ۔"

اس نے مڑ کر لحہ بھر کے لئے اسد کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف چھلانگ لگا دی۔ اس نے دیکھا صبا کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں نجانے کیوں؟ آخر اس نے کیا کہہ دیا تھا جو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے ان دونوں میں تو اس سے بھی زیادہ جھگڑا ہو جایا کرتا تھا مگر وہ یوں کبھی نہیں رو دی تھی...... ہمیشہ ہنستی ہی رہتی تھی۔

اسد سوچوں میں کھویا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا واپس اندر چلا گیا۔

30

''اسد! اسد بیٹے!! بہت دن چڑھ گیا اب اٹھو بھی نا۔''

''اچھا امی!'' کسلمندی سے اس نے پھر کروٹ بدلی۔

''کیا آج دفتر نہیں جانا؟''

''جانا ہے۔'' وہ اسی طرح لیٹے لیٹے بولا۔

''تو اٹھو دیر ہو رہی ہے۔''

''طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' وہ پریشان سی ہو گئیں اور اس کے قریب آ کر اس کے چہرے اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''کچھ نہیں بس ایسے ہی۔''

''کہیں بخار تو نہیں جسم کچھ گرم گرم لگ رہا ہے۔''

''نہیں بخار تو نہیں ہے صرف سر میں درد ہے۔''

''تو اٹھو پھر ناشتہ تیار ہے ایسپرو کھا لینا ابھی آرام آ جائے گا۔'' اور وہ دروازے کی طرف چلیں۔ ''مجھے بھی دیر ہو رہی ہے۔''

''کیا آپ سکول جا رہی ہیں؟''

''ہاں۔''

''امی! آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ آپ اب سکول جانا چھوڑ دیں۔'' وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ماں نوکری کرے اچھا نہیں لگتا۔''

''بیٹے! میں تو خود اب چھوڑنا چاہتی ہوں مگر سکول والے نہیں چھوڑ رہے۔''

''کیوں؟''

''یہ جو جماعت ڈپلومہ لینے جا رہی ہے۔ کہتے ہیں اس کا کورس مجھے ہی ختم کرانا چاہیے۔ صرف تین مہینے باقی رہ گئے ہیں۔''

''اس کے بعد تو پھر چھوڑ دیں گی نا؟''

''ہاں اور اب ضرورت بھی کیا ہے ماشااللہ تمہارے اکیلے کی تنخواہ ہی اتنی ہے کہ گھر کا خرچ خوب اچھی طرح کرنے کے بعد بھی کافی بچ جاتی ہے۔ اللہ میرے بیٹے کی کمائی میں اور برکت دے!'' وہ بڑے خلوص سے بیٹے کو دعا دینے کے بعد مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''اب تو میں خود چاہتی ہوں جلد از جلد سکول چھوڑوں اور پھر اپنے بیٹے کی شادی کے کچھ انتظامات کروں۔''

شادی کی بات سن کر وہ کچھ چپ سا ہو گیا۔ سوچوں میں کھویا کھویا سا بولا۔ ''پھر امی! آپ ناشتہ کر کے جائیں میں بعد میں تیار ہو کر چلا جاؤں گا۔''

وہ کمرے سے باہر نکلیں تو اسد پھر بستر پر دراز ہو گیا آج تو اس کا دفتر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ہر طرف ایک ویرانی اور اداسی سی چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس دن کے بعد صبا ادھر نہیں آئی تھی۔ ماں نے اس کے نہ آنے کے متعلق ایک دو بار ذکر بھی کیا تھا کہ اس کے بغیر گھر میں رونق نہیں لگ رہی مگر اس نے کوئی پروا نہیں کی تھی۔

نجانے کیا ہوا تھا رات کو بستر پر لیٹا تو اچانک اس کا خیال آ گیا اور پھر تقریباً ساری رات وہ سو نہیں سکا تھا۔ جاگتا رہا اور اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ کتنی بار پریشان ہو کر سر جھٹکتا اور ذہن کسی اور طرف لگانے کی کوشش کرتا مگر دوسرے ہی لمحے وہ چھم چھم کرتی پھر اس کے خیالوں میں آ موجود ہوتی۔ اور پھر یونہی ساری رات بیت گئی۔ صبح ماں نے شادی کی بات کی تو سیدھا خیال پھر اسی کی طرف چلا گیا۔ ساتھ ہی اس کے بغیر دل ایک دم اداس ہوا تھا اور اب اس پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا تھا کہ بے خیالی میں ہی وہ اس کے دل و دماغ پر چھا کر رہ گئی تھی وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

لیٹا رہا اور اس کی شرارتوں' عجیب و غریب حرکتوں اور بھولی بھالی باتوں کو یاد کرتا

رہا اور پھر یک لخت ہی اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ اس کے پاس آ جائے لیکن وہ تو اتنے دنوں سے اس سے روٹھی ہوئی تھی۔ وہ بے چین سا ہوتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر نگاہ کی دس بج چکے تھے۔ اس کی سوچوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ ناشتہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہا۔ سوچا چائے کی ایک پیالی ہی پی لے چائے دانی کو ہاتھ لگایا وہ بھی ٹھنڈی ہو چکی تھی ہاتھ پرے کھینچ لیا اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

آخر وہ کیوں روٹھ گئی تھی؟ کیوں اس کے پاس آ نہیں رہی تھی؟ اس کا دل اس کے بغیر اتنا بے قرار ہو رہا تھا ٹہلتے ٹہلتے برآمدے میں چلا گیا۔

کتنی ہی دیر اس امید کے سہارے وہاں کھڑا رہا کہ ابھی ابھی دیوار پر پہلے اس کا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہو گا پھر وہ خود اوپر چڑھ کر ادھر اتر آئے گی اور اس کا منہ چڑاتے ہوئے اندر بھاگ جائے گی۔ مگر سوچیں سوچیں ہی رہیں حقیقت کا روپ نہ دھار سکیں۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اب مزید اس کے انتظار کا یارانہ رہا بے صبری سے آگے بڑھا۔ ایڑیاں اٹھا کر صحن میں جھانکنے لگا اور۔ اور پھر بے اختیار اس کی باچھیں کھل گئیں۔

وہ باہر صحن میں ہی موجود تھی۔ شاید نہا کر بیٹھی تھی پشت پر لمبے لمبے بال بکھرے تھے اور ان میں سے ننھی ننھی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔

''اے! او لڑکی!!''

چونکتے ہوئے صبا نے رُخ پھیرا۔ اسد وہاں کھڑا تھا وہ بڑی سادگی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کر دیوار کے پاس آ گئی۔

''کیا ہے لڑکے؟'' شرارت سے بالکل اسی کے انداز میں بولی۔

''اتنے دنوں سے کہاں تھی؟ ادھر نہیں آئی؟'' صبا کا نکھرا نکھرا چہرہ بکھرے ہوئے سیاہ بالوں میں کچھ زیادہ ہی حسین لگ رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے دیکھنے لگا۔

''فخرو بھائی کے ایک دوست کی بہن کی شادی پر گئی ہوئی تھی۔''

''اتنے دن وہیں لگا دیئے؟''

''نہیں تو۔''

''پھر ادھر کیوں نہیں آئی؟''

''آتے ہی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔''

''اپنا گھر سمجھ کر وہاں کھانا پینا تھا نا۔'' نجانے کیا بات تھی اسے دیکھ لیتا تو بس اس سے شرارتیں کرنے کو ہی دل چاہنے لگتا۔ ''بے تحاشا کھانے کا یہی انجام ہوتا ہے پیٹو لڑکی!''

''اچھا تو پھر آپ کو کیا۔ آپ کے گھر سے جب کھانے کو آؤں گی پھر کہیے گا۔''

''اچھا! تو اس دن کی بات ابھی تک دل میں رکھے بیٹھی ہے۔''

''کس دن کی؟''

''اسی دن جب رو دی تھی۔''

''نہیں تو۔''

''کیا نہیں تو۔ اب جھوٹ بھی بولنے لگی ہو۔''

''خدا نہ کرے جو میں جھوٹ بولوں۔''

''تبھی پھر اس کے بعد آئی بھی تو نہیں۔''

''آج آنا تھا۔''

''کب؟''

''بس ابھی تھوڑی دیر کے بعد آج طبیعت ٹھیک ہے نا۔''

''اور میں سمجھ رہا تھا تم میری کسی بات پر روٹھی ہوئی ہو۔''

''نہیں آپ نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔''

''تو بس پھر آؤ۔'' اور اطمینان بھری مسکراہٹ اسد کے چہرے پر پھیل گئی۔

''بال سوکھ جائیں تو انہیں سمیٹ کر آتی ہوں۔''

''تمہارے بال نجانے کب سوکھیں گے اور مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''کیوں خالہ کہاں ہیں؟''

''وہ سکول گئی ہیں۔''

"ارے! مجھے تو اب خیال آیا ہے آپ آج دفتر نہیں گئے؟"

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"کیوں کیا ہوا؟" وہ ہمیشہ دوسرے کے لئے ایک دم ہی پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ بڑے فکر مند لہجے میں پوچھنے لگی۔

"سر میں درد تھا۔"

"پھر کوئی دوائی کھائی ہے؟"

"ہاں ابھی ابھی کھائی ہے۔" وہ بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔

"تو پھر درد ٹھیک ہو گیا؟"

"ایک دم اور اب بھوک لگ گئی ہے۔"

"صبح کا کھایا کچھ نہیں۔"

"نہیں' بالکل کچھ نہیں۔"

"اوہ! پھر کیا کھائیں گے؟"

"کچھ کھلا دو۔"

"ابھی سالن پکا کر رکھا ہے' ساتھ چپاتیاں پکا دوں؟"

"نہیں کھانا امی کے ساتھ کھاؤں گا۔"

"پھر؟"

"ادھر آ کر چائے بنا دو۔"

"اچھا! ابھی بالوں کو باندھ کر آتی ہوں۔"

"نہیں اتنا صبر نہیں ہے پہلے آ کر بنا دو۔"

"توبہ توبہ! خالہ ٹھیک ہی کہا کرتی ہیں کہ آپ بچوں سے بھی زیادہ بے صبرے ہیں۔" یہ کہتے کہتے ساتھ ہی وہ دیوار پر چڑھ گئی۔

"بندریا!" اسد شرارت سے بولا۔

"چلو شکر ہے اس دن والا بدلہ تو اتر گیا۔" صبا مسکرائی پھر ایک دم بولی۔ "آہا!

اتنے سارے پھول!! ابھی ان پر ہاتھ صاف کرتی ہوں۔ اتنے دنوں سے میرے کمرے کو گلدستہ نصیب نہیں ہوا تو کیسا سونا لگ رہا ہے۔" ساتھ ہی وہ اسد کو کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی کہ ابھی وہ آپے سے باہر ہو جائے گا۔

"ہاں ہاں بنا لو گلدستہ!"

"ہائیں!" ایک دم مارے حیرت کے صبا کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "یہ آپ اتنے صلح پسند کب سے ہو گئے۔ ورنہ پھولوں کے نام پر تو آپ بھڑک اٹھا کرتے تھے۔"

"ہاں بس کچھ ایسا ہے۔" وہ سر کو کھجاتے ہوئے مسکرایا۔ "پہلے اتنا عرصہ لڑائی کر کے دیکھ لی اب ذرا صلح کا مزہ چکھنا چاہتا ہوں۔"

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ! بڑا نیک خیال ہے۔" اور وہ بڑے طنز سے اسے دیکھتی ہوئی سیدھی باورچی خانہ میں چلی گئی۔ پیچھے پیچھے اسد بھی جا پہنچا۔ آگ جلا کر چائے کا پانی کھولنے کے لئے رکھتے ہوئے بولی۔ "خیر سے آپ کافی سگھڑ واقع ہوئے ہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"آپ کو چائے بنانا بھی نہیں آتی۔"

"آتی تو ہے مگر تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی پینے کو دل چاہ رہا تھا۔"

"اچھا تو پھر اس سے ثابت ہوا کہ میں مزیدار چائے بناتی ہوں۔"

وہ بڑے زور سے ہنس دی۔ اسد کی ماں کی بیماری کے دوران اور اس کے بعد بھی کئی بار اس نے اسد کے لئے چائے بنائی تھی اور وہ ہمیشہ چائے کا ایک گھونٹ لے کر سو سو باتیں کرتا تھا کہ وہ اتنی بڑی ہو گئی تھی اور ابھی تک اسے اچھی چائے بنانا ہی نہیں آئی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ایک آدھ گھونٹ پھینک بھی دیا کرتا تھا اور صبا جل بھن کر بڑبڑاتی بڑبڑاتی اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی۔ اور آج سے اچانک ہی علم ہو گیا تھا کہ وہ اسد کی شرارت تھی وہ کتنی ہی دیر ہنستی رہی اور اسد کھڑا مسکراتا رہا۔

رات بھر دل میں ایک بے کلی سی سمائی رہی تھی اور اب یک لخت ہی جیسے اسے

قرار آ گیا تھا۔ وہ اپنی تمام تر معصومیتوں اور دلفریبیوں کے ساتھ اس کے سامنے جو موجود تھی۔ اور یہی اس کے دل کی تمنا تھی جو پوری ہوگئی تھی وہ بڑا پرسکون تھا۔

''آپ اندر چل کر بیٹھیں نا میں چائے بنا کر وہیں لے آتی ہوں۔''

''خالی چائے؟''

''نہیں۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں ساتھ بنا دیتی ہوں۔''

''ارے! مجھے یاد آیا امی نے میرے لئے ناشتہ بنایا تو تھا۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''اندر کمرے میں پڑا ہے۔''

''لیکن وہ تو ٹھنڈا ہوگیا ہوگا؟''

''ہاں۔''

''وہی گرم کردوں یا اور بنا دوں؟''

''وہی گرم کردو۔''

اس کی خواہش کے مطابق وہ جلدی جلدی سب کچھ کرنے لگی ہر چیز قرینے سے ٹرے میں رکھ کر کمرے میں لے آئی۔ وہ بیٹھا گنگنا گنگنا کر انتظار کر رہا تھا۔

''ایسا سست انسان بھی میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ گیارہ بجے ناشتہ ہو رہا ہے۔''

''اری چڑیل! کہا تو ہے کہ صبح میری طبیعت پریشان تھی۔ اس لئے ناشتہ کرنے کو جی نہ چاہا۔''

''کیوں؟ طبیعت کیوں پریشان تھی؟''

''تم اتنے دن آئی نہیں تو مجھے خیال آیا میری کوئی بات بری لگ گئی ہوگی بس طبیعت پریشان ہوگئی۔''

''حد ہوگئی یہ بھی کوئی پریشان ہونے والی بات ہے۔''

''یہ اب تمہیں کیا بتاؤں!'' وہ بہت دھیرے سے بولا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا

تھا۔ ''بس کچھ ایسا ہی معاملہ ہوگیا ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔''

''یقیناً مجھے ہی برا بھلا کہہ رہے ہوں گے۔ ایک تو اتنا کام کر کے دیا اور پھر اوپر سے باتیں بناتے ہیں۔'' وہ اٹھ کر چل دی۔

''ارے! ارے! سنو تو پاگل ہوئی ہو کب میں نے تمہیں باتیں بنائی ہیں۔''

''دھیرے دھیرے کچھ کہہ تو رہے تھے۔''

''نہیں تو' کچھ نہیں کہا تھا۔''

''آپ ہمیشہ ہی تو کام کرانے کے بعد اس میں کیڑے نکالا کرتے ہیں۔ میں نے سمجھا ایسے ہی پھر کچھ کہہ رہے ہوں گے۔''

''نجانے تمہیں عقل کب آئے گی؟'' وہ ہنسنے لگا۔ ''چلو آؤ بیٹھو اور کوئی شادی کی بات سناؤ۔'' یہ محض اس نے اسے پاس بٹھانے کو کہا تھا ورنہ کسی کی شادی سے اسے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

''ہاں سچ یاد آیا ایک بڑی مزیدار بات سناؤں۔'' وہ ہنستے ہوئے پھر پلنگ پر جا بیٹھی۔ ''وہاں شادی میں ایک عورت تھی۔ بار بار مجھے بلا کر اپنے پاس بٹھا لے۔''

''کیوں؟''

''وہی تو بتا رہی ہوں اور مجھ سے خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرے۔''

''کیا اِدھر اُدھر کی؟''

''یہی کہ میں کہاں رہتی ہوں کتنے بہن بھائی ہیں اسی قسم کی۔''

''کیوں؟''

''ہائے اللہ بتانے تو لگی ہوں آپ سنیں بھی تو۔''

''اچھا اچھا سناؤ۔'' وہ اس کے دلفریب چہرے پر چھائی جھنجھلاہٹ کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"پھر مجھ سے پوچھنے لگی کہ میری منگنی ہو چکی ہے۔"

اس ذکر کے ساتھ ہی صبا کے چہرے پر حیا بھری سرخی پھیل گئی اور اسد کے کان کھڑے ہو گئے۔

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہہ دیا ہو چکی ہے۔"

"کیا؟" ایک دم اس نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی اور بڑے تشویش بھرے لہجے میں بولا۔ "تمہاری نسبت کہیں طے ہو چکی ہے؟"

"نہیں وہ تو میں نے جھوٹ بولا تھا۔" وہ بڑی سادگی سے ایسے سب کچھ سنا رہی تھی جیسے وہ اس کی راز دار سہیلی تھی!

"تو تم نے جھوٹ کیوں بولا؟"

"مجھے وہ عورت اچھی نہیں لگی تھی۔"

"اچھی کیوں نہیں لگی تھی؟"

"بار بار میرے سامنے اپنے لڑکے کی جھوٹی تعریفیں جو کرتی تھی۔ اور مجھے وہاں ایک لڑکی نے بتا دیا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔"

"تو یہ تم نے کیسے جانا کہ اپنے لڑکے کی جھوٹی تعریفیں کرتی تھی کیا پتہ سچ ہی اس نے کہا ہو۔"

"نہیں۔ میں نے اس کا لڑکا دیکھا تھا۔"

"کہاں؟" اسد چونکا۔

"وہیں شادی میں اسی لڑکی نے دکھایا تھا۔"

"کیسا تھا؟" اسد اس کی باتوں میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔

"شکل صورت کو تو خیر کچھ کہنا نہیں چاہیے خدا بنانے والا ہے، لیکن اس کے طور طریقے شریفوں والے نہیں تھے۔"

"کیوں؟ کیا کرتا تھا؟"

"زیادہ وقت اُدھر ہی کھڑا رہا جہاں عورتیں بیٹھی تھیں اور ایک ایک کو ایسے گھور کر دیکھتا تھا جیسے ساری زندگی میں اس نے کبھی عورت دیکھی نہ ہو۔"

"تمہیں بھی دیکھتا تھا۔" اسد شرارت سے مسکرایا۔

"ہاں۔" وہ اسی سادگی سے بولی۔ "مگر میں نے آگے سے منہ چڑا دیا تھا۔"

"دیوانی!" اسد بے اختیار ہنس دیا۔

"کیوں؟"

"تمہاری اس حرکت کے بعد تو وہ پھر تمہیں زیادہ دیکھتا ہو گا۔"

"اس کا مجھے علم نہیں۔ میں پھر اس کی طرف سے رُخ پھیر کر بیٹھ گئی تھی۔"

"خواہ مخواہ ہی پھیرا۔"

"کیوں؟"

"ذرا اسے جی بھر کر دیکھ لینے دیتیں۔ کیا پتہ تم اسے بہت ہی اچھی لگ گئی ہو۔" وہ مسکرا رہا تھا اور کنکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کیوں میں کیوں اچھی لگوں۔" وہ بڑے غصے سے بولی اور پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگی۔ "میں نے تو ابھی اپنے بھائی کو نہیں بتایا ورنہ وہ اسے مزہ چکھا دیتا اور اس کی ماں کو بھی جو ایک ایک لڑکی اسے دکھاتی پھر رہی تھی بھلا یہ بھی کوئی شریفوں کے ڈھنگ ہیں۔"

"بھئی آخر تو تمہارے بھائی نے تمہاری شادی کرنا ہی ہے۔"

اور ساتھ ہی پھر اس کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا سر جھکا کر دھیرے سے بولی۔

"لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جو بھی میرا رشتہ مانگے گا' خواہ وہ کوئی لفنگا بدمعاش ہی ہو۔ وہ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے گا۔"

"میں کیسا ہوں؟" جھک کر اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بہت ہی دھیرے سے اسد نے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"بھئی مطلب صاف ظاہر ہے میں تو لفنگا بدمعاش نہیں ہوں نا؟"

"میں نے کب کہا؟"

"تو پھر میری ماں اگر تمہارے بھائی کے پاس جائے تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا نا۔"

"آپ پتہ نہیں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟" اور وہ گھبرائی گھبرائی اٹھ کر اپنی دیوار پھلانگنے کے لئے چل دی۔

"سنو تو۔" اسد نے جلدی سے اٹھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ آج اس کی نگاہوں میں اور ہی کچھ تھا روز سے بہت ہی مختلف! اور صبا کو اس کے گذشتہ تجربات نے یہی سکھایا تھا کہ ہر کسی پر اعتبار نہیں کر لینا چاہیے اور کیا علم اسد کے دل میں کیا تھا۔ اس کی یہ گہری گہری نگاہیں!

"نہیں نہیں مجھے چھوڑ دیجئے۔"

"ارے! ہوا کیا؟" اسد نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں مجھے بس جانے دیجئے۔" وہ اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"یہ تمہیں ایک دم ہو کیا گیا ہے؟" اس کے بازو پر گرفت اور بھی سخت کرتے ہوئے وہ بڑی حیرت سے پوچھ رہا تھا۔

"چھوڑیئے بھی۔" صبا بڑی تلخی سے بولی۔ "یوں اکیلے میں کسی جوان لڑکی کا ہاتھ پکڑ لینا کہاں کی شرافت ہے!"

"اوہ!" وہ جلدی سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "تو تم مجھے ایسا سمجھتی ہو؟ تم جا سکتی ہو لیکن ایک بات سنتی جاؤ میرے دل میں کوئی برا خیال نہیں تھا۔" اس کے لہجے میں بڑا دکھ تھا "میں نے بہت شرافت سے تمہیں چاہا تھا اور سوچا تھا کہ تم سے ہی شادی کراؤں گا۔ لیکن تم تم مجھے اتنا ذلیل اور کمینہ سمجھتی ہو۔ یہ میں نہیں جانتا تھا۔"

صبا وہیں ٹھٹک گئی وہ سر کو ہاتھوں میں تھام کر بیٹھا جیسے اس سے اس کا سب کچھ چھن گیا تھا وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے ہوئے اس کے قریب آئی۔

"میری زندگی کے تجربات نے مجھے یہی سکھایا ہے۔ ویسے یقین کیجئے میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتی۔"

اسد نے سر اٹھا کر صبا کی آنکھوں میں جھانکا۔ "سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں۔" بڑی سنجیدگی سے اس نے سر ہلایا۔

"تو پھر میں اپنی ماں کو تمہارے بھائی کے پاس بھیجوں؟" اسد کے مایوس چہرے پر ایک دم آس کا رنگ پھیل گیا۔

"نہیں میں اس قابل نہیں۔" صبا بڑے کرب سے بولی۔

"کیوں۔ تمہیں کیا ہوا؟"

"میں بالکل جاہل اور آپ اتنے پڑھے لکھے اور پھر پھر۔" وہ چپ سی رہ گئی مزید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔

"ہاں ہاں کہو۔"

"کچھ نہیں کچھ نہیں۔ بس میں آپ کے قابل نہیں۔" ماں کی رسوائی جو اس کے ماتھے پر چسپاں تھی اور پھر اب خود وہ بھی اسی جرم کی مرتکب ہو چکی تھی۔ سب کچھ اس کے پیش نظر تھا۔ وہ تو سماج کی دوہری مجرم تھی۔ کیسے کسی شریف انسان کے قابل ہو سکتی تھی۔ اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں وہ باہر کی جانب لپکی۔

"ٹھہرو سنو۔" اسد کے لہجے میں التجا تھی وہ دروازے میں رک گئی۔ اسد اٹھ کر اس کے قریب چلا گیا۔ "مجھے کسی بات کی پروا نہیں تم کیسی بھی ہو۔ ہر حال میں مجھے منظور ہو۔" وہ ہاتھ بڑھا کر بڑے پیار سے اس کی پیشانی پر بکھری زلفیں پرے ہٹاتے ہوئے بولا۔

"سوچ لیجئے اچھی طرح" صبا نے سنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر بہت دھیرے سے بڑبڑائی۔ "ایسا نہ ہو آپ بھی عدنان بن جائیں۔"

اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

31

"صبا! ادھر آؤ۔"

"ابھی آئی ذرا آگ جلا لوں۔"

"وہ پھر جلا لینا پہلے میری ایک بات سن جاؤ۔"

"اچھا!" وہ سب کچھ وہیں چھوڑ کر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

"ارے! یہ کیا؟" وہ فخرو کے اردگرد مختلف قسم کا کپڑا پھیلا دیکھ کر حیرت سے چلا پڑی۔ "یہ کہاں سے آیا؟"

"میں لے کر آیا ہوں۔"

"کس لئے؟"

"اپنی صبا کے جہیز کے لئے!"

"اوہ بھیا! اتنے سارے پیسے کیوں خرچ کر دیئے۔"

"تجھے فکر کیوں پڑ گئی یہ لے تنخواہ پوری کی پوری۔" فخرو نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"اور یہ تو میں ان پیسوں کی لایا ہوں جو مجھے اوور ٹائم کے ملے ہیں اب اگلے مہینے تیرے لئے بڑا خوبصورت جھومر لاؤں گا۔" وہ بڑے پیار سے صبا کو دیکھ رہا تھا۔

"اوہ بھیا!" شرما کر صبا نے رخ پھیر لیا پھر ہولے ہولے بڑبڑانے لگی۔ "تمہارا یہ رات دن کام کرنا مجھے ذرا اچھا نہیں لگتا۔"

"صرف چند مہینے صبا! صرف چند مہینے۔ جب تیرا جہیز پورا ہو گیا تو پھر اوور ٹائم چھوڑ دوں گا۔"

"بھیا! تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ میں تا زندگی تمہارا احسان نہیں بھول سکوں گی۔"

"چپ پگلی! بھائی کا بہن پر کبھی احسان نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ تو میرا فرض ہے۔ اسے پورا نہ کیا تو خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔" پھر اس نے جلدی سے موضوع بدل دیا۔ "خیر چھوڑو ان باتوں کو میں نے تمہیں اس لئے بلایا تھا کہ اپنی خالہ سے ذرا گز مانگ کر لاؤ۔"

"کیوں؟"

"مجھے یہ دو ٹکڑے چھوٹے لگتے ہیں بزاز بے ایمانی کر گیا ہے۔"

"دکھاؤ تو۔"

"میں نے اسے کہا تھا دونوں چھ چھ گز اتار دے۔"

"صبا بازوؤں کے ساتھ ناپ ناپ کر اندازہ لگانے لگی۔

"پانچ یا ساڑھے پانچ گز سے زیادہ نہیں ہیں۔"

"اور قیمت اس نے چھ چھ گز کی لی ہے یہ قوم بھی بڑی بے ایمان ہوتی ہے۔ گز میں سے ایک آدھ گرہ کی تو ضرور ہیرا پھیری کر جاتے ہیں نجانے حرام کی کمائی کھانے سے انہیں کیا لذت ملتی ہے۔" فخرو بڑبڑاتے ہوئے صبا سے بولا۔ "جا تو ذرا بھاگ کر گز لے آ ایک بار ناپ کر دیکھ لوں اگر سچ مچ کم نکلے تو پھر اس کی خیر نہیں۔" پھر وہ باقی ٹکڑوں کو بھی اُٹھا اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ "ارے! تو ابھی تک گئی نہیں۔"

"جاتی ہوں بھیا!"

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل گئی وہ اب ادھر جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ اس وقت تو اسد بھی گھر ہی ہوگا۔ اس کا سامنا کرنے کی وہ اپنے میں بالکل ہمت نہیں پا رہی تھی۔ شریر تو تھا ہی ایسا نہ ہو ماں کے سامنے ہی کوئی بات کر بیٹھے۔ وہ دیوار کے قریب کھڑی سوچ رہی تھی اور آپ ہی آپ شرما رہی تھی۔

"ارے!" فخرو کی آواز آئی۔ "تو یہیں کھڑی ہے کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں بس جا رہی ہوں۔" اور وہ جلدی جلدی دیوار پر چڑھنے لگی۔

"ہمیشہ کی طرح خالہ کے ساتھ باتوں میں نہ مصروف ہو جانا مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"نہیں بھیا! بس دومنٹ میں آئی۔"

اور وہ بہت آہستہ سے دوسری طرف اتر گئی آہٹ کئے بغیر۔ بہت دھیرے دھیرے قدم رکھتی برآمدے میں پہنچی۔ اندر سے دونوں ماں بیٹے کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ ہچکچا کر وہیں رک گئی۔ بہتیری دعا مانگی تھی کہ اسد اس وقت گھر میں نہ ہو مگر قبول نہ ہوئی تھی کھڑکی کا کواڑ ذرا سا دھکیل کر اندر جھانکنے لگی۔

ماں ہمیشہ کی طرح سفید لباس میں بڑی باوقار دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی سلائیاں بن رہی تھیں اور ان کے گھٹنے پر سر رکھے اسد لیٹا ہوا تھا چہرے پر بڑی مسکراہٹیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ماں نے نجانے کیا کہا تھا وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا تھا اور اب اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب تھی۔

"اسد! یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔" اب وہ ذرا تیز آواز میں بولیں۔

"امی! میں نے بہت سوچنے کے بعد آپ سے بات کی تھی آپ کو بس یہی اعتراض ہے نا کہ وہ ایک غنڈے کی بہن ہے۔"

صبا نے اندر جانے کے لئے قدم بڑھائے تھے مگر وہیں ٹھٹک کر رہ گئی۔

"نہیں بیٹے! بھائی اگر غنڈہ ہے تو اس کا مطلب نہیں کہ بہن بھی ضرور ویسی ہی ہوگی۔ بہت لفنگے بدمعاش آدمیوں کی بہنیں میں نے انتہائی شریف دیکھی ہیں۔"

"پھر؟ پھر آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"وہ فخرو کی بہن نہیں ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بیٹے! اس کے حسب نسب کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ میں نے سنا ہے ایسی ہی کسی آوارہ پھرتی لڑکی کو گھر لے کر آیا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"دیکھو اسد! آگے نسل چلنی ہے۔ میں چاہتی ہوں تمہاری اولاد کی رگوں میں

شریف خون دوڑے...... اور اس کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کسی شریف والدین کی اولاد ہے یا یونہی بس ایسی ویسی ہی ہے۔"

"امی! زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے نا کہ کسی طوائف کی ناجائز اولاد ہوگی تو مجھے پھر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ البتہ آپ اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھ لیں کہ وہ کون ہے؟"

"پوچھ دیکھوں گی لیکن لیکن......" وہ خاموش سی ہو گئیں۔

"لیکن کیا؟" اسد بڑی بے تابی سے بولا۔

"محلے میں اور ہی بات مشہور ہے۔"

"کیا؟"

"فخرو ایک غنڈہ ہے اور یہ بہن کا ڈھونگ تو بس دنیا دکھاوے کو ہی رچایا ہوا ہے حقیقت کچھ اور ہی ہے۔"

"نہیں نہیں میں یقین نہیں کر سکتا! وہ بہت معصوم ہے۔"

"بظاہر معصوم دکھائی دینے والے انسان بعض وقت اندر سے بہت خطرناک ہوتے ہیں بیٹے!"

صبا نے بڑی مشکل سے حلق سے نکلنے والی چیخ ضبط کی...... اب اس میں مزید وہاں رُکنے کی تاب نہیں تھی۔ گز لئے بغیر لئے لئے سے قدم اٹھاتی ہوئی وہیں سے واپس ہو گئی...... آنکھوں کے آگے تاریکی چھا رہی تھی۔ ٹٹول ٹٹول کر دیوار چڑھنے لگی۔

"بہت دیر لگا دی گز لے آئی؟" فخرو آہٹ سن کر اندر سے ہی بولا۔ "کیا گز نہیں لائی؟" اسے چپ چاپ دروازے میں کھڑے دیکھا تو حیران سا رہ گیا۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی صرف سر کو نفی میں ہلا دیا۔ اور بکھرے ہوئے اپنے جہیز کے کپڑوں پر نگاہیں جما دیں جو فخرو خون پسینہ ایک کر کے اس کے لئے بنا رہا تھا۔ اپنی منہ بولی بہن کے لئے! اور یہ ظالم دنیا!! اس کا کیا خیال تھا۔

"یہ تیری آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں...... ہوا کیا؟" وہ بڑے تشویش بھرے انداز میں اسے دیکھتا ہوا اس کے پاس آ گیا۔

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔" وہ لڑکھڑا کر جلدی سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"کہیں گر تو نہیں گئی؟"

"گر ہی گئی ہوں بھیا!"

صبا نے کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"بہت چوٹیں آئی ہیں؟" وہ بے تاب ہو کر اس کے قریب زمین پر بیٹھ گیا اور جھک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"ہاں بہت!"

"کہاں؟"

"نہ جانے کہاں کہاں!"

"تو لیٹ جا۔" اس نے اسے چارپائی پر لٹا دیا۔ "میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔"

"نہیں بھیا! نہ جاؤ ڈاکٹر کی ضرورت نہیں۔" اور ساتھ ہی اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پھر وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ "ایسی چوٹیں تو میرا مقدر بن چکی ہیں اور تقدیر کے ساتھ کوئی ڈاکٹر نہیں لڑ سکتا میرے بھائی!"

"ڈاکٹر نہیں بلانے دیتیں تو پھر دودھ گرم کر کے دوں؟"

"نہیں نہیں۔ دودھ پینے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا۔"

"اچھا پھر سالن گرم کر کے لاتا ہوں کھانا کھائیں بھوک تو لگی ہی ہو گی۔"

"تم رہنے دو بھیا! میں گرم کرتی ہوں۔"

وہ اٹھنے لگی تو فخرو نے اسے کندھوں سے پکڑ کر پھر لٹا دیا۔

"نہیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں تو لیٹ۔ میں گرم کر کے ابھی یہیں لے آتا ہوں۔ پھر دونوں بہن بھائی ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کریں گے ساتھ کھانا کھائیں گے۔" وہ یوں اسے بہلانے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت چھوٹا سا بچہ تھی۔ کتنا مخلص اور معصوم دل تھا اس کے پاس! جسے دنیا غنڈہ کہتی تھی اور عجیب عجیب تہمتیں لگاتی تھی وہ سوچوں میں غرق ہو گئی۔

"آ بھئی صبا!"

وہ چونکی تو دیکھا سب کچھ لا کر فخرو نے رکھ دیا تھا۔

"بھیا!" نوالہ لیتے ہوئے صبا کچھ کھوئی کھوئی سی بولی۔ "کیا ایسی صورت نہیں کہ میری ماں ایک بار مجھے کہیں مل جائے۔"

"کیوں؟"

"بس جی چاہتا ہے۔"

"پھر بھی۔" وہ چپ بیٹھی رہی "کہیں پھر وہی انتقام کا سودا تو دماغ میں نہیں آ سمایا۔" ساتھ ہی وہ بڑے ناصحانہ انداز میں بولا۔ "دیکھ صبا! میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ ایسے خیالات دماغ سے نکال دے۔ اب تو کسی ایسی ویسی ماں کی بیٹی نہیں اب تو صرف میری بہن ہے' میری بہن!"

"میں تو بھول ہی چکی تھی بھیا! لیکن اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کس کس طرح سوچنے پر مجبور کر دی جاتی ہوں۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں بس ایک بار صرف ایک بار مجھے میری ماں سے ملا دو بھیا!" اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

"میرے بس میں ہوتا تو میں بہت پہلے ہی صبا! تمہیں اس سے ملا چکا ہوتا۔ کوئی اور خواہش کر میری بہن! تیرے بھائی فخرو کی زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد ہے کہ تو خوش رہے!"

"اوہ! لیکن میں تو اسے وہ سینکڑوں داغ دکھانا چاہتی تھی جو اس کی وجہ سے میرے دل پر پڑ چکے ہیں اور جن میں ہر روز ایک نہ ایک کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ بھیا! مجھے تب تک چین نہیں آئے گا۔ نہیں آئے گا۔"

"تُو تو پاگل ہوئی ہے۔ چل کھانا دھیان سے کھا۔" وقتی جوش سمجھتے ہوئے وہ بات کو ٹالنے کی کوشش کرنے لگا۔ "ارے! میں تو تمہیں آج کارخانے میں ہونے والا ایک

اتنا مزیدار واقعہ سنایا ہی نہیں۔’’

اور وہ ہنس ہنس کر کچھ سنانے لگا۔ صبا ہوں ہاں تو کرتی جا رہی تھی مگر سن کچھ نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن اسی طرف لگا ہوا تھا۔

32

‘‘صبا! مجھے ابھی ابھی گھر آتے ہوئے اسد ملا تھا۔ کہہ رہا تھا اس کی امی تمہیں بلا رہی ہیں۔’’

اس نے فخرو کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہی۔

‘‘صبا! سنی میری بات۔’’

‘‘ہاں۔’’

‘‘تو پھر جاؤ نا۔’’

‘‘مگر بھیا! تمہارا جو دوست آنے والا ہے۔’’

‘‘وہ آتا رہے گا تم جاؤ۔ کیا پتہ انہیں کوئی بہت ہی ضروری کام ہو۔’’

‘‘کھانا تو تیار کر لوں۔’’

‘‘وہ کھانا نہیں کھائے گا۔’’

‘‘لیکن ہم تو کھائیں گے نا۔’’ وہ صرف ٹال مٹول کر رہی تھی۔

‘‘وہ پھر بھی ہوتا رہے گا تم پہلے جاؤ۔’’ اور وہ باورچی خانے میں آ کھڑا ہوا۔

‘‘اسد کہہ رہا تھا کتنے دن ہو گئے تم ادھر نہیں گئیں۔ اس کی ماں تمہیں یاد کر رہی تھی کیوں نہیں گئیں؟’’

‘‘فرصت ہی نہیں ملی بھیا!’’ وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔

‘‘جب آپس میں اتنے اچھے تعلقات ہو جائیں تو پھر یوں بے پروائی نہیں برتنا

چاہیے۔ اُٹھ میری بہن ان کی بات سن آ۔’’ وہ بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ‘‘ابھی میرے پاس وہ آ جائے گا اور تو ادھر اکیلی بھلا کیا کرے گی۔ بہتر ہے اتنی دیر میں تو ان کے پاس سے ہو آ۔’’

وہ جانا نہیں چاہتی تھی لیکن فخرو کا کہا بھی ٹالا نہیں جا سکتا تھا وہ ذرا ذرا سی بات میں اس کا اتنا خیال رکھتا تھا تو صبا کیسے اس کی حکم عدولی کر سکتی تھی۔ آخر بادلِ ناخواستہ چلی ہی گئی۔

ان کے برآمدے میں لمحہ بھر کو رُکی۔ چہرے کے تاثرات ذرا سی ساختہ مسکراہٹ میں چھپائے اور کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔

‘‘خالہ کہاں ہیں؟’’

اسد کی دروازے کی سمت پشت تھی صبا کی آواز سن کر جلدی سے مڑا افسردہ چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔

‘‘اتنے دنوں سے کہاں تھیں؟’’ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے بڑی وارفتگی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

‘‘گھر میں ہی تھی۔’’

‘‘ادھر نہیں آئیں۔’’

‘‘کام بہت تھا۔’’ اور پھر جلدی سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ‘‘خالہ کہاں ہیں انہوں نے مجھے بلایا تھا۔’’

‘‘ہاں وہ باورچی خانے میں ہیں ابھی آتی ہیں۔’’ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔

‘‘میں وہیں جا کر پوچھ لیتی ہوں۔’’

‘‘یہ آج تم کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی بول رہی ہو۔ کیا بات ہے؟’’

‘‘کچھ نہیں۔’’

‘‘کیا میں ایک دم سے ہی بُرا لگنے لگ گیا ہوں؟’’

''نہیں تو آپ بھلا کیوں بُرے لگیں گے۔'' اور وہ باورچی خانے کی طرف چل دی۔

''سنو!''

وہ رک گئی...... اسد اس کے قریب چلا آیا...... چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بہت مدھم لہجے میں بولا۔ ''امی تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہیں اور صبا!'' پھر قدرے رک کر کہنے لگا ''میں نے بہت سوچا ہے مگر میرا دل کچھ اور مانتا ہی نہیں۔ وہ زندگی بھر کے لئے صرف تمہاری ہی رفاقت چاہتا ہے۔ میرے اس جذبے کی ناقدری نہ کرنا اور خدا کے لئے کسی نہ کسی طرح میری امی کو تسلی دینا میں منت کرتا ہوں۔''

اس کے لہجے میں ایسی التجا تھی کہ صبا الجھ کر رہ گئی۔ ورنہ وہ گھر سے یہ فیصلہ کر کے آئی تھی کہ اسد کی ماں کو خوب کھری کھری سنائے گی کہ بغیر آنکھوں سے دیکھے یوں کسی بے گناہ پر تہمت لگا دینا اچھی بات نہیں تھی۔ انہیں سب کچھ بتانے کے بعد صاف صاف جواب دے دے گی کہ جائیں اور اپنے بیٹے کے لئے کوئی شریف زادی ڈھونڈ لیں۔ اس کے پاس تو یہی بدنامیاں اور رسوائیاں تھیں۔ ان کی شرافت انہیں ہی مبارک رہے آئندہ وہ کبھی ان کے پاس نہیں آئے گی۔ لیکن یہ اسد! وہ کچھ بھی کہے بغیر سوچوں میں کھوئی جلدی سے باورچی خانے کی طرف مڑ گئی۔

''خالہ! آپ نے مجھے بلایا تھا کوئی کام ہے؟''

''کوئی خاص کام تو نہیں بیٹی! اتنے دن ہو گئے تم ادھر نہیں آئیں۔''

''پچھلے دنوں کچھ مصروف ہی بہت رہی ورنہ ضرور آتی۔''

''آؤ یہیں میرے پاس ہی بیٹھ جاؤ'' ان کے کہنے کے مطابق صبا بھی وہیں بیٹھ گئی وہ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ ''بیٹی! ایک بات پوچھوں؟'' باتوں کے دوران ایک دم وہ بڑی سنجیدہ ہو گئیں۔

''پوچھئے۔''

''وعدہ کرو جو پوچھوں گی سچ سچ بتاؤ گی۔''

''جی۔''

''یہ فخرو تمہارا سگا بھائی ہے؟''

''سگا ہی سمجھئے۔''

''تم نے وعدہ کیا ہے جو پوچھوں گی سچ سچ بتاؤ گی۔''

''اپنے والدین کا پیدا کیا ہوا ہی صرف حقیقی ہو سکتا ہے تو البتہ وہ نہیں ہے لیکن میری نگاہ میں وہ اس سے بھی زیادہ بلند درجہ رکھتا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''جب ایک ماں اپنے بطن سے پیدا کی ہوئی اولاد کو چھوڑ کر چل دے اور پھر کوئی غیر اس کا سہارا بن جائے تو بتائیے کسے حقیقی کہنا چاہیے۔ اس ماں کو یا اس سہارا دینے والے کو۔ بس ایسے ہی فخرو میرا حقیقی بھائی ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟'' وہ متحیری اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''تمہاری ماں تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی...... کب اور کیوں؟''

''یہ میں نہیں جانتی کب اور کہاں؟ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی۔''

''تو تمہارے دوسرے رشتہ دار تو ہوں گے ہی۔'' وہ اپنی ہنڈیا وغیرہ چھوڑ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔

''جب ماں ہی اپنی نہ بنی جس کا خون تھی پھر دوسروں سے کیا گلہ!''

''کیوں انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟''

''وہ کیا کر سکتے تھے؟ جو کرنا تھا وہ تو ماں کر گئی تھی۔ البتہ اس کا گناہ ہر وقت میری پیشانی پر چسپاں کر کے مجھے میری حیثیت کا احساس ضرور دلاتے رہتے تھے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے صبا کو دیکھ رہی تھیں۔

''والدین جو کچھ چھوڑ جائیں وہ اولاد کو ملتا ہے نا اور مجھے ماں سے ورثے میں اس کا گناہ مل گیا۔'' صبا کے ہونٹوں پر طنز بھرا تبسم پھیل رہا تھا لیکن آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''اور ماں کی اس وراثت نے میری ایسی زندگی سنواری کہ میں آج در بدر بھٹکتی پھر رہی

ہوں۔ جو کوئی مجھے سہارا دیتا ہے وہ میرے ساتھ گنہگار متصور ہونے لگتا ہے۔''

''تمہاری ماں اگر تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی تو تمہارا باپ تو ہوگا ہی۔ وہ کہاں ہے؟ کیا وہ تمہاری ڈھال نہیں بنا؟''

''وہ تو میں دو تین سال ہی کی تھی کہ کشمیر کے محاذ پر جنگ کرتا ہوا شہید ہو گیا۔''

اور صبا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''کیا؟ تمہارا باپ فوج میں تھا۔'' اسد کی ماں نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں۔''

''کیا نام تھا اس کا؟''

''ذوالفقار۔''

''اور تمہاری ماں کا نام۔'' اسد کی ماں کی آواز میں لرزش تھی۔

''نجمہ۔''

نجانے کیا ہوا۔ اسد کی ماں نے ایک دم پیچھے دیوار کے ساتھ پشت ٹیک دی۔ ان کا سارا وجود ہی ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

''تمہارے ساتھ دوسرے رشتہ داروں نے کیا کیا؟ کیا گھر سے نکال دیا تھا؟''

''نہیں انہوں نے نہیں نکالا میں خود ہی نکل آئی تھی۔''

''کیوں؟''

''اپنی زندگی کی تباہی کا انتقام لینے۔''

''کس سے؟''

''ماں سے!''

''ماں سے؟'' وہ بڑی حیرت سے ڈوبی ڈوبی آواز میں پوچھ رہی تھیں۔

''اس کی وجہ سے میں نے وہ دکھ سہے ہیں نا کہ آپ کو کیا بتاؤں اور اب مجھے اس سے نفرت ہے شدید نفرت!''

''مجھے تفصیل سے بتاؤ نا کہ تمہارے ساتھ کیا بیتی۔ میں سننے کو بیتاب ہوں۔''

صبا سناتی گئی اور ساتھ ساتھ اسد کی ماں کے آنسو بہتے رہے۔ وہ بہت ہی نرم دل کی تھیں۔ صبا کا دکھ انہیں بھی دکھی کر گیا۔

''اور خالہ!'' آخر میں صبا کی آنکھیں تو طوفان ہی لے آئیں۔ ''میں جانتی ہوں آپ نے آج مجھے کیوں بلایا ہے۔ صرف یہ جاننے کے لئے کہ میرا حسب نسب کیسا ہے۔ حسب نسب کچھ بھی ہو، میری ماں کا گناہ تو اسی طرح میری پیشانی پر جگمگا رہا ہے اور اس کے علاوہ اب تو میں خود بھی وہی جرم کر بیٹھی ہوں۔ میرے ساتھ اتنی بدنامیاں اور رسوائیاں ہیں کہ اگر میں قسم بھی کھاؤں کہ میں بالکل پاک صاف ہوں تو کوئی میرا یقین نہیں کرے گا۔''

اسد کی ماں بت کی طرح ساکت بیٹھی تھیں...... صبا اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''اس لئے میں خود ہی آپ سے کہے دیتی ہوں کہ اپنے بیٹے کے لئے کوئی شریف لڑکی ڈھونڈ لیجئے۔ میں تو ایسی ہی ہوں۔'' اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ اسد کی ماں نے اسے تکلفاً بھی نہیں روکا۔ نہ ایک لفظ ہی تسلی کا کہا بس چپ چاپ اسے جاتے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔

وہ باہر نکلی تو اسد سامنے ہی کھڑا تھا باہیں پھیلا کر اس نے اس کا راستہ روک لیا۔

''میں نے تمہاری ساری باتیں سن لی ہیں صبا! لیکن میرا ارادہ پھر بھی متزلزل نہیں ہوا۔''

''تمہارا ارادہ کیا کرے گا۔''

صبا نے بڑے طنز بھرے سنگین لہجے میں کہا۔ ''جا کر پہلے اپنی ماں سے پوچھو۔ وہ ہمدردی سے میرے لئے آنسو بہا سکتی ہے لیکن دیکھ لینا مجھے بہو بنانا کبھی گوارا نہیں کرے گی اور اس سے پہلے کہ میں دھتکاری جاؤں میں خود ہی انکار کرتی ہوں ہٹ جاؤ میرے راستے سے!''

وہ اس وقت بڑے جوش میں تھی اسے دھکیل کر پرے ہٹاتے ہوئے تیزی سے اپنے گھر بھاگ گئی۔

33

چند لمحے صحن میں کھڑے رہ کر اس نے سانس ہموار کی۔ رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے اچھی طرح صاف کیا اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اندر چلی گئی۔

نجانے کیا بات تھی گھر بھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید فخرو سو گیا تھا ادھر دیر بھی تو بہت لگا آئی تھی۔ دونوں کمروں کی بجلی جل رہی تھی...... ڈیوڑھی کی طرف نگاہ کی دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ یقیناً فخرو اس کے ساتھ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ ڈیوڑھی کا کھلا دروازہ دیکھ کر صبا نے یہی اندازہ لگایا۔

"یہ فخرو بھیا بھی بڑے ہی بے پرواہیں کیسے دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔"

اس نے بڑبڑاتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا۔

"ہائے! ہائے! پانی!"

"ہائیں! وہ وہیں ٹھٹک گئی یہ تو فخرو کی آواز تھی...... وہ بجلی کی سی سرعت سے لپک کر دوسرے کمرے میں پہنچی اور پھر ایک زلزلہ!

کمرے کے ننگے فرش پر فخرو چپ پڑا تھا اور اس کا سفید کرتا خون میں بھیگ کر سرخ ہو رہا تھا۔

"بھیا!" وہ ایک جھٹکے سے اس کے پاس جا پہنچی۔ "یہ کیا ہوا؟" ایک دم اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"پانی! صبا مجھے پانی کے دو گھونٹ پلا۔"

وہ بھاگی بھاگی پانی کا گلاس بھر لائی۔ ہاتھ پاؤں کیا اس کی تو ساری ہستی ہی لرز رہی تھی۔ جلدی جلدی کانپتے ہاتھوں سے فخرو کے منہ میں پانی ڈالنے لگی۔ جو کچھ حلق میں پڑا اور بہت سارا باہر بھی گر گیا۔

"بھیا! فخرو میرے بھیا! یہ کیا ہوا کچھ بتاؤ تو سہی؟"

صبا کے رخساروں پر آنسوؤں کی قطاریں بہہ رہی تھیں۔

"صبا! تو میری بہن ہے نا؟"

"ہاں ہاں بھیا! کیوں نہیں میں تمہاری بہن ہوں بالکل سگی بہن!" اور بے اختیار ہو کر اس سے لپٹ گئی۔

"میرے پیارے بھائی! میرے بھائی!! یہ آخر ہوا کیا؟" وہ کانپتے ہاتھ فخرو کے چہرے پر پھیر رہی تھی۔

"اس نے مجھے بہن کی گالی دی تھی صبا! ایک بہن کا بھائی ہوتے ہوئے یہ گالی میں کیسے سن سکتا تھا! مجھے غصہ آ گیا...... ہائے...... ہائے...... میں نے اسے گریبان سے پکڑ لیا لیکن...... لیکن اس کے پاس چاقو تھا...... اور...... میرے پاس کچھ نہیں تھا میں نے تیرے سامنے قسم جو کھائی تھی کہ اب شریفوں کی طرح زندگی گزاروں گا...... اس لئے...... اس لئے...... ہائے پانی......"

صبا نے جلدی سے دو گھونٹ پھر اس کے حلق میں انڈیلے۔

"بھیا! میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔"

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کر بھاگی۔

"صبا! صبا! ادھر آؤ۔ اب ڈاکٹر بلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ بس۔ میری ایک بات سن لے میں ابھی مرنا نہیں چاہتا...... تھا...... میں تیرے...... لئے...... زندہ رہنا...... چاہتا تھا...... مگر خدا...... کی مرضی...... میں تجھ سے بڑا...... شرمسار ہوں...... کہ اپنا وعدہ...... پورا نہ کر...... سکا مجھے معاف...... کر دے...... میری بہن!"

"بھیا بھیا!" وہ بے قرار ہو کر اس سے لپٹی جا رہی تھی "ایسے نہ کہو ایسے نہ کہو میری خاطر تو تم نے اپنی جان دے دی میں بہت بری ہوں کاش! میں یہاں آئی ہی نہ ہوتی۔"

"نہ صبا نہ...... یوں...... نہ کہہ...... یہی دن...... تو میری...... زندگی...... کا...... حاصل...... ہیں...... اب تو میری...... ایک بات...... مان......۔"

"کہو بھیا!"

فخرو کا سانس اکھڑ رہا تھا اور صبا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے تڑپ رہی تھی اور اس سے لپٹ رہی تھی۔

''صبا! میری پروا...... نہ کر...... اور تو...... یہاں سے...... چلی جا...... ورنہ یہ...... پولیس والے...... بڑے خراب...... ہوتے ہیں...... اور میری بہن! تو جوان...... ہے...... ایسا نہ ہو...... تو...... ان کے...... آہ...... صبا!...... چلی جا...... میری بہن...... میری بہن...... اٹھ...... اور اس...... سے پہلے...... کہ کوئی...... آ جائے...... تو...... یہاں...... سے...... ابھی...... بھاگ...... جا۔''

اور پھر فخرو کی گردن ڈھلک گئی۔

''بھیا!'' صبا جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی اس کے بے جان جسم سے لپٹ لپٹ کر رونے لگی۔ ''مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جاؤ بھیا! میں کہاں جاؤں گی میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔''

اور نجانے کتنی دیر وہ یونہی تڑپتی رہی۔ اسے جب ہوش آیا تو اس نے دیکھا فخرو کے بے جان سینے پر سر رکھے پڑی تھی جلدی سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اردگرد نگاہ دوڑائی وہ اکیلی تھی اور پاس فخرو کی لاش تھی۔ وہ بڑے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگی اس کے ہونٹوں پر اب بھی معصوم سے مسکراہٹ تھی۔

لوگ اسے غنڈہ' بدمعاش اور نجانے کیا کیا کہتے تھے مگر وہ تو ایک فرشتہ تھا۔ صبا کی نگاہوں میں اس کے لئے بے پناہ عقیدت تھی!

چند لمحے وہ یونہی بیٹھی اسے دیکھتی رہی پھر اسے فخرو کی وہ سب باتیں یاد آ گئیں جو اس نے سانس اُکھڑتے اُکھڑتے کہی تھیں کہ وہ جتنی جلد ہو سکے وہاں سے چلی جائے تا کہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ سکے۔ مرتے مرتے بھی اسے اسی کا خیال تھا اور اب اس کی وصیت پوری کرنا اس کا فرض تھا۔

وہ جلدی سے اٹھی ایسا سناٹا اور خاموشی تھی کہ وہ اپنے ہی پاؤں کی آہٹ سے چونک چونک رہی تھی ویسے بھی اندر ہی اندر خوف کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

دبے دبے مگر تیز تیز قدم اٹھاتی گھر سے باہر نکل گئی کہ ادھر سے نہ کوئی آ جائے

پیچھے سے نہ کوئی آ جائے۔ لمحہ بہ لمحہ خوف بڑھتا جا رہا تھا اور اب وہ بھاگ رہی تھی۔

دور کچھ فاصلے پر پانچ چھ شخص اپنی سمت آتے دکھائی دیئے سڑک کی بجلیاں روشن تو تھیں لیکن پھر بھی اتنی روشنی نہیں تھی کہ کافی فاصلے سے آنے والوں کو اچھی طرح دیکھ سکتی۔ اتنی دور سے تو ایسے ہی معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے وہ پولیس کے آدمی تھے۔ کچھ اسی قسم کی وردیاں پہنے تھے۔ کہیں پکڑی نہ جائے۔ ان کے قریب آنے سے پہلے سڑک پار کر کے اسے دوسرے فٹ پاتھ پر چلے جانا چاہیے تھا۔ یہ سوچ کر اس نے سڑک پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ موڑ پر سے مڑتی ہوئی ایک کار کی روشنی پڑی۔ رک کر کار گزرنے کا انتظار کرتی تو اتنی دیر میں انہوں نے قریب آ جانا تھا وہ اس سے پہلے بھاگ کر سڑک عبور کر سکتی تھی۔

یہ اندازہ لگایا اور بڑی تیزی سے بھاگی۔ کار کے ہارن کی آواز نے اسے بوکھلا دیا وہ لڑکھڑائی...... بریک لگنے کی بڑی تیز آواز کے ساتھ اسے زور کا دھکا لگا وہ گر پڑی اور پھر اسے ہوش نہ رہا۔

34

ڈھولک پیٹ پیٹ کر ہاتھ دکھنے لگے تھے گا گا کر گلے بیٹھ گئے تھے مگر پھر بھی ارادے متزلزل نہیں ہوئے تھے۔ ساری رات جاگ کر' ڈھولک بجا کر اور گا کر ہی گزارنا تھی بھلا ایسی خوشی کی راتیں' روز روز تھوڑا آتی ہیں!

دلھن جمائیوں پر جمائیاں لے رہی تھی۔ ہونٹوں پر خاموشی کے قفل پڑے تھے۔ مسکراہٹ ایسے غائب تھی جیسے زندگی میں کبھی خوش نصیب ہی نہ ہوئی تھی۔ سہیلیوں کی چھیڑ چھاڑ بھی کچھ نہیں کر رہی تھی۔ شائد بہت تھک گئی تھی۔

''آپا! آیئے آپ تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ ہم تو آج رتجگا منائیں گی۔ کل سارا دن بھی آپ نے یونہی بیٹھے رہنا ہے۔ بہت زیادہ تھکان ہو جائے گی۔''

چھوٹی بہن نجمہ کو بڑی بہن آمنہ سے بے پناہ محبت تھی۔اس کے چہرے کی تھکن گویا نجمہ کے دل میں اتری جا رہی تھی۔آمنہ چپ چاپ اٹھ کر چھوٹی بہن کے ساتھ چل دی۔منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

''آپا! کیا بات ہے آپ بہت خاموش ہیں۔'' اس نے بڑے فکر سے بہن کے چہرے کو دیکھا جو کچھ زرد سا ہو رہا تھا۔

''نہیں۔نہیں۔ویسے ہی بس تھک گئی ہوں۔''

''پھر آپ سو جائیں دو تین گھنٹے آرام کر لینے سے تھکان دور ہو جائے گی۔'' اسے بستر میں لٹا کر نجمہ نے اوپر اچھی طرح کمبل اوڑھا دیا آہستہ قدموں سے چل کر دروازہ بند کیا اور خود پھر وہیں جا پہنچی۔ جہاں قہقہے تھے' ڈھولک' گانا اور چھیڑ چھاڑ تھی۔اور پھر یونہی ساری رات بیت گئی۔انگ انگ ٹوٹ رہے تھے' عضو عضو دکھ رہا تھا مگر آج تو سارا دن کام کا تھا۔

بڑی بوڑھیوں نے صبح ہوتے ہی شور مچا دیا کہ براتیوں کے لئے جگہ وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔بیچاری تھکی ہوئی لڑکیاں پھر کام پر لگا دی گئیں مگر وہ پھر بھی خوش تھیں۔

باہر سے مردوں کا شور سنائی دیا۔

''برات آنے والی ہے۔جلدی جلدی کرو۔''

''اے لڑکیو! سب ادھر ہی لگی ہوئی ہو کچھ جا کر دلھن کو بھی تیار کریں۔''

دلھن کو سجانے سنوارنے کا کام شاید سب کو ہی دلچسپ لگا۔سب ہی آگے پیچھے دلھن کے کمرے کی طرف بھاگ پڑیں۔دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ تو اندر سے بند تھا۔

کھٹ.....کھٹ.....کھٹ کئی ہاتھ ایک دم دروازہ کھٹکھٹانے کو بڑھے۔کتنی ہی بار دروازہ کھٹکھٹایا گیا مگر اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔نجمہ سب کو پرے ہٹاتے ہوئے خود آگے بڑھی۔

''آپا! آپا!''

جواب میں خاموشی اور اب اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''ابا! ابا جی!!'' اسے نہ دوپٹے کا ہوش تھا نہ اپنا۔اسی طرح باہر بھاگ گئی۔''ابا

جی! پتہ نہیں آپا کو کیا ہو گیا ہے دروازہ بند ہے اور وہ بول ہی نہیں رہیں۔''

باپ بھاگا بھاگا اندر آیا۔کچھ دیر وہ دروازہ کھٹکھٹاتا رہا۔

''آمنہ! آمنہ بیٹی!!''

نجمہ کے آنسو اب رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

آخر دروازہ توڑ ڈالا گیا۔ہجوم کا ہجوم ایک دوسرے کو دھکے دیتا ہوا اندر جا گھسا۔مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا ہر جگہ دیکھ ڈالا۔دلھن غائب تھی۔پچھلی سمت والی کھلی کھڑکی نے راز کھول دیا سب ہی ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

دور سے بینڈ کی آواز آنے لگی۔''برات آ گئی برات آ گئی۔'' شور مچ گیا بوڑھے باپ کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے وہ وہیں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''اب کیا ہو گا اب کیا ہو گا؟''

ہر ایک دوسرے سے یہی پوچھ رہا تھا۔کچھ زبانی اور کچھ نگاہوں ہی نگاہوں میں۔

''ہائے ہائے! کیسی بے حیا نکلی۔''

''شرع شریعت میں آیا ہے کہ لڑکی کی رضا مندی لے کر اس کی شادی کرنی چاہیے زبردستی کا یہ انجام ہونا تھا نا۔''

''نہ جانے کس کے ساتھ منہ کالا کر گئی۔''

ارد گرد کھسر پھسر ہونے لگی جتنے منہ اتنی باتیں

براتنیں جگمگ جگمگ کرتے زیور کپڑے پہنے چھم چھم کرتیں' ہنستی کھلکھلاتی چلی آ رہی تھیں۔باپ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سب کو خاموش رہنے کی التجا کی اور خود جلدی سے اٹھ کر مردوں کو ساتھ لے برات کی پیشوائی کو چل دیا۔

براتیوں کو بڑی عزت واحترام سے بٹھانے کے بعد پھر زنانہ میں آیا اور دولھا کی ماں کو الگ کمرے میں لے جا کر اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

''میں تم سے عزت کی بھیک مانگتا ہوں بہن! برات خالی لوٹ جائے اس میں میری بے عزتی ہے میں اپنی دوسری لڑکی تمہیں دیتا ہوں تم اپنے لڑکے کے ساتھ اسے بیاہ

کر لے جاؤ۔''

بوڑھے باپ کے آنسوؤں پر دولھا کی ماں کو رحم آ گیا اور پھر نجمہ کو ڈولی میں ڈال دیا گیا۔

وہ اپنے ہوش وحواس میں نہ تھی اسے رہ رہ کر بہن کا خیال آئے جا رہا تھا۔ سوچوں میں کھوئی ہوئی نجانے کب کہاں سے کہاں پہنچا دی گئی تھی اسے جب ہوش آیا تو وہ ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے چلی آئی تھی۔ عجیب تیکھی ترچھی نگاہیں اس پر پڑ رہی تھیں۔

کچھ بھی ہو اب تو یہیں اس نے زندگی گزارنا تھی۔ ساس خاوند کی خدمت میں اس نے اپنا تن من بھلا دیا۔ وقت گزرنے لگا۔

اور پھر ایک دن وہ ساس کے ساتھ کسی ملنے والوں کے ہاں شادی پر گئی ہوئی تھی کہ وہاں اس نے اپنی بہن کو دیکھا۔ اس کا دل درد اور دکھ سے بھر آیا۔ وہ ایک ملازمہ کی حیثیت سے وہاں کام کرتی پھر رہی تھی۔

''اوہ آپا! یہ کیا؟'' ساس کی نظر بچا کر وہ اسے دوسری طرف لے گئی۔

آمنہ نے روتے ہوئے چھوٹی بہن کو بتایا کہ جس کی محبت کی خاطر اس نے اپنے باپ کی عزت کو اس بیدردی سے پاؤں تلے روند ڈالا تھا وہ بے وفا نکلا۔ شادی کے دو سال بعد ہی وہ اسے اور اس کے ایک سالہ بچے کو چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

باپ کے گھر میں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے تو دروازے اس نے خود ہی اپنے لئے بند کر لئے تھے۔ اور اب وہ یوں گھر گھر کی نوکری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پال رہی تھی۔ بہن کو اپنا دکھ سناتے سناتے اسے بڑے زور کی کھانسی اٹھی نجمہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں بس ایسے ہی چند دنوں سے طبیعت خراب سی رہتی ہے۔''

''اوہ......!'' نجمہ بڑے فکر سے بہن کو دیکھنے لگی۔

شادی پر لوگ خوشی خوشی واپس آتے ہیں مگر وہ دل میں دکھ درد سمیٹے گھر لوٹ آئی۔ اس کی بہن جو اسے اتنی پیاری تھی اس برے حال میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ نجمہ بڑی

پریشان تھی۔ ہر لمحہ بہن کی حالت زار نگاہوں میں پھرتی رہتی۔ کچھ دن تو یونہی کھوئی کھوئی اور چپ چپ رہی پھر گھر کے کاموں میں دل لگانے کی کوشش بھی کی مگر کسی طرح قرار نہ سکی۔ آخر سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ بنا کر بہن کے بتائے ہوئے پتہ پر جا ہی پہنچی۔

کتنا گندا علاقہ تھا اور کیسی ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑیاں تھیں۔ اس کی کوٹھڑی کے اندر قدم رکھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا۔ اتنے عیش و آرام میں پلنے والی ایسی جگہ رہ رہی تھی بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

پھر وہ ہر دوسرے تیسرے روز اس کے پاس جانے لگی۔ کبھی کہیں جانے کا بہانہ بنا لیتی اور کبھی کہیں۔ ساس نند کی نگاہوں میں شکوک ابھرنے لگے مگر وہ بہن کو اس حال میں تن تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ آمنہ کی بیماری روز بروز بڑھ رہی تھی اب تو وہ جہاں کام کرتی تھی انہوں نے بھی اسے نکال دیا تھا۔

جس طرح بھی ہو سکتا چوری چھپے نجمہ ہی بہن کی کفالت کر رہی تھی۔ ماں بچپن کی مر چکی تھی بھائی کوئی تھا ہی نہیں اور باپ اسی بیٹی کے غم میں سدھار چکا تھا۔ بس یہی دونوں ایک دوسرے کی غمگسار تھیں اور نجمہ بھی اگر بہن سے منہ موڑ لیتی تو اس کے ضمیر نے گوارا نہ کیا۔ جہاں تک ممکن ہو سکا وہ بہن کا ساتھ دے گی!

ساس نند اور خاوند کو بتا نہ سکتی تھی۔ ان سب کی نگاہوں میں تو آمنہ کا گناہ قابل عفو و درگزر تھا ہی نہیں۔ انہیں علم ہو جاتا کہ نجمہ اس کے پاس جاتی تھی تو انہوں نے تو نجمہ کو گھر سے قدم نہیں نکالنے دینا تھا۔ چنانچہ وہ ساس نند کی نگاہوں میں ابھرنے والے شکوک کو نظرانداز کرنے پر مجبور ہوگئی اور کوئی بھی تو راستہ نہیں تھا۔

دو دن ہو گئے تھے، وہ آمنہ کے پاس نہیں گئی تھی اس کی بچی کو بخار تھا۔ رات کو سوئی تو خواب میں بہن کو تڑپتے ہوئے دیکھا۔ دن چڑھتے ہی بے قرار ہو کر چل پڑی۔ ساس نند نے نگاہوں میں ایک دوسرے سے کہا مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اس کے دل کو قرار نہیں آ رہا تھا۔

آمنہ کے ہاں پہنچی تو واقعی اسے بڑے برے حال میں پایا۔ دو دن سے نہ اس

نے دوا پی تھی اور نہ ہی کچھ کھایا تھا۔ کمزور جو بے حد ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل سے بل کر صرف اتنا ہی کر سکتی تھی کہ بچے کو کچھ کھلا پلا دے۔ وہ بھی صرف ماما کا جوش ہی تھا جو اتنی بھی ہمت کر لیتی تھی ورنہ اس میں تو اتنی طاقت نہیں تھی کہ کروٹ ہی اپنے آپ بدل لیتی۔

بہن کو اس حال میں دیکھ کر نجمہ بے تاب ہو اٹھی۔ بھاگی بھاگی گئی اور ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے آ کر اچھی طرح معائنہ کیا۔ منہ سے کچھ نہیں کہا بس دوا دے کر چلا گیا۔ لیکن اس کے چہرے پر کچھ ایسی تشویش تھی کہ نجمہ اور بھی پریشان ہو گئی۔

آمنہ خون تھوکتی رہی تھی۔ سارے کمرے کا فرش خراب ہو رہا تھا۔ چھوٹا بچہ تھا کہیں اسے چھوت نہ لگ جائے...... نجمہ کمرے کی صفائی کرنے لگی اس سے فارغ ہونے کے بعد بہن اور بچے کے لئے کچھ پکایا۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ پیچھے بھی دھیان لگا ہوا تھا۔ بچی کی تو خیر کوئی بات نہیں تھی دادی بڑے شوق اور پیار سے اسے سنبھالا کرتی البتہ یہ خیال ضرور تھا کہ نند اور ساس کوئی ایسے ویسے شک نہ کریں۔

بہن کو کچھ تھوڑا سا کھلایا، دوا پلائی، بچہ بڑا گندہ ہو رہا تھا اسے نہلایا اور صاف ستھرے کپڑے پہنا کر سلا دیا۔ بہن کا بھی منہ ہاتھ دھلا کر صاف کپڑے پہنائے تھے وہ بھی قدرے سکون سے لیٹ گئی تھی سوچا اب ذرا جا کر گھر کی بھی خبر لے۔

گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ نند نے بلند آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ خاموش کھڑی سنتی رہی اور آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ اور تو اور اسے بہن کے طعنے دیئے گئے جو اس وقت بستر مرگ پر پڑی تھی۔ نجمہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ایک لفظ اپنی صفائی کا نہ پیش کر سکی۔ بس دل مسوس کر رہ گئی۔

"اب کہیں جانے کا نام لے تو سہی۔" ساس بولی۔ "پھر دیکھ کیا ہوتا ہے۔ وہ تیرا باپ ہی تھا جس نے بے عزتی کروائی تھی میں تو تیری ٹانگیں توڑ ڈالوں گی۔"

وہ خاموشی سے گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی۔ شام ہوئی اور پھر رات آ گئی۔ سب سو چکے تھے مگر اسے چین نہیں آ رہا تھا۔ نجانے بہن کا کیا حال ہو گا کہیں اس کی تکلیف بڑھ نہ گئی ہو۔ یہی خیالات اسے پریشان کئے دے رہے تھے اور اسے نیند نہیں آ

رہی تھی۔ اب تو اسے کہیں جانے کی اجازت بھی نہیں ملنا تھی۔ پھر بہن کا حال کس طرح معلوم کرے گی پھر اسے کوئی اور پوچھنے والا بھی تو نہ تھا۔

بستر پر پڑی بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی تھی۔ ایک لمحے کو بہن کا خیال ذہن سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ آخر نہ رہ سکی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بچی بڑے آرام سے سو رہی تھی۔ ساس اور نند کمرے میں سوئی ہوئی تھیں اور خاوند کتنے مہینوں سے کشمیر کے محاذ پر گیا ہوا تھا۔ سوچا ایک آدھ گھنٹے میں بہن کو دیکھ کر آ جائے گی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا چادر لپیٹ بجلی جلائے بغیر دبے دبے پاؤں اٹھ کر چل دی۔

اس کی تڑپ اور بے چینی ٹھیک ہی تھی۔ آمنہ پر نزع کا عالم طاری تھا۔ وہ تو جیسے بہن ہی کی منتظر تھی۔ اسے دیکھتے ہی قریب بلایا اور اکھڑے اکھڑے سانسوں میں کہنے لگی۔ "نجمی! خدا کے بعد میں اسد کو تمہارے سپرد کرتی ہوں تم اپنی اولاد سمجھ کر اسے پالنا۔ میں تمہاری اولاد کا واسطہ تمہیں دیتی ہوں کہ اسے یہ کبھی علم نہ ہونے دینا کہ تو اس کی ماں نہیں ہے۔" اور پھر اس نے چھوٹی بہن کے آگے اپنے لرزتے کانپتے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"آپا!" روتی ہوئی نجمہ نے بہن کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔

"آپ فکر نہ کریں اسد کو ہمیشہ میں اپنا بیٹا ہی سمجھوں گی۔"

"اور نجمی ایک بات اور" ساتھ ہی آمنہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔

"اپنے سسرال میں کسی کو یہ نہ بتانا کہ اسد میرا بچہ ہے ورنہ نجمی! اس پر انگلیاں اٹھیں گی میرے ماضی کو سب جانتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شک کرے کہ یہ ناجائز اولاد ہے اور پھر اسے طعنے ملیں۔ اس طرح اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔" باتیں کرتے کرتے اسے پھر بڑے زور کی کھانسی اٹھی۔

"ٹھہریئے آپا! میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

"نہیں نجمی نہیں اب اتنا وقت نہیں مجھے پانی پلا دو۔"

نجمہ نے جلدی سے چند قطرے بہن کے حلق میں ٹپکائے......

"اوہ نجمی میری بہن! کسی طرح مجھے یقین دلا دو کہ میرے اسد کو ماں مل جائے

گی۔ مامتا بری بلا ہے نجمی! مجھے قرار نہیں آ رہا۔'' آمنہ تڑپ تڑپ کر سر کو تکیے پر رگڑ رہی تھی اور اس کی تڑپ نے نجمہ کو بے اختیار کر دیا۔

''آپا! میں اپنی بچی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اسد کو اپنے سینے سے لگا کر پالوں گی اسے کبھی یہ معلوم نہیں ہونے دوں گی کہ اس کی ماں نہیں ہے..... میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں اس کی ماں بنوں گی۔''

''اوہ نجمی! بس! بس مجھے یقین آ گیا تم نے قسم ایسی کھائی ہے جو کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ اب میں چین سے مر سکوں گی۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں۔'' آمنہ کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔

''نجمی! نجمی اسد کو میرے قریب.....''

اس کی بات ابھی ادھوری ہی تھی مگر نجمہ سمجھ گئی تھی۔ بھاگ کر سوئے ہوئے بچے کو بازوؤں میں اٹھا اس کے پاس لے آئی۔ ''یہ لو آپا! یہ دیکھو تمہارا اسد تمہارے پاس آیا ہے۔''

''اوہ! مجھے کچھ دکھائی .....نہیں دے رہا نجمی! میرا ہاتھ.....اسد۔''

نجمہ نے جلدی سے بہن کا ہاتھ پکڑ کر بچے کے چہرے اور جسم پر پھیرا۔

''ہاں اب یہ تمہارا ہے نجمی اسد تمہارا.....''

اور پھر آمنہ کی سانسیں ختم ہو گئیں۔

نجمہ کو کچھ ہوش نہ تھا اس کی اتنی پیاری بہن اسے داغ مفارقت دے گئی تھی۔ وہ بچے کو سینے سے لگائے تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا مگر اسے صبر کرنا پڑا۔ بہن کی تجہیز و تکفین کا بندوبست بھی تو اسی نے کرنا تھا۔ محلے کی عورتوں اور مردوں کو بلا لیا ایسے وقت میں دشمن بھی اپنی دشمنی بھول ہمدردی اور مدد کو آ پہنچتے ہیں اور آمنہ تو تھی ہی ایسے بے ضرری کہ کبھی کسی سے کوئی لین دین رکھا ہی نہ تھا۔ کام سے آتی تو چپ چاپ بچے کو لئے کوٹھری میں پڑی رہتی۔

بہن کی تجہیز و تکفین سے نجمہ جب فارغ ہوئی تو اسے گھر سے نکلے ہوئے بیس

بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب کیا کرے؟ وہ پریشان ہو گئی۔ نجانے ساس نند اس کے متعلق کیا سوچ رہی ہوں گی کہ یوں چوری چوری رات کے وقت کہاں چلی گئی۔ اب تک تو اس کے خاوند کو بھی اطلاع پہنچا دی گئی ہو گی اب کیا ہو؟

وہ بہن کے روتے ہوئے بچے کو گود میں لئے بہلا رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ان سب کو اپنی اس غیر حاضری کے متعلق کیا بتائے گی اور اس بچے کے متعلق کیا کہے گی کہ کس کا تھا پھر کیا کہے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

بفرض محال اگر اسے کسی سہیلی وغیرہ کا بتا کر لے بھی جائے تو بہن سے کیا ہوا وعدہ کہ اسے کبھی معلوم نہ ہونے دے گی کہ اس کی ماں نہیں تھی، خود اس کی ماں بنے گی' اس گھر میں رہ کر پورا نہ ہو سکتا تھا ایک تو ساس نند ہی ایسی طبیعت کی تھیں کہ خاموش نہ رہ سکتی تھیں دوسرے نند کے بچے تھے۔ کبھی کسی نے اسد کو کہہ دیا کہ نجمہ اس کی ماں نہیں تھی تو۔ تو پھر؟ ہائے کس مشکل میں آ پڑی تھی سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بہن کی وصیت تو صرف اسی صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ وہ بچے کو لے کر کسی ایسی جگہ چلی جائے جہاں کوئی اور اسے اور بچے کو نہ جانتا ہو۔ لیکن لیکن اس کا گھر اس کا خاوند۔ اس کی اپنی چھوٹی سی بچی۔ کیا وہ اسے چھوڑ سکے گی مامتا تڑپ اٹھی۔

''نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ بے اختیار ہو کر چلا پڑی اور پھر آخر مامتا بہن کے جذبے پر غالب آ گئی..... بچہ رو رو کر سو چکا تھا اسے گود میں اٹھایا اور اپنے گھر جانے کی ٹھان لی۔ کچھ بھی ہو ساس نند کچھ بھی کہیں اسے اپنے گھر اپنی بچی کے پاس جانا تھا۔ وہ چادر لپیٹ کوٹھری سے باہر نکلی۔

''میری بہن کسی طرح مجھے یقین دلا دو کہ میرے اسد کو ماں مل جائے گی۔''

''آپا! میں اپنی بچی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اسد کو اپنے سینے سے لگا کر پالوں گی اسے کبھی یہ معلوم نہیں ہونے دوں گی کہ اس کی ماں نہیں ہے۔''

اس کی نگاہوں میں بہن کا مرنے کا نظارہ گھوم گیا اور کانوں میں اس کی اکھڑی اکھڑی سانسوں کے درمیان کہے گئے الفاظ گونجنے لگے۔ وہ وہیں ٹھٹک گئی اس کے گھر میں

تو یہ راز نہیں رہ سکے گا۔ کبھی نہ کبھی اسد کو معلوم ہو ہی جائے گا کہ اس کی ماں نہیں۔ پھر پھر کیا کرے اس نے تو اپنی بچی کی قسم کھائی تھی۔

''اوہ! یہ میں نے کیا کیا؟'' وہ بے اختیار ہو کر رو پڑی ''اب کیا کروں؟'' واپس کوٹھری میں جا کر بیٹھ گئی اور پھر سوچنے لگی آخر بہت سوچ بچار کے بعد وہ یہی فیصلہ کر سکی کہ اپنی قسم اور بہن کی وصیت پوری کرنے کی خاطر اسے اسد کو لے کر اس گھر سے اس شہر سے دور چلے جانا ہوگا جہاں کوئی ان کے ماضی کو نہ جانتا ہو۔ کلیجہ کٹ رہا تھا مگر اسے سینے پر صبر کی سل رکھنا پڑی اور وہ اسد کو لے کر لاہور چلی گئی۔

ایک دو چھوٹے چھوٹے زیور پہنے تھی چند دن تو ان سے کام چلایا ساتھ ساتھ اپنے لئے کوئی دھندا تلاش کرتی رہی۔ قسمت نے ساتھ دیا ایک سلائی والے سکول میں اچھی جگہ مل گئی۔

بچہ بہت چھوٹا تھا جلد ہی اپنا ماں کو بھول نجمہ کو ماں سمجھنے لگا۔ نجمہ اس کی پرورش کر رہی تھی مگر ہر لمحہ ہر ساعت اس کے ذہن میں اپنی بچھڑی ہوئی بچی کا خیال رہتا۔ دل ہی دل میں ایک امید سی لگی ہوئی تھی کہ زندگی میں شاید کبھی اس سے ملاقات ہو جائے اور اسی انتظار میں اب وہ جی رہی تھی۔

آخر کئی سالوں کے بعد اس کی وہ آس پوری ہو تو گئی مگر عجب انداز میں! نجمہ کو اس کی لڑکی ملی لیکن اس کے دل میں ماں کے لئے نفرت ہی نفرت تھی...... نجمہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی یہ قربانی اس کی بیٹی کی زندگی کی راہوں میں بیشمار کانٹے بکھیر دے گی جن سے اس کے پاؤں زخمی ہو جائیں گے وہ یہ صدمہ سہار نہ سکی بیمار پڑ گئی۔

''اور بیٹی کے پاؤں کے زخم اسد بیٹے! میرے دل میں اتر گئے۔'' وہ سسک رہی تھی۔

اسد بیمار نجمہ کے سینے پر سر رکھ کر بے اختیار رو دیا۔ ''امی! میری امی! اتنا بڑا ایثار! آپ نے میری خاطر اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا۔ اور اب میں آپ سے آپ کی بچی کو ملواؤں گا۔''

''نہیں اسد نہیں۔ اسے مجھ سے نفرت ہے۔'' وہ بڑے ہی دکھ سے بلکی۔

''نہیں امی! آپ تو قابل پرستش ہیں دیکھ لیجئے گا اسے جب صحیح حالات کا علم ہو گا تو وہ کبھی آپ سے نفرت نہیں کرے گی۔''

''سچ اسد؟'' نجمہ بڑے جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''تو پھر میرے لال! ایک بار اسے میرے پاس بلا دو میں مرنے سے پہلے ایک بار اسے سینے سے لگا کر برسوں کی جدائی کی اس آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتی ہوں۔ اسے بلا دو اسد بیٹے!''

''امی! بس آج کل میں ہی وہ آپ کے پاس آ جائے گی۔''

''آج کل میں نہیں ابھی بیٹے ابھی جا کر اسے بلا لاؤ اٹھو بھی۔''

اس کی تڑپ اور بے قراری اسد سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ''اچھا امی! ابھی بلاتا ہوں۔'' وہ اٹھ کر باہر چلا گیا اب کیا کرے؟ پریشانی کے مارے اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا، سوچوں میں کھویا جا کر دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا۔

پانچ چھ دن ہو چکے تھے جس وقت صبا اس کی ماں کے پاس سے ہو کر گئی تھی اسے اختلاج قلب کے دورے پڑ رہے تھے اور اسد اپنی سدھ بدھ کھوئے اس کی تیمارداری میں مصروف تھا۔ اسے ماں سے بے حد پیار تھا۔ بے قرار ہو کر روز کا ایک ڈاکٹر بدل رہا تھا۔ اور ہر ڈاکٹر نے یہی تشخیص کی تھی کہ کوئی بہت بڑا صدمہ پہنچا تھا جب تک اس کا کوئی مداوا نہیں کیا جائے گا کوئی علاج کارگر نہیں ہو سکے گا مگر ماں کچھ بتا ہی نہیں رہی تھی اور آخر اسد نے قسمیں دے دے کر بڑی مشکل سے وہ راز اگلوایا تھا جس نے اسے بستر پر ڈال دیا تھا۔

اور اب اس کی خواہش، جس نے اس کی خاطر اپنی ہر خوشی قربان کر دی تھی اسد پوری کرنا چاہتا تھا مگر صبا کو کہاں سے لائے؟

دوسرے ہی دن فخرو کے قاتل نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا اور فخرو کے گھر سے اس کی لاش برآمد کر لی گئی تھی لیکن صبا لاپتہ تھی۔ یہ سب کچھ تو پڑوسن نے اسے بتایا تھا جو اس کی ماں کی بیماری کا سن کر عیادت کو آئی تھی ورنہ وہ خود تو جب سے ماں بیمار پڑی تھی، گویا دنیا سے کٹ کر رہ گیا تھا۔ اب کہاں سے اسے ڈھونڈ کر لائے جو ماں کی خواہش پوری ہو۔ کتنی ہی دیر وہاں کھڑا پریشان ہو ہو کر سوچتا رہا آخر بے بس سا ہو کر پھر ماں کے

پاس واپس آیا اس کے بغیر بھی تو قرار نہیں آ رہا تھا۔

''اسد بیٹے! بلایا اسے؟'' اسے دیکھتے ہی نجمہ بے تابی سے بولی۔

''ہاں امی! وہ گھر کے کام سے فارغ ہو کر ابھی آتی ہے۔'' ماں کو بہلانے کے لئے وہ جھوٹ بولنے پر مجبور ہو گیا۔

''اسد ادھر آؤ میرے پاس۔'' نجمہ بڑے غور سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی وہ پلنگ کے پاس فرش پر ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔

''جی امی!''

''بیٹے! تم کچھ خاموش خاموش ہو یہ سب میں تمہیں بتانا نہیں چاہتی تھی تمہاری ماں سے وعدہ جو کیا تھا۔ مگر تم نے اپنی قسم دے کر مجھے سب کچھ بتانے پر مجبور کر دیا ہے میرے لال! اب تم اپنی ماں کا غم نہ کرنا' ورنہ حشر کے روز میں آپا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔''

''نہیں نہیں امی! آپ نے میری خاموشی کو غلط سمجھا ہے میں تو اب بھی آپ ہی کو ماں سمجھتا ہوں پھر غم کاہے کا۔ البتہ آپ جلدی جلدی اچھی ہو جائیں پھر مجھے کوئی فکر کوئی پریشانی نہیں رہے گی۔''

''بیٹے! میں اچھی ہو جاؤں گی ضرور ہو جاؤں گی بس ایک بار مجھے یہ تسلی ہو جائے کہ صبا نے مجھے معاف کر دیا ہے اور اسے مجھ سے نفرت نہیں ہے۔''

''یہ آپ یقین رکھیں کہ اب انشاء اللہ وہ آپ کے پاس آئے گی تو اس کے دل میں آپ کے لئے نفرت کی بجائے پیار اور عزت ہو گی۔'' وہ بڑے پیار سے نجمہ کے رخسار کے ساتھ اپنا رخسار رگڑ رہا تھا۔ ''میری پیاری پیاری امی اتنی عظیم بھی تو ہے کہ بے اختیار پرستش کرنے کو جی چاہنے لگا ہے پھر وہ کیسے نفرت کر سکے گی!''

''تو وہ کیوں نہیں آ رہی۔''

''آپ سے کہا جو امی کہ ابھی گھر کے کاموں سے فارغ ہو کر آتی ہے۔'' اور نجمہ کی بے قراری' ممتا کی تڑپ دیکھ کر اسد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... جنہیں نجمہ سے چھپانے کے لئے وہ جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

35

اپنی ممتا سے مجبور ہو کر اسد کی ماں نے آمنہ کو کیسی کیسی قسمیں دے کر بیٹے کو بہن کے سپرد کیا تھا۔ موت سرہانے کھڑی تھی لیکن اسے اولاد ہی کا خیال تھا کہ کسی طرح اس کی زندگی خراب نہ ہو۔

اسی طرح نجمہ کی ممتا بھی تھی۔ صبا کے مصائب بھری داستان سن کر برداشت نہ کر سکی تھی اور بیمار پڑ گئی تھی اور اب وہ اسے ایک بار اپنے سینے سے لگا کر اتنی طویل جدائی کی آگ ٹھنڈا کرنا چاہتی تھی۔ اسد سوچ رہا تھا اس کی خاطر نجمہ نے اتنی بڑی قربانی دی تھی اس کا بدلہ کسی طرح چکا تو نہیں سکتا تھا لیکن اس کی ممتا کی تڑپ اور بے چینی رفع کر کے کچھ تھوڑا سا ازالہ تو کر سکتا تھا اور اس کے لئے اسے صبا کو تلاش کرنا تھا۔ بیٹی مل جائے تو پھر شاید اس طرح نجمہ کی زندگی بھی بچ رہے جو اسے اب بھی اسی طرح عزیز تھی بلکہ اب اس کے پیار اور محبت میں عقیدت کا بھی اضافہ ہو گیا تھا خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو؟

''نہیں نہیں۔'' اسد کے سارے حواس چیخ پڑے اس عظیم ہستی کی جدائی وہ کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا لیکن نجانے صبا کہاں چلی گئی تھی۔

نجمہ کی تیمارداری سے جو بھی تھوڑا سا وقت ملتا وہ اس کی تلاش میں صرف کر رہا تھا مگر اتنا بڑا شہر' اور اس کی لاکھوں کی آبادی میں سے ایک فرد کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہی نہیں تقریباً ناممکن تھا۔

چند روز اور گزر گئے تھے اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود وہ صبا کے متعلق کچھ معلوم نہ کر سکا تھا۔ اور نجمہ کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ جب بھی ذرا سی دیر کو ہوش آتا تو اس کی زبان پر ایک ہی فقرہ ہوتا۔ ''صبا کو بلا دو۔''

مایوسی اور پریشانی نے اسد کو پاگل کر چھوڑا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ ابھی ابھی نجمہ کو شدید درد کا دورہ پڑا تھا اور ڈاکٹر اسے انجکشن لگا کر گیا تھا۔ اسد

ہاتھوں میں سر تھامے اس کے سرہانے بیٹھا تھا اب تو ڈاکٹر نے بھی مایوسی کا اظہار کر دیا تھا۔

''صابرہ! تمہیں ایک بات بتاؤں۔ وہ جو فخرو کی بہن تھی نا زخمی ہو کر میو ہسپتال میں پڑی ہے۔ کہتے ہیں کار کے نیچے آ گئی تھی۔''

اسد کے کان ایک دم کھڑے ہو گئے۔ جلدی سے اس ہی ہمسائی کی طرف مڑا' جو دوسری سے بات کر رہی تھی دونوں کچھ دیر پہلے اس کی ماں کی عیادت کو آئی تھیں اور اب بیٹھی محلے کے لوگوں کے حالات پر تبصرہ فرما رہی تھیں۔

''چچی! کیا یہ واقعی ٹھیک ہے کہ فخرو کی بہن ہسپتال میں پڑی ہے؟''

''ہاں ہاں میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں میری ایک رشتہ دار وہاں داخل ہے۔ اس کا آپریشن ہوا تو میں دیکھنے کو گئی تھی۔ وہ بھی اسی وارڈ میں ہے۔'' وہ مشکوک نگاہوں سے اسد کو دیکھنے لگی ''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں بس ویسے ہی۔'' اس وقت وہ بات لمبی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اٹھ کر تیزی سے دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ چند لمحوں بعد لباس وغیرہ تبدیل کر کے واپس وہیں آیا۔ وہ دونوں پڑوسنیں اسی طرح باتوں میں محو تھیں۔

''آپ ذرا میری امی کا خیال رکھیں گی؟ مجھے ایک بڑا ضروری کام ہے ابھی آدھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔'' وہ بڑی عجلت میں تھا۔

''ہاں ہاں ہم یہیں رہیں گی تم جاؤ۔'' وہ خبر سنانے والی کی طرف دیکھ کر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔ اسد نے کوئی توجہ نہ دی۔ اسے تو اس وقت بس یہی ایک لگن تھی کہ کسی طرح صبا مل جائے تاکہ نجمہ کی زندگی بچ سکے۔ تیز تیز قدم اٹھاتا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس کے گھر سے میو ہسپتال کافی دور تھا پیدل جاتا تو وقت بہت لگ جاتا تھا اور نجمہ کی زندگی کا کوئی اعتبار نہیں تھا۔ کسی سواری کی تلاش میں نظریں دوڑائیں تاحد نگاہ کوئی ٹیکسی رکشا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ اندھا دھند بھاگنے لگا۔ آتے جاتے لوگ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ کوئی دیوانہ کہہ کر اس پر ہنس بھی دیتا مگر اسے کچھ ہوش نہ تھا وہ تو واقعی اس وقت پاگل ہو رہا تھا۔ آدھا راستہ اس نے یونہی بھاگ بھاگ کر طے کر لیا

پھر اچانک ایک خالی رکشا مل گیا۔

''جلدی کرو خوب تیز۔ اور تیز'' وہ سیٹ پر سے اٹھ اٹھ کر رکشا والے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر کہہ رہا تھا۔ ہسپتال میں پہنچ کر بڑی عجلت سے اس نے جیب میں سے کچھ نکال کر رکشا والے کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بغیر میٹر دیکھے، بغیر کرایہ پوچھے!

''بابو! کرایہ تو صرف تین روپے بنا ہے اور یہ تم دس کا نوٹ دے گئے ہو۔'' رکشا والا چلا چلا کر پیچھے سے اسد کو پکارتا ہی رہا مگر اس نے ایک نہ سنی اندھا دھند اندر گھس گیا۔

ملاقات کا وقت نہیں تھا اسے لئے دروازہ بند تھا اسے کھلوا کر اندر پہنچنے کے لئے چوکیدار کی منتیں کرنے لگا۔ شیو بڑھا ہوا تھا لباس بے ترتیب تھا اور چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔ وہ چوکیدار نجانے اسے کیا سمجھا بازو سے پکڑ کر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

ڈاکٹر نے سنجیدگی سے اسد کی بات سنی اور پھر وارڈ کی نرس کو بلا بھیجا۔

''اسے تو آج صبح چھٹی دے دی گئی تھی۔''

''اوہ!'' اسد کے چہرے پر مایوسی کے بادل چھا گئے ''تو آپ کو علم ہے وہ کہاں گئی ہے؟'' اس نے براہ راست خود نرس سے پوچھا۔

''جی نہیں البتہ وارڈ کی جو آیا ہے وہ شاید کچھ جانتی ہو کیونکہ وہ اس کے ساتھ بڑی بڑی دیر باتیں کرتی رہتی تھی۔''

''وہ اس وقت کہاں ہوگی؟''

''میں یہ نہیں جانتی اس کی ڈیوٹی نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب! مہربانی کر کے اس کا پتہ کر دیجئے۔ ایک زندگی کا معاملہ ہے۔''

اسد کے لہجے میں ایسی التجا تھی جس نے ڈاکٹر کو بہت متاثر کیا۔ اس نے اسی وقت ادھر اُدھر سے پتہ کر کے اس آیا کو بلوانے کے لئے چوکیدار کو بھیج دیا۔

''آپ یہاں تشریف رکھیئے۔'' اس نے اسد کو ایک کرسی پیش کی۔ اسد بیٹھ تو گیا مگر اس کی نگاہ گھڑی پر ہی تھی۔ گھر سے نکلے ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا اور اسے نجمہ کا بڑا فکر تھا وہ بیقرار ہو کر کبھی اٹھ کھڑا ہوتا کبھی پھر بیٹھ جاتا۔

ڈاکٹر اپنے کام میں مصروف تھا مگر کبھی کبھی نگاہ اٹھا کر اس کی بے چینی کو بھی دیکھ لیتا۔ اور پھر آپا آ گئی۔

''تمہیں علم ہے کہ سرجیکل وارڈ سے پانچ نمبر والے بیڈ کی جس مریضہ کو آج چھٹی ہوئی ہے وہ کہاں ہے؟''

''جی۔ جی نہیں تو۔ مجھے کیا پتہ اپنے گھر گئی ہوگی!''

''ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔'' ڈاکٹر نے اپنا لہجہ سخت کر لیا۔

''جی ہاں۔ مجھے نہیں معلوم۔'' ڈاکٹر بہت گھور گھور کر اس کو سر سے پیر تک دیکھ رہا تھا وہ بڑی گھبرائی ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔'' ڈاکٹر گرجا ''میں ابھی تمہیں پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔'' اور ساتھ ہی اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''نہیں نہیں ڈاکٹر صاحب!'' وہ ایک دم بولی۔ ''پولیس کو نہ بلایئے۔''

''پھر بتاؤ وہ کہاں ہے؟''

''جی وہ میرے گھر میں ہے۔''

''پہلے جھوٹ کیوں بولا تھا۔''

''اس نے کہا تھا کہ اس کے متعلق کسی کو نہ بتاؤں۔''

''تم اسے اپنے گھر کیوں لے گئی ہو؟''

''ڈاکٹر صاحب! وہ کہتی تھی کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں۔'' ساتھ ہی آپا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''میں بھی اکیلی ہوں۔ جب پاکستان بنا تو میری چھوٹی چھوٹی لڑکیاں اور خاوند ہندو سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ میں بدقسمت بچ رہی۔ اس وقت اگر وہ ہوتیں تو اتنی ہی عمر کی ہوتیں۔ مجھے اس بے چاری پر بہت ترس آیا اور اپنی لڑکیوں کا خیال کر کے میں اسے اپنے گھر.....''

''اوہ! جلدی بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے؟'' اسد بیچ میں ہی بڑی بے قراری سے بول پڑا۔ ''اس کی ماں کی حالت نازک ہے دیر نہ کرو مجھے اس کے پاس لے چلو۔''

''میرا گھر یہیں ہسپتال کے ساتھ ہی ہے۔ مگر وہ تو کہتی ہے کہ اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔''

''اس جرح کا فی الحال وقت نہیں۔'' اسد بڑی عجلت سے بولا اور آپا کا بازو پکڑ کر تیزی سے ڈاکٹر کے آفس سے باہر نکل گیا۔

''بس بس یہ رہا میرا گھر!''

آپا کے پیچھے پیچھے اسد بھی اس چھوٹی سی ڈیوڑھی میں گھس گیا۔

''اماں! آ گئیں!'' یہ صبا ہی کی آواز تھی۔ اسد لپک کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

''اوہ! آپ!!'' وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اسد کو دیکھ کر متحیر ہوتے ہوئے جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''جلدی چلو، امی تمہیں بلا رہی ہیں۔'' اسد صبا کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگا۔

''یہ کیا فضولیت ہے؟'' صبا اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

''ضد نہ کرو امی کی حالت نازک ہے اور وہ تمہیں یاد کر رہی ہیں۔'' اسد اسی طرح اس کا بازو پکڑے پکڑے بڑی تیزی سے بولا۔ آپا پاس کھڑی حیرت سے انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

''بھلا مجھے یاد کرنے کی انہیں اتنی ضرورت کیا پڑ گئی۔''

''اوہ! تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے جلدی اٹھو ورنہ پچھتاؤ گی۔''

''میں کیوں پچھتاؤں گی۔'' صبا ٹس سے مس نہ ہوئی اسی طرح بیٹھی رہی۔

''میں کہہ رہا ہوں اٹھو۔'' اب اسد بڑے غصے سے بولا اور ساتھ ہی اس کا بازو کھینچ کر اسے کھڑا کر دیا۔ ''وہ تمہاری ماں ہے اور تمہیں یاد کر رہی ہے۔''

''میری ماں! اور مجھے یاد کر رہی ہے۔'' صبا نے بڑے طنز سے قہقہہ لگایا۔ ''اس وقت میں اسے یاد نہ آئی جب مجھے چھوڑ کر چل دی تھی۔''

''اوہ! خدا کے لئے اس وقت بحث نہ کرو۔'' اسد اب التجا بھرے لہجے میں بولا۔

"اس نے جان بوجھ کر تمہیں نہیں چھوڑا تھا وہ مجبور ہو گئی تھی۔ تمہاری ماں عظیم ہے صبا! تم اس پر فخر کر سکتی ہو۔"

"ہونہہ فخر!" پھر طنزیہ ہنسی اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ "بہر حال چلو۔ میں خود اس سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں۔" پھر کچھ سوچ کر بڑے مشکوک انداز میں اسد کی جانب دیکھنے لگی۔ "میری ماں؟ لیکن میری ماں کون سی؟"

"کہا جو کہ جسے دنیا میری ماں سمجھتی ہے وہ میری نہیں تمہاری ہے۔ نجمہ، ذوالفقار مرحوم کی بیوی۔ میری وہ خالہ ہے۔"

"مگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں جلدی چلو نجانے اس کا کیا حال ہو گا؟" اور اسد اسے کھینچے لئے جا رہا تھا۔

"مگر وہ تو اس دن اچھی بھلی تھیں۔"

"تمہاری باتوں نے انہیں اتنا صدمہ پہنچایا کہ اسی دن سے انہیں اختلاج کے دورے پڑ رہے ہیں اور جب ہوش آتا ہے صرف تمہارا نام ان کی زبان پر ہوتا ہے۔" اسے کھینچتا ہوا وہ ڈیوڑھی سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے ہی خالی ٹیکسی نظر آ گئی۔ صبا کو اس میں دھکیل کر خود بھی بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو تیز چلانے کی تلقین کرتے ہوئے بے قراری سے کلائی کی گھڑی پر نگاہیں جما دیں۔ اسے گھر سے نکلے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ "یہ دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں ان کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات زبان سے نہ نکالنا۔" اسد صبا کو سمجھانے لگا۔

"کیسی......؟"

"کہ تمہیں ان سے نفرت ہے تمہاری اسی بات نے آج انہیں اس حال کو پہنچا دیا ہے۔ میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ سارے حالات جاننے کے بعد تم ان سے نفرت نہیں کرو گی اور اب وہ ایک ایک پل تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔"

جب تک وہ گھر پہنچے اسد نے نجمہ کے حالات مختصراً اسے سنا دیئے۔ ساتھ ساتھ

وہ ٹیکسی والے کو جلد از جلد پہنچنے کی تاکید کرتا جا رہا تھا۔ مگر لاہور جیسے گنجان آباد شہر کی سڑکوں پر ٹریفک بہت زیادہ تھی!

صبا چپ چاپ اور کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ ماں کے خلاف نفرت کا جذبہ جو سالوں سے پل رہا تھا ایک دم ہی سرد پڑ گیا اور اب وہ دل ہی دل میں اس کی زندگی کی دعا مانگ رہی تھی۔ اسد تو اسد اب اس کی اپنی بھی بے چین نگاہیں راستہ پر لگی تھیں۔

36

ماں۔ ماں۔ ماں

صبا کے تن کے ہر روئیں کی زبان پر اس رشتے کا نام تھا جس سے اس نے اتنے سالوں کی عمر کے ہر پل میں نفرت ہی کی تھی۔ لیکن اب...... یہ پکار بے پناہ محبتوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا اس لفظ کو، جو جذبے امر بناتے ہیں جو جاں نثاریوں اور قربانیوں کا دوسرا نام ہیں۔ وہ معنی، وہ احساس اس نے کبھی نہ پایا تھا۔ ان جذبوں کی تڑپ، خلوص اور وفا اس بدنصیب کے حصے میں نہیں آئی تھی۔ لیکن پھر بھی، وہ پورے وجود پورے احساس اور پورے تن من کے ساتھ اس رشتے کی پناہ میں ڈوب جانے کو بے قرار تھی۔

اسد اسے ٹیکسی سے اتار کر خود ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا گیا تھا۔ وہ کمرے کی دہلیز پر کھڑی پھیلی پھیلی پرنم آنکھوں سے اندر تک رہی تھی۔ چارپائی پر سفید چادر اوڑھے کوئی پڑا تھا۔ نجمہ ہی ہو گی۔

اس کی ماں، اس کی اپنی ماں...... حقیقی ماں۔ اسی حق کو استعمال کرتے ہوئے صبا نے قدم بڑھایا۔ ساتھ ہی نگاہ چارپائی سے پرلی طرف جا پڑی۔ تین چار عورتیں سوگوار سی

صورتیں لئے بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھیں۔

وہ ٹھٹکی، مگر دوسرے ہی لمحے ایک چیخ کے ساتھ چارپائی پر پڑے نجمہ کے تقریباً بے جان وجود کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا؟ انہیں کیا ہوا......؟''

''شور نہ کرو...... چپ چپ...... آخری وقت ہے۔'' ایک عورت نے جلدی سے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ ''نزع کا عالم ہے۔ بیٹھ کر سورۃ یٰسین پڑھو اللہ مشکل آسان کرے۔''

''نہیں نہیں......'' صبا ہذیانی انداز میں چلائی۔ ''ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔''

اس نے خود کو اس عورت کی گرفت سے چھڑایا۔ باقی عورتیں تلاوت چھوڑ کر اس کی طرف تکنے لگی تھیں۔ ان کی نگاہوں کا بھی مفہوم وہی تھا کہ وہ مرنے والی کو ڈسٹرب کر رہی تھی۔

''اس پاگل......'' دوسری عورت جانے کیا کہنے لگی تھی۔ صبا نے ایسی کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ جلدی سے پرے ہٹ گئی۔

''میری ماں زندہ رہے گی انشاء اللہ! ابھی تو اس کی مامتا کی ٹھنڈی چھاؤں میں مجھ دُکھیا، مجھ بدنصیب کی دکھوں بھری تھکن زدہ زندگی نے ستانا ہے...... امی...... امی......'' کسی کی مداخلت کی پروا کیے بغیر، روکنے والے بڑھے ہاتھوں کو جھٹک کر وہ جنونی انداز میں آگے بڑھی اور ماں سے لپٹ گئی۔ ''امی! آنکھیں کھولیں...... میری طرف دیکھیں۔ امی! میں اپنے حصے کی مامتا آپ سے لینے آئی ہوں۔ میرا حصہ، میرا حق مجھے دیئے بنا آپ کہیں نہیں جاسکتیں۔ اللہ میاں کے پاس بھی نہیں۔'' اکھڑے اکھڑے سانس لیتی نجمہ کے چہرے کو صبا نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''آنکھیں کھولیں۔ امی، آنکھیں کھولیں۔ دیوانوں کی طرح چیختے ہوئے وہ اپنے گال ماں کے زرد چہرے کے ساتھ رگڑنے لگی۔ آنکھوں سے لگاتار آنسو بہہ رہے تھے جس سے ماں کا چہرہ بھی آنسوؤں سے تر ہوا جا رہا تھا۔

''مجھے تو آپ کو پھپھو اور دادی اماں کے پاس لے کر جانا ہے۔ آپ کی بے گناہیاں ثابت کرنے کے لئے، اپنی بے گناہیوں کا ثبوت دینے کے لئے۔ اٹھیں۔ امی

اٹھیں یہ سونے کا نہیں جاگنے کا وقت ہے۔ آپ کی بیداری میرے سوئے ہوئے نصیبوں کو جگا دے گی۔ آنکھیں کھولیں۔''

''بیٹی۔ صبر، مرنے والی کو اذیت نہ دو۔'' ایک عورت نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا۔

''تم کون ہوتی ہو ہم ماں بیٹی کے بیچ میں آنے والی۔'' خون اگلتی نظروں سے صبا نے اس عورت کو دیکھا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ خود کو اس کی گرفت سے چھڑایا اور اسے دھکا دے کر پیچھے گراتے ہوئے واپس پلٹی اور دوبارہ ماں سے لپٹ گئی۔

''امی! امی۔ دیکھئے یہ مجھے آپ سے علیحدہ کر رہی ہیں۔ اتنے سالوں کی جدائی کے بعد، ان ملن کی گھڑیوں......''

''یہ اس کی کیا لگتی ہے جو اَب واویلا مچا رہی ہے۔''

''یہ اسد کی ماں ہے نا اور اس کا بڑا آنا جانا تھا اس گھر میں۔'' عورتیں آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگیں۔

''دیوار پر سے بھی دونوں اکثر۔''

''کون دونوں؟''

''اسد اور۔ یہی لڑکی۔''

''صبا ہے اس کا نام۔''

''ہاں۔ صبا۔''

''لیکن یہ تو اس کو ماں کہہ رہی ہے۔''

''دل کا رشتہ جوڑ لیا ہوگا تب ماں ہی کہنا تھا، نا۔''

''میرا ان کے ساتھ رشتہ اللہ نے جوڑ رکھا ہے۔'' یکایک صبا نے آنسوؤں نے تر چہرہ اٹھا کر ایک بے بسی کے ساتھ سب کو دیکھا۔

''یہ میری ماں ہے خدا کی قسم یہ میری سگی ماں ہے۔''

لیکن اس پر جیسے کسی نے یقین نہیں کیا۔ حرکات سے وہ پاگل ہی لگ رہی تھی پھر

ایک پاگل کی بات کا یقین کون کرتا۔

"کیا یہ اسد کی بہن ہے؟" سبھی مشکوک نگاہوں سے اسے تک رہی تھیں۔

"یہ تو فخرو کی منہ بولی بہن تھی۔ وہ بھی نجانے کہاں سے اسے پکڑ لایا تھا ہائے بے چارا مر گیا پتہ نہیں۔"

سرگوشیوں کے انداز میں حیرتوں بھرے فقرے، مکمل نامکمل فضا میں اُبھر رہے تھے صبا سن بھی رہی تھی اسے سنانے کو ہی کوتو بولے جا رہے تھے۔

اور صبا وہ جواب دینا چاہتی بھی تھی لیکن یقین دلانے کو کوئی ثبوت موجود نہ تھا۔

صرف یہ ماں، سامنے پڑی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی یہی اس کی ہر بات کی گواہی تھی یہی ثبوت اور یہی یقین۔

"امی! امی آنکھیں کھولئے۔" روتے تڑپتے ہوئے وہ پھر ماں سے لپٹ پڑی۔

"میری طرف دیکھئے میں آپ کی بیٹی صبا ہوں میری بات سنئے۔ میری زندگی کے لئے آپ کا زندہ رہنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ پھر مجھے بھی آپ کے ساتھ ہی جانا ہوگا اس زندگی کو....."

صبا کے وجود کا لمس تھا، اسکی گرمی تھی یا پھر اس کی دردبھری چیخ وپکار اور آہ و بکا کا اثر۔ نجمہ کے بے جان وجود میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔

"پانی۔ پانی۔" زندگی بھر کی پیاسی مامتا کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ آنکھیں بند تھیں صرف سوکھے ہونٹوں سے ہلکی ہلکی صدا نکل رہی تھی۔

"پانی لاؤ۔ پانی لاؤ۔" ایک عورت پانی لانے کے لئے بھاگی۔

"امی۔ امی۔" صبا کے آنسو ماں کے چہرے کو بھگو رہے تھے۔

ابھی پانی نہیں آیا تھا۔ اس کا حلق ابھی سوکھا تھا۔ لیکن صبا کی آہ و فغاں مسلسل اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔

"کون؟" نجمہ کے بند ہونٹ لرزے۔ سوکھے ہونٹوں میں جنبش ہوئی۔ حلق سے گھٹی گھٹی سی بے حد مدھم آواز ابھری۔ "مجھے کون پکار رہا ہے؟"

"میں ہوں امی! صبا۔ آپ کی بیٹی۔"

وہ عورت پانی لے آئی تھی۔ "کیسی نادان لڑکی ہے۔ ارے نجمہ بہن کو پیاس لگی ہے۔ دو گھونٹ پانی تو پی لینے دو اسے۔ آخری وقت کی خواہش۔" صبا کو زبردستی پرے ہٹا کر عورت نے پانی سے چمچ بھرا اور نجمہ کے منہ میں ٹپکانے لگی۔

"میری بیٹی۔ صبا آئی ہے؟ صبا۔ صبا۔"

وہ جو ابھی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ جس کے لبوں پر جان تھی۔ جو بے سدھ پڑی نزع کے عالم سے گزر رہی تھی۔ نجانے کہاں سے اور کس کی زندگی آ کر اس کے وجود میں سرایت کر گئی۔ ہاتھ کے ایک جھٹکے سے پانی کے چمچ کو اس نے پرے پھینکا اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ اس میں اس وقت اتنی قوت تھی کہ جیسے وہ پہاڑوں سے بھی ٹکرا سکتی تھی۔

صبا نے ماں کے پھیلے ہوئے بازو دیکھے تو بجلی کی سی اک تڑپ کے ساتھ دوسری عورتوں کو دھکیلتے ہوئے، پرے ہٹاتے ہوئے ماں کے بازوؤں میں جا سمائی۔

اور پھر۔ دیکھنے والوں نے عجیب سا نظارہ دیکھا۔ ایک مردے کے تن میں زندگی کی لہریں یکا یک دوڑ اٹھنا، اک معجزہ ہی تو تھا۔ بغیر کسی دوائی کے، بغیر انجکشن کے، بغیر کسی حلق میں ٹپکنے والے مشروب کے۔

"میری بیٹی۔ میری جان، میری زندگی۔"

وہ اس کا سر، ماتھا، پیشانی گال چومے جا رہی تھی۔ بولے جا رہی تھی۔ روئے جا رہی تھی۔ ماں بیٹی دونوں کے آنسو اتنی تیزی سے، اتنی روانی سے بہہ رہے تھے کہ کوئی پتا نہ تھا کون سا آنسو کس آنکھ سے ٹپک رہا ہے۔ اور۔ جیسے سالوں کی، صدیوں کی پیاسی روح کی پیاس بجھ رہی تھی۔ نجمہ کے چہرے پر سے موت کی زردی کافور ہو چکی تھی اور اب وہاں مامتا کے جذبوں سے بھرپور زندگی کی روشنی پھیلی تھی۔

"ارے یہ تو سچ مچ ہی اس کی بیٹی ہے شاید۔" وہاں موجود سب عورتیں انگلیاں دانتوں میں دبائے اس تن مردہ میں زندگی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ مچل اٹھنے، تڑپ

اٹھنے کا اعجاز دیکھ رہی تھیں۔ ان کی زندگی کا ان ہونا واقعہ۔

''شاید کیا۔ یہ واقعی اس کی اپنی اولاد ہے۔'' اولاد والیوں کو ماں اور اولاد کے درمیان محبتوں' وارفتگیوں اور جذبوں کی شدتوں کا اندازہ تھا۔ ''ہاں۔ ذرا نجمہ بہن کا چہرہ دیکھو۔''

''قابلِ دید نظارہ ہے۔''

''کیسی رونقیں بکھر رہی ہیں۔ کیسے دھنک کے رنگ پھیل رہے ہیں۔''

''مردے میں جان پڑتے پہلی بار دیکھا ہے۔''

''ممتا کے جذبے ہوتے ہی ایسے ہیں۔''

''ارے کوئی انہیں چپ کرائے۔ دونوں ہی رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔''

''نہ نہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ کوئی دخل نہ دے۔''

''نجمہ بہت بیمار رہی ہے۔ خدانخواستہ کہیں زیادہ۔''

''نہیں۔ یہ آنسو اسے مزید بیمار نہیں کریں گے۔ برسوں کی جدائی کے دکھوں کا میل دھو دیں گے۔ ابھی دیکھنا کیسے زندگی کی دھوپ چمک اٹھے گی۔''

سب کے چہرے مسرور تھے اور ان پر مسکراہٹیں پھیلی تھیں۔

''ارے! چچی' مائی' خالہ آپ سب کیا مجمع لگائے کھڑی ہیں۔ خدا کے لئے راستہ دیجئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو لے آیا ہوں۔'' اسد پیچھے کھڑا چیخ رہا تھا۔ ''کیا حال ہے میری امی کا۔ اللہ میاں! رحم کرنا۔''

اسد کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔ پریشانی کے مارے آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ عورتیں پرے ہٹیں تو وہ آگے قدم اٹھانا ہی بھول گیا۔ وہیں کا وہیں ٹھٹک کر نجمہ اور صبا کو دیکھنے لگا۔

نجمہ کا تو روگ ہی جیسے بیٹی کی جدائی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ صبا اس کے سینے کے ساتھ لگی ہوئی تھی اور چہرے پر مسکراہٹیں اور سرخیاں لئے نجمہ اس کے بال سہلا رہی تھی۔ اس کے حسین و معصوم چہرے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

''اسد بیٹے! ڈاکٹر صاحب دروازے میں کھڑے ہیں۔'' ایک عورت نے اسد

کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔

''اسد آیا ہے۔ ارے! مجھ سے اتنی دور کیوں کھڑے ہو؟'' نجمہ نے عورت کی بات سن لی تھی۔ جلدی سے اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں صاف کرتے ہوئے یکا یک' اسد کے لئے بازو پھیلا دیئے۔

''آؤ دیکھو۔ صبا آئی ہے۔ کیا اس سے نہیں ملو گے؟''

''کیوں نہیں۔'' ماں کو ہشاش بشاش دیکھ کر اسد کے چہرے پر بھی مسکراہٹیں پھیل اٹھیں۔ پریشانیوں کے سائے کافور ہو گئے۔

''آؤ نا۔ تم میرے قریب کیوں نہیں آتے؟''

''نجمہ نے اسد کے لئے بے قراری کا اظہار کیا۔ وہ ہنسنے لگا۔

''لیکن امی پہلے ڈاکٹر صاحب سے تو فارغ ہو لیں۔ وہ منتظر کھڑے ہیں۔''

پھر اسد مڑ کر ڈاکٹر صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''آیئے ڈاکٹر صاحب آیئے۔ یہ میری امی ہیں۔ انہیں......''

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اولاد ہے نا۔ ماں کی ذرا سی تکلیف سے پریشان ہو جاتا ہے۔''

''ذرا سی نہیں امی! آپ کو پتہ نہیں۔''

''میں معائنہ کرتا ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب نے قدم بڑھائے اور بستر کے پاس آ کر نجمہ کی نبض تھام لی۔ ''بہت کمزور ہیں۔ ویسے۔ یہ ارد گرد اتنے لوگ۔'' ڈاکٹر صاحب نے جملہ نامکمل چھوڑتے ہوئے ایک اچٹتی سی نظر دوسری عورتوں پر ڈالی۔ ایک حیرت بھری نگاہ سے نجمہ کے بستر پر چڑھی صبا کو دیکھا۔

''مریضہ کے کمرے میں اتنا رش نہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب! ابھی اس کی حالت بڑی خراب تھی۔ ہم تو مارے ہمدردی کے آ گئیں۔'' ایک عورت کو ذرا غصہ لگا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے پرے ہٹ گئی۔

''اکیلی پڑی تھی۔ کوئی پانی پوچھنے والا بھی پاس نہ تھا۔ آؤ زہرہ۔ سعیدہ۔ ہم چلیں؟''

''ارے خالہ! ڈاکٹر صاحب کو کیا پتہ۔ آپ ان کی بات کا برا نہ منائیں۔'' ڈاکٹر

صاحب نجمہ کا معائنہ کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسد معذرت کرنے لگا۔ ''آپ سب کے ہی سہارے تو میں امی کو اس حالت میں بھی اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ مشکل وقت میں آپ نے ہمارا ساتھ دیا۔''

''اللہ تمہاری ماں کو آرام دے۔ تندرستی دے' زندگی دے۔ نیک اولاد ہو۔''

''اور یہ صبا۔ اسد بیٹے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟'' تجسس کے مارے خالہ حلیمہ مزید خاموش نہ رہ سکی۔

''یہ سارا معاملہ پھر آپ کو بتاؤں گا۔ یا امی سے ہی کل پرسوں پوچھ لیں۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب......''

''اوہ۔ اچھا اچھا۔ چلو سکینہ اور زہرہ اس وقت ہم چلیں۔ پروردگار نجمہ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ ہم شام کو تمہاری ماں کا حال چال پوچھنے آئیں گے۔''

''جی۔ بہت شکریہ۔''

''کھانا وغیرہ تو نہیں بنا ہوگا۔ باورچی خانے میں' میں نے دیکھا تھا چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔''

''پکانے والی تو بیمار پڑی تھی۔ چولہا کیسے گرم ہوتا۔'

محلے والی سب عورتوں اور پڑوسیوں وغیرہ کے ساتھ نجمہ اور اسد کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔

''اچھا تو فکر نہ کرنا۔ میں کھانا بھیجتی ہوں۔''

''رات کا میں بھیج دوں گی۔''

''بہت بہت شکریہ آپ سب کا۔ خدا آپ کو ان نیکیوں کا اجر دے۔''

''ارے بیٹا! ہمسایوں پڑوسیوں پر بڑے حق ہوتے ہیں۔ ہم اپنا فرض نباہ رہے ہیں۔''

''یہ میں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اسد کو مصروف دیکھا تو نجمہ کے پاس بیٹھی صبا کو سمجھانے لگے۔

''ذرا باقاعدگی سے دیں۔ مریضہ کمزور بہت ہیں۔ یہ ان کی ظاہری حالت تو

بس۔ حیرت انگیز ہی بات ہے یا پھر ان کی قوت ارادی ہو سکتی ہے۔ انہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ اردگرد یہ...... ایسا شور ہنگامہ۔'' ڈاکٹر صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''یہ نہیں ہونا چاہیے اور پرہیز بھی بہت ضروری ہے۔''

''پرہیز؟ کس سے پرہیز؟'' صبا نے پلکیں جھپکتے ہوئے کچھ نہ سمجھ سکنے کے انداز میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

''عیادت کے لئے آنے والے زیادہ لوگوں سے ان کے اعصاب پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ ان کے دل کی حالت......''

''میرا دل ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! بہت مضبوط ہے۔ جب سب دولتیں پاس ہوں تو دلوں میں بڑی قوت ہوتی ہے۔''

اور۔ ڈاکٹر صاحب نجمہ کی بات سن کر اس گھر کے در و دیوار اور چیزوں وغیرہ کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ سب کچھ ہی سادہ تھا۔ کہیں بھی کسی چیز میں بھی امارت نہ ٹپک رہی تھی۔ پھر مریضہ کن دولتوں کی بات کر رہی تھی۔؟ کیا بیماری نے دماغ پر بھی اثر ڈالا تھا؟ وہ ایک بار پھر پوری توجہ سے مریضہ کا معائنہ کرنے لگے۔

یوں تو بظاہر نجمہ بالکل ٹھیک نظر آ رہی تھی۔ لیکن زندگی بھر کی بیٹی کی جدائی نے اندر جو دراڑیں ڈال دی تھیں' اتنے بڑے دکھ نے جو اندر گھاؤ ڈال رکھے تھے' وہ تو ابھی موجود ہی تھے۔ اور وہی اس کی بیماری تھی۔

بیٹی پاس آ گئی۔ ہر لمحہ سامنے رہنے لگی۔ ماں کی یوں خدمت کر رہی تھی جیسے ساری زندگی ماں کی محبتوں کے سائبان تلے رہنے والی' ایسی اولاد ہو جس نے زندگی کا ہر پل ممتا کے سکھوں اور خوشیوں اور آسائشوں کی چھاؤں میں چین کی نیند سو کر گزارا ہو۔ بے انتہا جان نثار کرنے والی اور قربانیاں دینے والی ماں کی جس طرح خدمت کرنا اولاد پر فرض ہوتا ہے ایسے ہی فرض کی طرح صبا نے اپنی ماں کے لیے دن رات ایک کر دیا۔ اپنی محرومیاں بھول کر' اپنے حصے کی غصب شدہ خوشیوں کا صدمہ اور۔ دوسروں کے دیئے دکھ سب کچھ فراموش کر کے اس نے ماں کے وجود میں اپنا آپ مدغم کر دیا۔

راتیں اس نے جاگیں۔ دن دن بھر اس نے کام کیا۔ اسے وقت پر دوا دی۔ وقت پر اٹھایا بٹھایا' نہلایا دھلایا۔ بستر تبدیل کیا۔ کیا کوئی ٹرینڈ نرس کرے گی' جس ذمہ داری سے اس نے ماں کی بیماری کاٹی۔

اس کے علاوہ ماں کا گھر سنبھالا۔ اس کے بیٹے کی دیکھ بھال کی۔ اسے وقت پر کھانا دیا۔ اس کے کپڑے دھوئے۔ اس کے گھر کی حفاظت کی۔ اپنا تن من بھلا کر۔ اپنے ہوش و حواس کو کھو کر۔ اپنی ہستی کو تج کر۔ تب بھی۔ تقریباً مہینہ ڈیڑھ لگ گیا۔ ماں کو صحت یاب ہوتے ہوتے وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ پھر بھی صبا نے اسے پاؤں بستر سے نیچے نہ اتارنے دیا۔

''جب تک ڈاکٹر صاحب آپ کی مکمل صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہ دے دیں گے تب تک آپ کو ملنے جلنے کی بھی اجازت نہیں۔''

نجمہ سرہانے پڑی میز پر خود گلاس میں پانی ڈالنے لگی تھی کہ صبا اندر آ گئی۔ فوراً ماں کے ہاتھ سے جگ اور گلاس لے لیا۔

''ارے! اب میں بہت ٹھیک ہوں۔ بالکل صحت مند میری جان!''

نجمہ نے کچھ ایسی محبت پاش نظروں سے بیٹی کو دیکھا کہ اسد کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوتے وہیں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ نجمہ کی آنکھوں سے ایسے جذبے مترشح ہوتے اس نے پہلی بار دیکھے تھے۔

''لگتا ہے اب ہمارا پتا کٹ گیا۔'' دل کے اندر ایک نامعلوم سی کسک اتر آئی تھی مگر بظاہر اس نے لہجہ شرارت آمیز اختیار کیے رکھا۔ ''کریں اپنا بستر بوریا گول۔''

''کیا کیا۔؟ پتا کٹے دشمنوں کا اور۔ بستر بوریا گول والی کیا بات ہوئی۔ اپنے گھر کو چھوڑنے کی بات کبھی کسی نے کی ہے۔'' نجمہ یکا یک بڑی جذباتی ہوگئی۔

''آئندہ کبھی ایسی بات نہ کہنا۔ کبھی جھوٹے سے بھی نہیں۔ تم تو میری زندگی ہو' میری دنیا' میری عاقبت ہو۔ میں نے جو کچھ پایا تمہارے وجود سے پایا۔''

اتنا کچھ وہ اسد کے لئے کہہ رہی تھیں۔ صبا لپک کر ماں کے قریب آ گئی۔

''اور میں۔؟ امی! میں۔؟ میرا آپ کی زندگی میں کیا مقام ہے؟ دنیا اور عاقبت تو ساری ان کے نام کر دی۔''

''تم۔تم؟'' پتہ نہیں نجمہ کیا کہنا چاہ رہی تھی مگر کہہ نہ پا سکی۔ الفاظ کی اک لمبی دوڑ تھی جو اس کے جذبوں کے اظہار کی متمنی تھی۔ لیکن۔ ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ آنکھوں میں اک انوکھی سی چمک اور متوالی سی جگمگاہٹیں ڈولنے لگیں۔

''ہاں ہاں۔ بتایئے نا۔'' وہ ماں کے پھڑ پھڑاتے ہونٹوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ نظروں میں تو جو محبتیں اس کے لئے تھیں وہ اکثر دیکھتی رہتی تھیں مگر زبان سے۔ نجمہ ان کی زبان سے بھی اس ماتا کا اظہار چاہتی تھی۔ جس کا حق رکھتے ہوئے بھی کبھی نہ پا سکی تھی۔

نجمہ کی نظریں اٹھیں۔ اسد کی نگاہیں بھی اس پر جمی تھیں اور اس کا تو نجمہ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ اس کی ہر چاہت' محبت' انس' وفا' ادا غرض ہر جذبہ اس ایک ہستی' ایک وجود تک ہی آ کر ختم ہوتا تھا۔ نجمہ کے پھڑ پھڑاتے ہونٹ ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ وہ کچھ بھی نہ بولی۔ البتہ اس کے بازو بلا ارادہ بے اختیار اٹھے اور پھیل گئے۔ صبا ماں کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔

نجمہ کی زبان اب بھی گنگ تھی لیکن ان کہے الفاظ کا خزانہ جیسے اس کے اندر منتقل ہونے لگا۔ وہ اک جذب و سرمستی کے عالم میں کتنی ہی دیر ماں کے سینے سے لپٹی رہی۔

''ادھر ہنڈیا جل رہی ہے اور ادھر معاشقے سوجھ رہے ہیں۔'' اندر کے امنڈتے حاسد جذبوں کو دباتے ہوئے اسد شوخ لہجے میں بولا۔ ''کیا خوب خدمت ہے۔ کیا خوب تیمارداری ہے۔ جلی ہوئی ہنڈیا' جلی ہوئی روٹی۔''

صبا نے چونک کر ماں کے سینے سے سر اٹھایا۔ ''صرف ایک دن ایسا ہوا تھا نا امی! وہ بھی ان کا لطیفہ سننے بیٹھ گئی تھی۔ اور یہ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے روز ہی میں ہنڈیا جلاتی ہوں۔'' ''وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھی۔ امی کے پاس ذرا سا بیٹھ جاؤں تو ایک دم ہی جل اٹھتے ہیں۔ میں کون سا انہیں یہاں سے بھگائے لیے جا رہی ہوں۔''

''انہیں کیا بھگاؤ گی۔ مجھے تو اپنی فکر ہے۔ ان کے دل سے تو مجھے نکال ہی دیا۔

کہیں گھر سے بھی نہ......"

"ارے ارے! یہ تو آج کل کیسی باتیں کرنے لگا ہے۔" نجمہ ایک واضح سے اضطراب کے ساتھ چونکی۔ ساتھ ہی بے چینی سے پہلو بدلا اور اسد کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' کیا پوری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا؟

"کچھ غلط تھوڑی ہے امی!" بظاہر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اندر کیا تھا؟ نجمہ کے دل کو ٹٹولنے والی نظر اس کے متبسم چہرے پر گڑی رہی۔

"کل ہی تو یہ صبا بیگم آپ سے اپنی دادی کے گھر چلنے کو کہہ رہی تھی۔"

"ایک بار امی! میں نے آپ کو وہاں ضرور لے کر جانا ہے۔ بس آپ پوری طرح صحت مند ہو جائیں۔" صبا کا کہا ہوا فقرہ نجمہ کو یاد آیا۔ "دیکھا جائے تو اصل میں وہی آپ کا گھر ہے۔ میرے ابو کا گھر' آپ کا گھر۔ ہے نا۔ اس کے علاوہ آپ پر جو الزامات لگے ہوئے ہیں ان سے بھی تو بری ہونا ہے۔ میری اتنی اچھی' نیک' پرہیزگار اور عظیم ماں کو کوئی گناہگار کیوں کہے۔"

"اور امی۔!" اسد کے دوبارہ بولنے سے نجمہ کے خیالات کا تسلسل ٹوٹا۔ "یہ آپ کو لے جائے گی تو میں۔ رہ گیا نا اکیلا۔"

"کیوں یہ تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں یہاں اکیلا چھوڑ جاؤں گی۔" نجمہ کی آنکھوں میں اسد کے لئے ماماتا اتر آئی۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔"

"کیا وہاں قتل و غارت گری کا بازار گرم کرانا ہے؟" اسد بے ساختہ بولا۔ نجمہ چونک سی پڑی۔

"کیوں؟"

"جب ان لوگوں کو پتہ چلے گا نا کہ میری وجہ سے سب کچھ ہوا تھا تو مجھے زندہ کب کوئی چھوڑے گا۔ میں ہی تو بنا ہوں آپ کے خاندان کی تباہی' بربادی اور رسوائی کا باعث۔"

بات بظاہر مذاق میں شروع ہوئی تھی۔ چند لمحات پہلے اسد کے چہرے پر تبسم تھا لیکن اب۔ وہاں ایک سوچ تھی' فکر تھی' سنجیدگی تھی۔

"مجھے پورا پورا احساس ہے امی' آپ کی زندگی بھر کی محرومیوں کا' دکھوں کا' صدموں کا' جو میری خاطر آپ نے بھگتے' برداشت کئے۔" اب وہ بڑے دکھ سے اور اک کرب کے ساتھ زندگی کی حقیقتیں واضح کر رہا تھا۔ اتنے دنوں سے جو اندر ہی اندر اپنے ضمیر کی عدالت میں کھڑا تھا۔ بحث سن رہا تھا۔ اپنے آپ کے لیے فرد جرم کا انتخاب کر رہا تھا کہ اس پر کون سی حد لگتی تھی اور اسے اس کا کس طرح کفارہ ادا کرنا تھا۔ یا سزا بھگتنا تھی۔ "اور آپ کے علاوہ جو کچھ آپ کی بیٹی کو سہنا پڑا' جس طرح تباہی اور بربادی آپ دونوں کی ہوئی' اک میرے وجود سے۔"

"بس بس۔" نجمہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑے پیار سے اسے دیکھا۔ آنکھوں میں وہی ماماتا تھی۔ وہی ایثار و قربانی کے جذبے مچل رہے تھے۔ جو ہمیشہ ان کی آنکھوں کا خاصہ رہے تھے۔ "یہ ساری سوچیں تمہارے لیے نہیں ہیں۔ نہ یہ تمہارے کرنے والی باتیں۔" اسد کو قریب کھینچ کر نجمہ نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہ میری آزمائش تھی بیٹے! میری۔ میرے پروردگار کی طرف سے۔ اور پتہ نہیں میں اس میں پوری اتری یا نہیں۔ کہاں کہاں مجھ سے غلطی ہوئی۔ کہاں کہاں مجھے جواب دہ ہونا ہے اور کہاں کہاں میں سرخرو ہوئی۔"

نجمہ کی آنکھیں جوش جذبات اور خوف خدا سے بھیگ اٹھی تھیں۔

"ارے! آپ سے غلطی ہوئی؟ آپ پوری نہیں اتریں؟ آپ؟" اسد نے ماں کی بھیگی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "آپ تو عظیم ہیں امی! پوری طرح سرخرو ہیں۔ اپنی اولاد کو چھوڑ کر۔ دوسرے کی اولاد کو۔"

"دوسرے کی اولاد کو؟ ارے تو میری اولاد نہیں۔ پھر وہی غلط بات یا غلط سوچ۔ بس میں نے کہہ دیا نا۔ اب آئندہ اس مسئلے پر تم کوئی بات نہیں کرو گے۔ چند دن پہلے۔ جیسا کہ تم ہی جانتے تھے۔ صرف تم ہی میری اولاد ہو۔ بس۔ لہٰذا تم اب بھی یہی سمجھو گے۔ میں تمہاری ماں ہوں حقیقی ماں۔"

"اور امی! میں۔؟" صبا نے اپنا مقام جاننا چاہا۔

"تم میری بہو ہو۔ اکلوتے بیٹے کی۔"

"اوہ ہنڈیا جل گئی۔" شرم آ گئی تھی۔ لیکن آج ہنڈیا بڑے وقت پر جلی تھی۔ سچ مچ جلی تھی۔ جلنے کی تیز سی بو اس کے نتھنوں میں گھسی تھی تو۔ اسے راہ فرار مل گئی۔ وہ باورچی خانے کی طرف بھاگی۔

"میں نہ کہتا تھا روز جلی ہوئی ہنڈیا کھانے کو ملتی ہے؟"

"ماں کی باتوں نے اسد کو خوشیوں اور شادمانیوں سے ہم کنار کر دیا تھا۔ وہ اسی سرخوشی میں صبا کو چھیڑنے لگا۔ "اس لڑکی نے کیا گھر گرہستی سنبھالنی ہے؟"

ہنڈیا جل رہی تھی لیکن اسد کی بات کا جواب دینا بھی ضروری تھا۔ صبا واپس آئی۔ "کب روز ہنڈیا جلتی ہے۔ امی! انہیں کچھ......"

"ارے پہلے جا کر اسے تو دیکھو۔ اگر کچھ بچ سکتا ہے تو بچا لو۔"

"اوہ" شرمندہ سی ہو کر صبا واپس بھاگی۔

نجمہ اور اسد کے قہقہے اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کے ساتھ باورچی خانے تک پہنچے تو صبا کے چہرے پر بے شمار مسکراہٹیں رقص کر اٹھیں۔

"وہاں جا کر کہیں کوئی اور پریشانی نہ بن جائے۔" صبا نے دادی اماں کے گھر جانے کے لیے بہت سارے دلائل دیئے تھے جس کے جواب میں سوچوں میں ڈوبی ڈوبی' کچھ پریشان پریشان سی نجمہ نے کہا تھا۔ "مجھے تو مل گئی ہے۔ اپنی اولاد۔ میں نے زندگی کا سب کچھ پا لیا۔ اب میں کچھ کھونا نہیں چاہتی؟"

"نہیں امی! ایک بار تو سب کو بتانا ہے ضرور۔ آنکھوں سے دیکھے بغیر کسی کو گناہگار یا عیب دار بنا دینا کہاں کا انصاف ہے۔ آپ کو کیا پتہ میری ساری زندگی آپ کے طعنے سن سن کر کیسے گزری ہے۔ نہ کوئلہ ہوئی نہ راکھ۔"

یہ آخری دلیل اس نے بہت دکھی ہو کر دی تھی۔ ورنہ وہ ماں کو کسی قسم کی تکلیف پہنچانا نہ چاہتی تھی۔

"تو کیا وہاں جانے سے تمہیں گزری زندگی واپس مل جائے گی۔"

"تسکین تو حاصل ہو ہی جائے گی۔ پھر جس جس کے سامنے مارے شرمندگیوں کے کبھی سر نہ اٹھا سکتی تھی۔ اب انہیں بتا تو سکوں گی کہ میری ماں کیسی عظیم عورت ہے۔ ان سب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ تو سکوں گی نا۔"

"جیسی تمہاری خوشی۔" آخر میں نجمہ مان گئی تھی۔ صبا کی خوشی سے زیادہ مقدم کیا ہو سکتا تھا۔

اور اسد تو ان دونوں ماں بیٹی کی خاطر کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ ایک اس کی محبت تھی اور ایک' ماں سے بھی زیادہ بلندر درجہ رکھنے والی عورت۔ ایثار قربانی کی واحد مثال۔ اس کی تو زندگی کی مالک ہی نجمہ تھی۔

کہتی۔ "جان قربان کر دو۔" تو وہ اک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کے قدموں میں زندگی کا نذرانہ پیش کر دیتا۔

وہ بھی ماں کا حامی تھا۔ صبا کی دادی کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن' صبا کی خوشی دیکھتے ہوئے اور ماں کی رضا کو مقدم سمجھتے ہوئے اس نے بھی چھٹی کی درخواست دے دی۔

"کم از کم دو ہفتے کی چھٹی لینا۔" نجمہ نے اسے تاکید کی تھی۔

"کیوں امی؟ دو ہفتے کیا کیا کرنا ہے۔ دو تین دن کافی نہیں ہیں؟"

"اب جانا ہی ہے تو میں چاہتی ہوں صبا کی دادی اور پھوپھی خود اپنے ہاتھوں سے اسے دلہن بنائیں۔ سارے انتظامات کر کے جاؤں گی۔"

نجمہ کی بات سن کر خوشی کے مارے اسد بوکھلا سا اٹھا۔ کوٹ کی بجائے بوکھلاہٹ میں قمیض کے اوپر دوسری قمیض پہننے لگا۔

"میں نے کہا تھا نا میرا بیٹا تو ہے اور صبا بہو ہے۔ اسے وہاں سے رخصت کرا کے لاؤں گی۔ اس کے باپ کے گھر سے۔ پھر تم دونوں ہمیشہ میرے پاس رہو گے۔ میری دونوں اولادیں۔"

صبا ماں اور اسد کی باتیں سن رہی تھی۔ اسد کی بوکھلاہٹیں دیکھ رہی تھی۔ خوشی کے

مارے دیوانہ سا ہو رہا تھا۔

دفتر سے آیا تو اس کے چہرے کے رنگ ہی اور تھے۔ آنکھوں میں شب برات اتری ہوئی تھی۔

''آہا پورے ایک مہینہ کی چھٹی مل گئی۔'' باہر سے ہی چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''واہ امی! آپ کی دعاؤں سے۔''

''ایک مہینے کی کیا کرنی ہے؟''

''امی!'' اس نے بے خود اور بے اختیار ہوتے ہوئے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''سمجھا بھی کریں نا' کچھ دن سیر و تفریح۔'' ماں کو بازوؤں میں بھینچ کر اس نے اپنے جذبوں اور سرشاریوں کا اظہار کیا۔

''اچھا اچھا۔'' نجمہ فوراً سمجھ گئی۔ ''تو میرے بیٹے نے' وہ کیا ہوتا ہے۔ ہنی مون۔ ہاں۔''

''بس بس۔ چپ۔'' اس نے جلدی سے ماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''وہ چھپکلی سی کہیں سن نہ رہی ہو۔ ادھر اُدھر سے۔ کسی دروازے کھڑکی کی اوٹ سے۔ اسے ہم ماں بیٹے کی کن سوئیاں لینے کی عادت بھی ہے۔''

دونوں ماں بیٹا ہنسنے لگے۔ اسد کو تو شادمانیوں نے بے حال اور وارفتہ سا کیا ہوا تھا۔ عجیب عجیب سی حرکات اس سے سرزد ہو رہی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے پاؤں میں جوتے اتار کر اٹھا اور جا برتنوں والی الماری میں رکھنے لگا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں؟'' صبا دیکھ رہی تھی۔ خاموش نہ رہ سکی۔ وہیں دروازے کی اوٹ سے چلائی۔

''اوہ۔'' اسد چونکا۔ پھر اپنی حرکت پر خود ہی قہقہے پر قہقہے لگانے لگا۔

''کیا ہوا بیٹے۔؟'' نجمہ نے پوچھا تو اس کے قہقہے تھم گئے۔

''امی!'' بھاگ کر ماں کے پاس چلا آیا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ یہ چھپکلی سی ضرور کسی دروازے کھڑکی کی اوٹ سے ہمیں دیکھ رہی ہوگی۔ ہم ماں بیٹے کا سلوک تو اسے ایک

آنکھ نہیں بھاتا۔ حسد سے جل جاتی ہے اور پھر۔ مجھ سے کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا ہے۔''

''حسد سے جلتی وہ ہے اور کام غلط تم سے ہو جاتا ہے؟''

''اوہ۔'' اسد نے گھبرا کر جلدی سے جوتے نیچے رکھ دیئے۔

صبا اور نجمہ ہنسنے لگیں۔

کیسے خوش تھے تینوں۔ زندگی میں پہلی بار خوشیوں کا رخ روشن دیکھا تھا۔ کیسا خوب صورت تھا اور کیسے انوکھے رنگوں سے آراستہ و پیراستہ تھا۔ پچھلی گزری ہوئی ساری زندگی میں جتنے دکھ ملے تھے' اتنی ہی خوشیاں اب اردگرد بکھر رہی تھیں اور صبا دونوں ہاتھوں سے سمیٹ رہی تھی۔

صبا اور نجمہ کے اچانک پہنچ جانے سے جہاں گھر بھر میں حیرت کی لہر دوڑ گئی تھی وہاں خلاف توقع ہر چہرے پر خوشی بھی پھیل اٹھی تھی۔

بیمار' نحیف و نزار سی دادی اماں نے نجمہ کی کہانی سننے سے پہلے ہی اسے معاف کر دیا تھا اور یہ صبا کے صدقے میں تھا۔ اس گھر میں اس دن سے لے کر آج تک' اک اک پل اس کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ ہر کھٹکے ہر آہٹ پر گھر کے ہر فرد کی نظریں صبا کو دیکھنے کی آس میں دروازے پر جا ٹکتی تھیں۔ ہر رات کو دروازہ کھلا رکھا جاتا تھا کہ کسی بھی لمحے صبا کی واپسی ہو جائے۔ کوئی مبارک ساعت ایسی آ جائے کہ اس کے قدم اپنے گھر کی چوکھٹ کو چھو لیں۔ دعائیں مانگی جا رہی تھیں' منتیں مانی جا رہی تھیں۔ خدا کے حضور گڑگڑایا جا رہا تھا۔ دادی اماں' پھپھو' بلقیس' غزالہ سب کے سب آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے بیٹھی تھیں۔

''ہمیں تو تیرے جانے کے بعد پتہ چلا کہ اس گھر میں تیری کیا حیثیت تھی؟'' دادی اماں کتنی ہی دیر اسے گلے سے لگائے روتی رہیں۔ ''تُو تو رونق تھی اس گھر کی' خوشی تھی اس گھر کی۔ سب کچھ ہی چھن گیا تیرے جانے سے۔''

''اماں سچ کہہ رہی ہیں۔'' پھپھو بلقیس کی نظروں میں اس کے لئے پہلے جیسی نہ

نفرت تھی، نہ حقارت۔ اس کے برعکس پیار کا اتھاہ سمندر بڑے جوش سے ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ طغیانی سی جیسے آئی ہوئی تھی۔

صبا محبتوں کے ان طوفانوں میں ڈوب رہی تھی۔ یا تنکے کی طرح موج در موج بہتی چلی جا رہی تھی۔

''تیرے جانے سے اس گھر کی ساری خوشیاں ہی روٹھ گئیں۔ سہیل نے تو بالکل چپ سادھ لی تھی۔ میرا بچہ بیمار ہوگیا بے چارا تیری جدائی میں۔ اس نے تجھے ڈھونڈنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کنوؤں میں بانس تک ڈلوا دیئے۔''

''بھائی جان نے تو صبا! شادی بھی نہیں کرائی۔''

غزالہ کی آنکھوں میں کوئی حسد یا جلن کا جذبہ نہ تھا۔ پیار ہی پیار صبا کے لیے ڈول رہا تھا۔ اور کسی عزیز ترین مخلص ترین سہیلی یا بہن کی طرح محبت بھری شوخیاں مچل رہی تھیں۔ وہ اپنی چمکتی چمکتی آنکھیں صبا کی خوبصورت بھیگی بھیگی آنکھوں میں گاڑے اسے چھیڑ رہی تھی۔ ''وہ تیرا انتظار کر رہے ہیں، مجھے معلوم ہے۔''

غزالہ کی اس بات پر صبا چونکی۔ سہیل کے ساتھ اس کے بہت سارے جذبے وابستہ ضرور تھے مگر جو اشارہ غزالہ نے کیا تھا، ایسا تو اس نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔

''تمہیں ہی کیا سب کو ہی معلوم ہے۔'' بلقیس نے بیٹی کی پرزور تائید کی۔

''اور میں تو اس کی ماں ہوں۔ سب سے زیادہ اسے جانتی ہوں۔ باہر تو باہر اس کے اندر جو کچھ ہے، اس سے بھی واقف ہوں۔''

''شکر ہے آج تم نے خود اپنی زبان سے اعتراف کیا۔'' دادی اماں نے بیٹی کی طرف شاکی نظروں سے دیکھا۔

''اک یہی نہیں، میں تو اماں! آج سارے اعترافات کرنے کو تیار ہوں۔''

بلقیس کی آنکھوں میں ندامت اور پشیمانی کی نمی تھی۔ معافی مانگنے والے انداز کی جھلک تھی۔ ''اولاد کا دکھ برے سے برے انسان کو بھی راہ راست پر لا کھڑا کرتا ہے۔'' بلقیس کی آنکھوں کی نمی آنسو بن کر رخساروں پر ٹپکنے لگی۔

''ایک طرف صبا کے جانے کے بعد سہیل کی حالت تھی تو دوسری طرف غزالہ کے دکھ۔ میں تو ہر روز مرتی تھی، ہر لمحہ مرتی تھی۔'' وہ اپنے صدموں کو کھنگالنے لگیں۔

''غزالہ کے ساتھ اس کے سسرال والوں نے جو کچھ کیا، سارے جھگڑے۔ زیادتیاں مظالم۔ سب کچھ لگتا تھا میرا اپنا قصور ہے۔ میرے ضمیر کی لعنتوں نے مجھے مار مار ڈالا۔ صبا کے ساتھ کیئے ہوئے سلوک کی سزا مجھے اس صورت میں مل رہی ہے۔'' پھپھو بلقیس تو اتنی ٹوٹی پھوٹی ہوئی تھیں۔ اتنی پشیمان، اتنی شرمندہ تھیں کہ چھوٹے بڑے کا امتیاز بھی نہ رہا تھا۔ نہ انا اور خودداری جیسے گھمنڈی جذبے باقی تھے۔ انتہائی عجز وانکسار سے صبا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''مجھے معاف کر دے میری بیٹی، مجھے معاف کر دے۔ جب تک تم مجھے معاف نہیں کرو گی، نہ میری غزالہ کی زندگی آباد ہو سکے گی اور نہ ہی میرا سہیل آرام پا سکے گا۔''

''پھپھو۔ پھپھو۔'' صبا نے اتھل پتھل ہوتے ہوئے بلقیس کے جڑے ہاتھ تھام لئے۔ ''ایسا نہ کہیے پھپھو جی۔ ایسا نہ کہیے۔''

''میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں بیٹی، مجھے معاف کر دے۔''

''ارے سہیل کہاں ہے؟'' دادی اماں نے بلقیس کا کندھا ہلایا۔ ''اسے تو بلاؤ، آ کے صبا سے ملے۔''

''ارے ہاں۔ لیکن بھائی جان تو ابھی تک آئے ہی نہیں۔''

''بس یہی اس کی زندگی کا طور بن گیا ہے۔ نہ سواد کا کھانا پینا اور نہ آرام، سب کچھ تج چکا ہے۔''

''صبا! تم اب انہیں دیکھو تو کبھی پہچان نہ سکو۔'' غزالہ کی آواز بھی بھرا رہی تھی۔

''وجود سوکھ کر تنکا ہو چکا ہے اور زبان پر اک چپ۔ اب تم آ گئی ہو تو شاید......''

غزالہ بات ادھوری چھوڑ کر صبا کو شرارت سے بھری نگاہ کے ساتھ دیکھنے لگی۔

اسی لمحے بلقیس چونکیں۔ سینے سے لگی صبا کا سر تھپتھپانے کے بعد اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے مسرور سے لہجے میں ماں سے مخاطب ہوگئیں۔

"اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے' کیوں اماں! آج سے تیسرے دن جو جمعہ آنے والا ہے' اسی دن تاریخ رکھ لیں۔"

"کیسی تاریخ؟" نجمہ نے چونک کر پوچھا۔

"سہیل کی شادی کی۔"

"منگنی وغیرہ ہو چکی؟" اک اضطراب بھرے تجسس سے استفسار کیا۔

بلقیس ہنسنے لگیں۔

"منگنی کی کیا ضرورت تھی بہو۔" نجمہ کی بات کا دادی اماں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ تو طے تھا۔"

"کیا طے تھا؟" نجمہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"صبا اور سہیل کی شادی۔"

"صبا اور سہیل کی شادی؟" اس نے گھبرا کر کمرے کے پرلے کونے میں تنہا اور خاموش بیٹھے اسد کی طرف دیکھا۔ پھر اک نظر صبا پر ڈالی۔

دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے تھے۔ نجمہ اچھی طرح جانتی تھی۔ کن جذبوں خوشیوں اور راحتوں کو جلو میں لئے وہ یہاں آئے تھے۔ کیسی کیسی آسیں اور مرادیں دل میں بسا رکھی تھیں دونوں نے ایک دوسرے کے لیے۔ ایک دوسرے کے ہو کر، ایک دوسرے میں کھو کر' زندگی کی ہر خوشی جیسے پالی تھی۔

اور خود نجمہ' اس کی بھی تو یہی تمنا' خواہش اور آرزو تھی۔ دونوں ہی اس کی اولاد تھے۔ دونوں ہی کو وہ خوش اور بامراد دیکھنا چاہتی تھی۔ اور۔ ہمیشہ اپنے سامنے' اپنے اردگرد انہیں محسوس کرنا چاہتی تھی۔ دونوں کو اکٹھے۔ اس کے تن کے روئیں روئیں میں دونوں کی زندگی کی ثمر آور بہار دیکھنے کی تمنا مچل رہی تھی۔

"لیکن اماں! صبا کی منگنی تو میں نے کر دی ہے۔" نجمہ نے ان کی خوشیوں کو سمیٹ کر اپنے حصار میں لینے کی کوشش کی۔ کہیں خاموش رہنے سے بادِ مخالف انہیں تنکوں کی طرح بکھیر نہ دے۔

"تم نے ہم سے پوچھے بغیر؟" دادی اماں نے چبھتی نظر سے نجمہ کو گھورا۔

"میں ماں ہوں اس کی۔" نجمہ نے کانپتی آواز میں اپنا حق جتایا۔

"ماں۔" دادی اماں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "ماں ہونے والا حق تو اس کا کسی کے پاس نہیں۔" جتنی نجمہ کی آواز کھوکھلی تھی' اتنا ہی دادی اماں کا لہجہ مستحکم اور پائیدار تھا۔ "تم نے جنم دے کر اس کو بے سہارا چھوڑ دیا۔ ہم نے پالا۔ پرورش کی۔ مگر ماں والی ماتا کے ساتھ نہیں۔ ہر وقت بیچاری طعنوں گالیوں کی زد پر ہی رہی۔"

دادی اماں پر رقت طاری تھی۔ سوکھی سوکھی انگلیوں سے آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بلقیس کی طرف دیکھا۔

"یہ پھوپھی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے بھی پھوپھی والی محبت بچی کو نہیں دی۔ میں دادی تھی' مجھے اس سے محبت تھی۔ مگر ہر وقت اس محبت پر دوسرے شیطانی جذبے غالب رہے۔" دادی اماں کے چہرے کی سب جھریاں ننھی ننھی ندیاں بنی ہوئی تھیں۔ مگر انہیں کوئی ہوش نہ تھا۔ بولے جا رہی تھیں۔

"تمہارا گھر سے چلے جانے والا گناہ...... محلے بھر میں جو ہماری بے عزتی ہوئی۔ میرا بیٹا' جو اس غم میں گھل گھل کر مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔ یہ قسمت کی دی ہوئی ساری بربادیاں خطاؤں اور گناہوں کی صورت میں' اس بیچاری کی جھولی میں ڈال کر ہم سب نے اسے ہمیشہ قابل نفرت جانا۔" ان کا گلا سوکھ رہا تھا۔ زبان لڑکھڑا رہی تھی' لیکن آواز پر جیسے خود ان کا بھی قابو نہ رہا تھا۔ "اس بدقسمت کی محبت کا حصہ کسی نے بھی اسے نہیں دیا۔ دوسروں کے گناہوں کی پاداش میں یہ بے چاری نفرت کی سولی پر ہی لٹکی رہی۔"

دادی اماں تھک کر لمبے لمبے سانس لینے لگیں۔ نجمہ روتے ہوئے بڑبڑائی۔

"میں آپ سب سے معافی کی خواستگار ہوں۔ صبا سے سب سے زیادہ۔ گزرا وقت واپس نہیں آ سکتا ورنہ....."

"نصیب میں یہی کچھ تھا۔" بلقیس نے جیسے اپنے آپ کو بھی سمجھایا۔

''میں کفارہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔'' نجمہ کے لہجے میں پشیمانی تھی۔

''ہم سب کو چاہیے۔ سب کو۔''

یونہی باتیں ہوتی رہیں۔ کبھی سب ہنسنے لگتے۔ کبھی بیتی باتوں پر ہر کسی کی آنکھ سے خون کا' دکھ کا آنسو ٹپک اٹھتا۔ محلے والیاں' جو جو نجمہ کو جانتی تھیں' جو جو صبا سے ہمدردی رکھتی تھیں' اکا دکا آ کر ملتی رہیں۔

نجمہ کی کہانی سنتیں۔ صبا پر جو کچھ گزرا' اس پر حیرتوں میں ڈوب ڈوب جاتیں۔

کوئی نجمہ کی اس اتنی بڑی قربانی پر تحسین و آفرین کے دو چار جملے بول دیتی' کوئی اظہار افسوس کرتی۔ کوئی صبا کے جگرے اور ہمتوں حوصلوں کی داد دیتی۔

اس طرح سارا دن بیت گیا۔ پھر رات گئے سہیل آ گیا۔ بڑا کمزور ہو رہا تھا۔ واقعی پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ صبا دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

''اک یہ تھا جس نے ہمیشہ حق کو حق جانا۔ سچی بات کہی۔ صبا کی طرفداری میں سینہ سپر رہا۔ ہر کسی کا مقابلہ کیا۔ کسی دوسرے کا گناہ اس پر ڈال کر اسے طعنوں طنزوں کے تیروں سے ہلاک نہیں کیا' اسے نفرت اور حقارت کے پتھروں سے سنگسار نہیں کیا۔ ہمیشہ اس کی بہتری چاہی۔ سدا اس کے بھلے ہی کی سوچی۔''

''چلیں چھوڑیں نانی اماں۔'' سہیل صبا کے سر پر ہاتھ دھرے بس اسے دیکھے جا رہا تھا۔ ''صبا آ گئی ہمیں دونوں جہان کی دولتیں مل گئیں۔ دنیا بھر کی نعمتیں پروردگار نے ہماری جھولی میں ڈال دیں۔ اور جب کوئی خوشی مل جائے تو اس خوشی کو شکر گزاری سے مناتے ہیں۔ گزر جانے والے دکھوں کو یاد کر کے اس خوشی میں غم کا زہر نہیں گھولتے۔ اب کل پرسوں ہی اس کے اور ماموں جان کے آنے کی خوشی میں اک بہت بڑی نیاز دے ڈالیں۔''

''سب کچھ کریں گے۔ سب کچھ۔ نیاز بھی دیں گے۔ قرآن خوانی بھی کرائیں گے۔ شکرانے کے نوافل بھی ادا کریں گے اور۔ آپ کی شادی بھی۔''

سہیل نے تیکھی نظر سے غزالہ کو گھورا تو وہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ہنستی کھلکھلاتی

کمرے سے نکل گئی۔

''آیئے آپ کے لیے کھانا لگا دوں۔ آج تو آپ خوب سیر ہو کر کھائیں گے سارے روزے افطار کر لیں گے۔ ایکدم ہی۔'' جاتے جاتے وہ فقرہ پھینک گئی۔

ہمیشہ کی طرح دادی اماں نے اسے اپنے کمرے میں ہی سلایا تھا۔ بڑی خوش تھیں۔ ''پہلے تو تیری حفاظت اور پہرے داری کے نظریے سے تجھے اپنے پاس سلایا کرتی تھی۔ مگر آج محبت کے مارے سلا رہی ہوں' صبا! آ جا میرے ساتھ والی چارپائی پہ۔ ہمیشہ کی طرح۔''

دادی اماں بچوں کی طرح خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی۔ اچھی طرح صبا کی صورت بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر وہ پھر بھی اسے مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ صبا ان کے حکم کے مطابق ساتھ والی چارپائی پر لیٹی تو وہ اسے کتنی ہی دیر تھپکتی رہیں۔ پھر کبھی سر پر ہاتھ پھیرتیں' کبھی پشت کو سہلاتیں۔

''سو جا میری بچی۔ میٹھی میٹھی نیند سو جا۔ آج مجھے تیرا باپ بہت یاد آ رہا ہے۔ اس کے بعد یہ گھر تیرا ہے میری بچی۔ تو اس گھر کی عزت ہے۔ شان ہے۔ تیرے ہی دم سے اس گھر کی آبادی ہے۔ اسے آباد رکھنا میری بیٹی! تیرے باپ کی روح خوش ہو گی۔''

ہولے ہولے اسے تھپکتے تھپکتے' سمجھاتے سمجھاتے' دادی اماں کی زبان سے نکلنے والے الفاظ بیچ بیچ میں سے ٹوٹنے لگے۔ تھپکنے والے ہاتھ سست پڑنے لگے۔ ''تیرے باپ کی روح خوش ہو گی تو برکتیں اتر آئیں گی اس گھر میں۔ پھر۔ پھر ہم۔ سب......''

اور پھر۔ ان کی آواز ڈوب گئی اور ہاتھ تھم گئے۔ چند لمحوں بعد ہمیشہ کی طرح وہ خراٹے بھر رہی تھیں۔

''ساری ساری رات جاگ کر گزارتی ہیں اماں۔'' پھپھو بلقیس نے بتایا تھا۔ ''صبا کے جانے کے بعد ایک رات بھی سکون سے سو نہیں پائیں۔''

اور آج رات۔ وہ کیسی پرسکون نیند سو رہی تھیں۔ صبا نے دو تین آوازیں دیں۔ لیکن ان کی نیند اتنی گہری تھی کہ نہ سنا نہ جواب دیا۔

"آپ تو دادی اماں پرسکون نیند سوگئیں۔ مجھے بتایئے میں کیا کروں؟ میری تو نیندیں۔" صبا کروٹ بدل کر دادی سے ذرا پرے ہٹ گئی۔ نیند بھی نہیں آ رہی تھی اور دل کے اندر ہزاروں ویرانے اتر آئے تھے۔

باپ کا گھر آباد کرتی تو اس کے اپنے دل کی دنیا اجڑ جاتی۔ ساری زندگی برباد ہو جاتی۔ وہ چپکے چپکے رونے لگی۔ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ بڑی پریشان تھی۔ نہ اس گھر کو چھوڑ کر جاسکتی تھی اب وہ' نہ یہاں رہ جاتی تو سکون وقرار نصیب ہونا تھا۔

اوہ خدایا۔ کیسے دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔

نجمہ نے دادی اماں سے ایک رات کا وقت لیا تھا۔ "کوئی بھی فیصلہ جھٹ پٹ نہیں کرلیا کرتے۔ کچھ وقت سوچنا ضرور چاہیے۔ آپ بھی سوچیں' میں بھی سوچتی ہوں۔ پھر کل فیصلہ کریں گے۔"

"ہم نے تو جھٹ پٹ فیصلہ نہیں کیا۔ ہمارا فیصلہ تو سالوں کا ہے۔ بدل نہیں سکتا۔"

"تو پھر مجھے تو کچھ وقت دیں۔ تھوڑا سا حق بھی۔ اسے جنم دینے کا ہی سہی۔ اور اگر میرے دل میں کوئی کھوٹ ہوتا تو میں اسے یہاں کبھی نہ لے کر آتی۔"

نجمہ کے اندر کی گھٹن بڑھ رہی تھی۔ وہ تو اسد کی بری بھی تیار کر کے لائی تھی۔ کتنے ارمانوں اور امنگوں سے سب کچھ کیا تھا۔ سارے محلے والیوں کو بلا کر بری دکھائی تھی۔ اور یہاں ان کے پاس آ کر دعوت ولیمہ کرنے کا پروگرام بھی بنایا تھا۔ کئی سالوں سے اس محلے میں رہ رہی تھی۔ سب کا حق تھا اس خوشی میں شریک ہونے کا۔ اور سب کو نجمہ کے بیٹے اسد اور صبا کی جوڑی پسند بھی بڑی آئی تھی۔ تبھی تو آنے سے ایک دن پہلے ساری رات محلے کی عورتیں اکٹھی ہو کر ڈھولک پر اسد کا سہرا اور دوسرے خوشی کے ترانے گاتی رہی تھیں۔ پھر گوگی کی ماں مہندی لے آئی تھی۔

"ہم تو اپنی لڑکی کو مہندی لگا کر بھیجیں گی۔"

"ہاں شگنوں کی مہندی۔ چلو آؤ مہندی سجائیں۔ ہمارا بھی تو حق ہے۔"

ذرا سی بات ہوئی تھی' بڑھتے بڑھتے باقاعدہ مہندی کی رسم بن گئی۔ مہندیوں کی

تھالیاں سجا کر' ان پر موم بتیاں بھی جلالی گئیں۔

"اسد بیٹے! بھاگ کر مٹھائی لے آؤ' میں چائے بناتی ہوں۔"

نجمہ نے یہ سب ہوتے دیکھا تو خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے بولی۔

"لیکن کیوں؟ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟" وہ اپنی مسکراہٹیں دباتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"شادی وہاں' صبا کے باپ کے گھر میں جا کر ہوگی نا۔ لہٰذا یہاں والی سب پڑوسنیں اور محبت کرنے والی ہمسائیاں کہتی ہیں' مہندی کی رسم یہاں منائیں گی۔"

اسد مٹھائی لینے بھاگا۔ واپس آیا تو وہاں کا رنگ ہی اور تھا۔ مہندی کے سجے تھال ہاتھوں میں اٹھائے لڑکیاں ناچ گا رہی تھیں۔ بڑا خوبصورت نظارہ تھا۔

خوب ہنسی مذاق ہو رہے تھے۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ ایک دوسرے پر فقرے بازی ہو رہی تھی۔ کوئی اسد کی طرف سے بول پڑتیں' کوئی صبا کی طرف سے۔ سمدھنیں بن کر گانوں کا جواب گانوں سے دیا جا رہا تھا۔ پھر دو تین عورتیں صبا کو درمیان میں گھسیٹ لائیں۔ یہ گوٹے والا بھاری دوپٹہ اوڑھایا اور مہندی لگانے لگیں۔ پھر منہ میٹھا کرایا گیا۔ ساتھ ساتھ ڈھولک پر مہندی کے گیت گائے جاتے رہے تھے۔ خوشی کے مارے نجمہ کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

صبا کو مہندی لگ گئی تو دوسری پارٹی نے اسد کو وہیں لا بٹھایا۔ پھر اس کی مہندی کی رسم ہونے لگی۔ اسی طرح وارنے' منہ میٹھا کرائی' سہرے کے گیت' ڈھولک کی تھاپ۔ لڑکیوں کا ناچ۔ کئی گھنٹے ہنگامہ رہا۔ رسم سے فارغ ہونے کے بعد سب کی تواضع چائے اور مٹھائی سے کی گئی۔ غرض خوب خوب رونق رہی۔ اور پھر رات گئے سب مبارک بادیاں دیتی ہوئی رخصت ہوگئیں۔

صبا کو یہ سب یاد آ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ اپنے ہاتھوں کو ٹٹول ٹٹول کر اسد کے نام کی لگی ہوئی مہندی دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی اور اس کی خوشبو سونگھ رہی تھی۔

لیکن' اب کیا ہوگا؟ یہ مہندی' جو اسد کے نام کی تھی' اب اس کا کیا رنگ ہوگا اور کس کے

نام سے موسوم کی جائے گی۔

''ارے امی! صبا کے ہاتھوں کو تو مہندی بھی لگی ہوئی ہے۔'' غزالہ نے اس کے حنا آلود ہاتھ دیکھ کر ماں کو بتایا تھا۔ ''کیسا نیک شگون ہے؟ تقدیر نے پہلے ہی اس کے ہاتھوں پر مہندی کا رنگ چڑھا دیا۔''

صبا اور نجمہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔ نہ تائید کر سکیں نہ تردید۔ ان کی خوشیوں کو تاراج کرنا۔ دونوں ہی کے بس میں نہ تھا۔

صبا سوچوں میں کھوئی تھی۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹوں پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ دادی اماں کے زوردار خراٹے ان کی گہری اور پرسکون نیند کے غماز تھے۔

اسی اثناء میں ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا۔ صبا نے آواز سنی۔ چونکتے ہوئے اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت کون آیا ہوگا؟ اور وہ بھی دادی اماں کے کمرے میں۔

''صبا۔'' نجمہ کی گھٹی گھٹی' دبی دبی سی آواز تھی۔

''کیا سوگئی ہو؟''

''نہیں امی! نیند نہیں آ رہی۔''

''کیوں۔؟'' نجمہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''چلو آؤ باہر گیلری میں۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے وہ ماں کے ساتھ گیلری میں نکل گئی۔

''دیکھ رہی ہو یہ سب کیا ہو رہا ہے؟؟''

صبا جواب میں کچھ نہیں بولی۔ دھندلی دھندلی روشنی میں ماں کا چہرہ بغور دیکھنے لگی۔

''تمہیں یہاں آنے کے لئے زیادہ بے تاب تھیں۔'' نجمہ نے اس کے افسردہ چہرے کو دیکھتے ہوئے طنزیہ سے انداز میں کہا۔ ''نکل گئی نا سارے بے تابی۔ اب کیا ہو گا۔؟'' صبا خاموش کھڑی' اپنی بھیگی بھیگی آنکھیں صاف کرتی رہی۔

''میں تو کہتی ہوں آؤ واپس چلیں۔ چپکے سے۔ ابھی۔''

''ابھی؟'' صبا گھبرا سی گئی۔

''ہاں۔ دن چڑھ گیا تو کسی نے ہمیں جانے نہیں دینا۔ اور۔ تم رہ جاؤ گی یہیں۔ ہمیشہ کے لئے۔''

''لیکن چوروں کی طرح اس وقت جانا......''

''اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ اور ان کے ارادے بڑے پکے ہیں۔''

''امی! ہمیشہ ہر بات کا حل فرار میں ہی نہیں ہوتا۔''

''کیا مطلب؟'' نجمہ اک بے کلی کے ساتھ بولی۔ ''کیا پھر سہیل سے شادی کر لو گی؟''

''جی؟ جی؟'' صبا بوکھلا سی گئی۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد کچھ سوچتے ہوئے ہولے سے بڑبڑائی۔ ''شاید۔''

''کیا؟ نہ نہ میری بیٹی۔'' نجمہ چیخ سی پڑی۔ ''اپنی پوری زندگی کے ساتھ ایسا بھیانک کھیل مت کھیلنا۔ میں جانتی ہوں' تمہیں اسد سے محبت ہے۔''

صبا سر جھکائے مہندی والے ہاتھوں کو دیکھتی رہی۔

''گزرنے والی زندگی تم نے کون سی پھولوں کی سیج پر کاٹی ہے۔ جو میں تمہیں آنے والی زندگی بھی کسی کی خاطر قربان کر دینے دوں۔ نہیں نہیں۔ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''آپ نے بھی تو اپنی زندگی قربان کر دی تھی۔ نہ صرف زندگی' بلکہ اپنی بیٹی اور اپنا شوہر بھی۔ ایک دوسرے انسان کی زندگی کی خاطر۔'' نجمہ چپ سی ہو گئی۔ اس نے ایسا کیا تو تھا۔ ''سہیل بھائی مر جائیں گے امی! ان کو دیکھا نہیں آپ نے؟ ان کا حال کیا ہو گیا ہوا ہے۔''

''وہ زندہ رہے اور تُو بے شک مر جائے۔'' دل میں صبا کی محبت تڑپی۔

''اگر انہیں کچھ ہو گیا تو امی یہ گھر۔ سارے کا سارا تباہ ہو جائے گا۔''

''ہونے دو۔ میں تمہیں تباہ نہیں ہونے دوں گی۔''

''نہیں امی۔ ایسی سوچ مت سوچیں۔'' صبا مستحکم لہجے میں بولی۔ ''میں بچپن میں بے سہارا ہوگئی تھی۔ آپ گھر سے چلی گئیں۔ باپ قبر میں جا سویا۔ پھر مجھے اسی گھر کی چھتوں اور درودیوار نے پناہ دی تھی۔''

''یہ کیسی پناہ تھی کہ تمہیں اک لمحہ سکون کا یہاں میسر نہ آیا۔''

''ایسا نہ کہیے۔ یہ سہیل بھائی ہی میری ایسا پناہ گاہ تھے کہ میں یہاں بہت خوش تھی۔ صرف بے سکونی آپ کے گھر چھوڑ جانے والے فعل سے ہوئی۔ وہ میرا گناہ بن گیا۔ میرے لیے طعنہ بن گیا۔''

''تو پھر۔؟''

''اس کے بدلے میں' میں اس گھر کے لوگوں کے ساتھ وفا کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی محبت کو قربان کر کے بھی۔''

''نہ میری جان۔ محبت سے بڑھ کر کوئی جذبہ نہیں۔ یہ انسان کو آسودگی بخشتا ہے۔ سکون دیتا ہے۔ یہ سب سے عظیم جذبہ ہے۔''

''سب سے عظیم جذبہ محبت نہیں۔ قربانی ہے۔ محبت اپنی ذات' اور اپنے دل کی آرزو اور خواہش ہے۔ لیکن قربانی دوسروں کے لیے جینے کا نام ہے۔ اور جب انسان کسی دوسرے کے لیے اپنے وجود' ذات' دل اور جذبوں کی نفی کر دیتا ہے تو پھر اور بہت کچھ پالیتا ہے۔ بہت کچھ۔ تسکین قلب' راحت دل' زندگی کی معراج۔''

''صبا سوچ لو بیٹی۔ پھر سوچ لو۔''

''میں نے بہت سوچا ہے امی! میں اب یہیں رہوں گی۔'' صبا کی آواز میں مضبوطی تھی۔ ''آپ ہی بتایئے۔ آپ اگر اسد کو چھوڑ کر اپنی زندگی کی طرف لوٹ آئیں تو......''

''ہاں۔'' نجمہ سوچتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''تو سچ کہہ رہی ہے۔ مجھے یہ سکون تھا کہ ایک زندگی کو میں نے بچالیا۔ ایک نسل کو بچالیا۔ میں نے خودغرضی کی زندگی نہیں گزاری۔ میں صرف اپنے آپ اور اپنے جذبوں کے لیے نہیں جی۔''

''تو بس پھر۔ یہ جوانی کی محبت تو ایک وقتی جذبہ ہے۔ باڑھ آئی ندی کی طرح۔ پھر اعتدال پر۔''

صبا کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ وہ اپنی بات بھی مکمل نہ کرسکی تھی۔ شاید آنسو پینے کی کوشش میں مصروف تھی۔

نجمہ کو پورا پورا احساس تھا۔ وہ بھی اسد کو لے کر جب اس شہر سے نکل گئی تھی تو اس کے دل پر جو کچھ بیت گیا تھا وہ' کچھ وہی جانتی تھی۔ یہ قربانیاں دینا کوئی آسان کام ہوتا ہے۔

نجمہ نے صبا کو بازوؤں میں بھر کر سینے کے ساتھ لپٹا لیا۔

''مجھے تمہارا فیصلہ.....'' روتے روتے اس کی ہچکی بندھنے لگی۔

''نہ امی۔ روئیے نہیں' خوش ہو کر میرا حوصلہ بڑھایئے۔'' صبا نے بڑی مشکل سے اپنے لہجے کو استوار کیا۔ ''یہ ضروری ہے امی! ورنہ آنے والی نسلیں ہم دونوں ہی پر لعنت بھیجیں گی۔''

نجمہ صبا کو گلے سے لگائے روتی رہی۔

''آپ نے دیکھا ہے نا کہ آپ کے بعد مجھ پر بھی بڑی تہمتیں تھیں۔ بڑی رسوائیاں' بڑی بدنامیاں میرے نام کے ساتھ تھیں۔ اگر آج میں اپنے باپ کے گھر میں رہ گئی تو دونوں ہر ہر تہمت' ہر رسوائی اور ہر بدنامی سے پاک ہو جائیں گی۔ ہر خطا' ہر گناہ سے بری الذمہ ہو جائیں گی۔''

''میری بیٹی! خدا تجھے تیرے اس فیصلے کے بدلے میں خوشیوں اور رحمتوں سے نوازے۔'' نجمہ نے جیسے سچائی اور حقیقت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

''آمین۔!''

بڑی دیر دونوں ماں بیٹی ایک دوسرے سے لپٹی کھڑی رہیں۔

''میری ایک بات مانیں گی امی!''

''کہو میری جان!''

''آپ یہاں سے چلی جائیں۔ آج ہی۔ ابھی۔''

''کیا مطلب؟''

''اسد اور آپ۔ دونوں میری زندگی سے۔''

''کیا۔ کیا؟''

''ہاں امی۔ پھر کبھی نہ ادھر آیئے گا۔ ورنہ۔ مجھے ڈر ہے' کہیں میرے قدم ڈگمگا نہ جائیں۔ میں اپنے فیصلے سے پھر نہ جاؤں۔ میں اپنے راستے سے بھٹک نہ جاؤں۔ مجھے اپنے باپ کا گھر آباد کرنا ہے امی۔ مجھے ایک انسان کی زندگی بچانا ہے۔ مجھے اپنے خاندان کی عزتیں واپس لوٹانا ہیں۔''

''میری بچی۔ میری صبا! تو کتنے بڑے ظرف کی مالک ہے۔ تو کتنا بڑا حوصلہ رکھتی ہے۔'' نجمہ پھر رونے لگی۔ بیٹی کے جذبات و احساسات سے اچھی طرح واقف تھی۔ سارے ترس اور ہمدردی کے جذبے اس کے ساتھ تھے۔ دل میں درد اٹھ رہا تھا۔

چپکے سے جا کر اسد کو جگا لائی۔ وہ خاموش تھا۔ بالکل چپ۔ لب ایک دوسرے سے بھنچے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں اتر آنے والے غم اور دُکھ کو چھپانے کی خاطر نظریں جھکا رکھی تھیں۔

اپنے انجام کا علم اسے کل ہی ہو گیا تھا۔ خوشیاں حاصل کرنے آیا تھا' زندگی بھر کی حسرتیں اور ٹوٹے پھوٹے ارمان جھولی میں بھرے واپس جا رہا تھا۔

نجمہ اور اسد چپ چاپ' رات کے اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو صبا نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ اس گھر کی' اپنے باپ کے گھر کی مسرتیں' رونقیں گھر کے اندر ہی سمیٹ لیں۔ وہ اس گھر کی آبادی کی امین تھی۔

ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے جا کر دادی کے ساتھ چارپائی پر لیٹی' اور اِک بے حد پرسکون نیند میں ڈوب گئی۔

☆......☆......☆